اسلام میں غلامی کی حقیقت

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

اسلام میں غلامی کی حقیقت

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

مکتبہ جمال
تیسری منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
فون: 7232731 Mob: 0300-8834610
Email: maktabajamal@yahoo.co.uk
maktaba_ jamal@email.com

نام کتاب: .... اسلام میں غلامی کی حقیقت

مصنف : .... مولانا سعید احمد اکبر آبادی

اہتمام:.................. میاں غلام مرتضےٰ کھٹانہ

ناشر: .... مکتبہ جمال ○ لاہور

مطبع:.................. تایا سنز پرنٹرز ○ لاہور

سن اشاعت: 2011ء

قیمت:.................. 220 روپے

ملنے کا پتہ:

مکتبہ جمال

تیسری منزل حسن مارکیٹ اردو بازار لاہور

فون: 7232731 Mob: 0300-8834610

E: maktabajamal@yahoo.co.uk

E: maktaba_jamal@email.com

فہرست

حرف چند

عروس البلاد دہلی کی عظیم شاہ جہانی مسجد کے بائیں جانب اردو بازار کی ایک تنگ گلی میں ایک ادارہ بنام ندوۃ المصنفین موجود ہے۔ قرول باغ میں یہ ادارہ قائم ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ محشر میں مسلمانوں کا یہ عظیم علمی ادارہ بھی بربادی کا شکار ہو گیا لیکن اس کے باحوصلہ اور باہمت بانی و ناظم مولانا مفتی عتیق الرحمٰن نے اس کو دوبارہ سنبھالا دیا۔ مفتی صاحب حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے برادرزادہ ہیں۔ انہوں نے چند احباب کے مشورہ اور تعاون سے اس ادارہ کی داغ بیل ڈالی۔ مقصد یہ تھا کہ عصری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے علمی لٹریچر مہیا کیا جائے۔

ادارہ کے قلمی معاونین میں استاد الحدیث مولانا بدر عالم میرٹھی مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاردی، مولانا سید الدائم الجلالی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے لوگ تھے۔ ترجمان السنۃ، قصص القرآن، اسلام کا اقتصادی نظام، اخلاق و فلسفہ، اخلاق اور ترجمہ تفسیر مظہری، انہی حضرات کی کاوشوں کا مظہر ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی مفتی صاحب کے عزیز دوست اور ابتدائی دور کے ساتھی ہیں۔

دنیائے اسلام کی عظیم دینی و علمی یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ ایم۔اے کی ڈگری رکھتے ہیں۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے وائس پرنسپل اور بعدازاں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ دینیات کے سربراہ رہ چکے ہیں۔ متعدد قیمتی کتابیں مولانا کے قلم سے نکلی ہیں۔ جن میں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، فہم قرآن، وحی الٰہی، اسلام میں غلامی کی حقیقت اور غلامان اسلام بطور خاص شہرت کی مالک ہیں۔

یہ تمام کتابیں اس ادارہ نے شائع کیں اور ان میں سے ہر ایک کے کئی کئی ایڈیشن نکلے، جو ان کی مقبولیت کی واضح دلیل ہے۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت کے سوا باقی جملہ کتب پاکستان میں شائع ہو چکی ہیں، اپنے موضوع پر یہ منفرد کتاب باوجود شدید ضرورت کے اب تک نہ چھپ سکی۔

غلامی کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے جو دانشوران یورپ کی زبان پر رہتا ہے اور اسلام و پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کے سلسلہ میں ان کا یہ بہت مشہور ہتھیار ہے۔ اسلام کے روئے روشن کو

داغدار کرنے کی غرض سے دانشوران یورپ کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کی ہر کتاب میں یہ اعتراض بڑے اہتمام سے موجود ہوتا ہے۔

جے جے پول نے اپنی کتاب "سٹڈیز ان محمڈنزم" میں بڑی دیدہ دلیری سے کہا کہ مسلم ممالک میں غلاموں کے بجائے باندیاں زیادہ نظر آئیں گی اور اس کا سبب اس نے قرآن کی اجازت کو قرار دیا کہ قرآن نے جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کو باندیاں بنا کر رکھنے کی اجازت دی ہے۔ موئر نے اپنی کتاب "لائف آف محمد" میں لکھا ہے کہ مسلمان آقاؤں کی سطوت کے تحت باندیوں کا تصور انسانیت کی تحقیر و تذلیل کا سب سے زیادہ بھیانک تصور ہے۔

اسی مصنف نے ایک دوسری جگہ عورتوں کی غلامی کے ضمن میں لکھا کہ مسلمان دلی جوش اور اتحاد کے ساتھ اس کو مٹانے کی کبھی کوشش نہ کریں گے۔ حالانکہ یہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اسلام کا عالم انسانیت پر احسان ہے کہ اس نے وحشت و استبداد کے ہر تصور کو حرف غلط کی طرح مٹا کر پوری مخلوق کو اللہ کا کنبہ قرار دیا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جانثار خادم حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ملوک و حکمران طبقہ کو جھنجھوڑتے ہوئے فرمایا:

مَتٰی اِسْتَعْبَدْتُمُ النَّاسَ وَقَدْ وَلَدَتْهُمْ اُمَّهَاتُهُمْ اَحْرَارًا.

کہ تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنالیا؟ حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا۔

اور خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال تھا کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت بقول سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز کے ساتھ جس بات کی نصیحت و وصیت فرما رہے تھے۔ وہ اسی مظلوم طبقہ کے حقوق کی وصیت تھی۔ دشمنان دین و ملت تو رہے ایک طرف، تعلیم جدید کے برگ و بار نے وہ رنگ دکھلایا کہ خود عزیزان ملت اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے الجھ کر رہ جاتے ہیں اور ان کے ذہن شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مولانا محترم نے یہ کتاب اسی لیے لکھی کہ عزیزان ملت ژولیدگی فکر کا شکار ہونے سے بچ جائیں اور دشمنوں کے پھیلائے ہوئے زہر کا تریاق سامنے آسکے توفیق الٰہی سے وہ اپنے مقصد میں خوب خوب کامیاب ہوئے اور حق ادا کر دیا۔

بقول مصنف علامہ:

"اس میں غلامی کی حقیقت، اس کے نفسیاتی، اخلاقی اور اقتصادی پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ غلامی کا آغاز کب سے ہوا اسلام سے پہلے کن کن قوموں میں یہ رواج پایا

جاتا تھا اور اس کی صورتیں کیا تھیں، اس کی مکمل تاریخ پھر اسلام نے اس رواج کو اس وقت کن مجبور کن حالات کی وجہ سے باقی رکھا اور اس میں کیا اصلاحات کیں اور ان سب سے اسلام کا اور منشاء کیا ہے۔ اس کے بعد مشہور مصنفین یورپ کی اجتماعی غلامی پر مختصر اور محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے۔"

اس کتاب کے دہلی سے متعدد ایڈیشن نکلے۔ اب پاکستان میں مکہ بکس کے مقدر میں یہ سعادت آئی اور اس کے مالکان نے اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا:

فجزاھم اللہ تعالیٰ حسنا الجزاء.

اس ٹھوس، محققانہ اور سنجیدہ علمی کتاب کی اشاعت وقت کی شدید ضرورت تھی۔ الحمد اللہ، وہ پوری ہوگئی۔ امید ہے کہ اہل نظر اس کا خوش دلی سے خیر مقدم کریں گے۔

محمد سعید الرحمٰن علوی
۱۲۔اے شاہ جمال، لاہور

۷ محرم الحرام ۱۴۰۳ھ
۴۔ نومبر ۱۹۸۲ء یوم الخمیس
قریب العصر

دیباچہ طبع اول

''ندوۃ المصنفین'' کے مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ ہے کہ اسلامی عقائد ومسائل اور اس کی تعلیمات کے بعض گوشوں کے متعلق جو غلط فہمیاں یورپ اور یورپ کے تسلط واثر سے ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں پھیلی ہوئی ہیں ان کے ازالہ کے لیے کوئی مفید سنجیدہ اور موثر قدم اٹھایا جائے پیش نظر کتاب اس سلسلہ کی پہلی کوشش ہے۔

کتاب کو دو حصوں میں شائع کیا جا رہا ہے پہلے حصہ میں غلامی کی حقیقت اور اس کے اخلاقی، نفسیاتی اور اقتصادی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ دنیا میں غلامی کا رواج کب اور کس طرح ہوا اور دعوت اسلام کے ظہور سے پہلے کن کن قوموں میں یہ رواج پایا جاتا تھا۔ اس تشریح کے بعد مسئلہ کا جو اصل مرکز ہے اس پر توجہ کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اس باب میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے۔ اس نے رواج غلامی کو مٹانے کے لیے کیسا پر حکمت طریق عمل اختیار کیا اور اس رواج کی جو خفیف وضعیف نوعیت اسلام میں باقی رہی ہے اس کی کیا وجہ ہے۔

ان حقائق کی وضاحت کے لیے ایک مخصوص اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک مطالب کتاب کی وسعت اور اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کا تعلق ہے اس موضوع پر آج تک کوئی کتاب کسی زبان میں اس مرتبہ کی شائع نہیں ہوئی۔ دوسرا حصہ غلامان اسلام کے سوانح حیات ان کی تاریخی عظمت اسلامی سوسائٹی میں ان کے مقام کی رفعت اور ان کے اخلاقی، مذہبی، علمی کارناموں پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ بھی طبع ہو کر عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ کتاب کے پایہ اعتبار وتحقیق کے متعلق یہ کہہ دینا کافی ہے کہ مولف کتاب نہ صرف یہ کہ وقت کے جدید تقاضوں سے پوری طرح باخبر اور انشاء جدید کے مسلم الثبوت ادیب ہیں بلکہ آپ ہندوستان کی سب سے بڑی مذہبی درس گاہ دار العلوم دیوبند کے ممتاز ترین فاضل ہیں۔

کسی مذہبی اور علمی کتاب کے قبول وعدم قبول کا مدار قوم کے ذوق صحیح اور مذہبی احساس پر ہے اور اس جنس کی کیا بابی معلوم!

دعا ہے کہ حق تعالیٰ کارکنان ادارہ کی اس سعی کو مشکور فرمائے اور قوم میں اپنی علمی اور مذہبی ضرورتوں کا حقیقی احساس پیدا ہو جائے۔

۱۴ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ

عتیق الرحمٰن عثمانی
ناظم ندوۃ المصنفین دہلی

دیباچہ طبع ثانی

''اسلام میں غلامی کی حقیقت'' کا پہلا ایڈیشن اب سے چھ سال پہلے نکلا تھا، ''ندوۃ المصنفین'' کے مقاصد کی بنیاد پر جب یہ عظیم الشان کتاب منظر عام پر آئی تو کہیں دور دور بھی یہ خیال نہیں تھا کہ ایسی علمی اور ٹھوس کتاب کو قوم میں جس کا مذاق علمی ابھی کچھ زیادہ گہرا اور پختہ نہیں ہوا ہے اس قدر جلد قبول عام حاصل ہوگا، جیسے کتاب شائع ہوئی اس کی ظاہری اور معنوی خوبیوں کا غلغلہ بلند ہونے لگا، مسلمانوں کے تمام مشہور علمی رسالوں اور بڑے بڑے اخباروں نے اس پر دل کھول کر بہت اچھا اظہار رائے کیا، تیسرے درجہ کے بعض غالی قسم کے قدامت پسند اور اجتماعی مسائل کو وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق غور نہ کرنے والے اصحاب کے علاوہ کتاب ہر جماعت اور ہر طبقے میں بہت پسند کی گئی۔

اپنے موضوع پر ہماری زبان میں یہ پہلی علمی اور تحقیقی تصنیف تھی اس لیے انگریزی تعلیم یافتہ حضرات اور علماء کرام دونوں نے اپنے اپنے معیار پر مباحث کتاب کو جانچا اور دیو بند سے علی گڑھ تک اس کے مضامین کا چرچا ہو گیا۔

آج مجھے یہ ظاہر کرنے میں مسرت محسوس ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ''ندوۃ المصنفین'' کی یہ سب سے پہلی کتاب ہمارے مستقبل کے لیے ''دلیل راہ'' اور نشان منزل ثابت ہوئی۔

کتاب کا پہلا ایڈیشن دو سال سے زیادہ ہوئے کہ تقریباً ختم ہو چکا تھا اب اس مشکل تر اور نازک تر وقت میں معمولی اضافوں اور نظر ثانی کے بعد دوسرا ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۰ رجب المرجب ۶۳ھ مطابق ۲ جولائی ۴۳ء عتیق الرحمٰن عثمانی

مقدمہ

اسلام کا ظہور اول اول عرب کی خشک اور بے آب و گیاہ سرزمین میں ہوا اور چند سال کی مدت میں ہی اس نے ریگستان عرب سے نکل کر روم و ایران کی طاقتور سلطنتوں کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔ وہ ایک سیلاب عظیم تھا جو عرب کی ایک "وادی غیر ذی زرع" سے ابلا اور موجیں مارتا ہوا دنیا کے اکثر حصوں میں پھیل گیا۔ اس کی موجیں ایک طرف افریقہ کے صحراؤں میں لہراتی ہوئی دیکھی گئیں تو دوسری طرف لوگوں نے چین کے میدانوں میں اس کی گنگناہٹ سنی۔ ایک طرف مغرب کے شہروں میں اسلام کا پرچم عظمت لہرا رہا تھا تو دوسری جانب مشرق اقصیٰ کے علاقوں میں توحید کے نعرے گونج رہے تھے۔ یا یوں کہو، اسلام ایک ابر کرم تھا جو عرب کے ایک گوشۂ گمنام سے اٹھا اور مشرق کے دور دراز علاقوں پر فیض و عطا کی بارش برساتا، تہذیب و تمدن کے جواہر لٹاتا اور علم و حکمت کے پھول کھلاتا چلا گیا۔ قوموں کی قدیم تہذیبیں چند سال میں بدل گئیں۔ دنیا کی تاریخ کچھ سے کچھ ہو گئی جس نے ایک مرتبہ بھی خمستان حجاز کی اس بادۂ تند و تیز کا ایک جرعہ لے لیا، سرشاری و مستی کے کیف جاں نواز میں اپنا سر "ساقی حجاز" کے قدموں پر رکھ دیا اور پھر وہیں "خاک در میخانہ" ہو کر رہ گیا۔ پھر کہاں کی سلطنت، کیسا اپنا پرانا تہذیب و تمدن، کہاں کا عیش و آرام دنیوی، جو کچھ تھا اور جتنا کچھ تھا سب کا سب اسی شراب ناب کے جرعہائے کیف بار کے نذر کر دیا۔

اسلام کا اس انوکھی شان کے ساتھ عروج و ارتقاء بے شبہ دنیا کی تاریخ کا عجیب و غریب واقعہ اور بے حد حیرت انگیز نظارہ تھا۔ یورپ جس کا ذوق تحقیق بال کی کھال نکالنے کا خوگر اور تاریخ ماضی کے علل و اسباب معلوم کرنے کا عادی ہے کس طرح ممکن تھا کہ اسلام کی عظیم الشان تاریخ و روایات کی طرف متوجہ نہ ہوتا اور اپنے مطالعہ و تحقیق کا ایک قیمتی حصہ اس شوق و ذوق میں صرف نہ کرتا۔ چنانچہ یورپ کی مختلف زبانوں میں اسلام، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی علوم و فنون سے متعلق اس کثرت سے تصنیفات موجود ہیں کہ ان کو دیکھ کر یورپ کے ذوق مطالعہ کی بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے لیکن سخت افسوس ہے کہ اسلام کی بعض روایات و تعلیمات کے متعلق ان مصنفین نے چند ایسے غلط نظریے قائم کر لیے ہیں جن سے بالاستثناء چند کسی مصنف کی کتاب خالی نظر نہیں آتی۔

ان میں شاید سب سے زیادہ اہم "غلامی" کا مسئلہ ہے۔ ایسے عیسائی مصنفین بہت کم ہیں جنھوں نے اسلام کو رواج غلام کے باقی رکھنے پر مطعون نہ کیا ہو اور پھر اس پر تمہ یہ ہے کہ بعض

مغربی ممالک میں جو بردہ فروشی کی کثرت ہو گئی تھی اور افریقہ کے لوگوں کو زبردستی پکڑ پکڑ کے غلام بنالیا جاتا تھا اس کا ذمہ دار بھی اسلام ہی کو قرار دیا جاتا ہے۔ "بے جے پول" لکھتا ہے:

"اسلامی ممالک میں غلام اتنے نہیں ہیں جتنی کہ باندیاں ہیں۔ مسلمانوں کے شہروں میں جو غلامی کا بڑا رواج پایا جاتا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ قرآن نے ان کو اجازت دی ہے کہ وہ جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کو اپنی باندیاں بنا کر رکھیں اور ان سے ہمبستری کریں...... ایک منکوحہ عورت کے ساتھ کتنی ہی باندیوں کا اضافہ کرنے کی اجازت نے مسلمانوں کے لیے سیلاب ہائے بدی کے صرف دروازے ہی نہیں کھولے بلکہ غلاموں کی گردنوں میں لوہے کی ایسی زنجیریں ڈال دی ہیں جنہوں نے غلامی کے رواج کو اسلامی ممالک میں ایک پسندیدہ طریقہ بنا دیا ہے[1]"

موئر (Muir) اپنی کتاب Life of Mohammad میں لکھتا ہے:

"جہاں تک کہ مسلمان آقاؤں کی سطوت کے ماتحت باندیوں کے ہونے کا سوال ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی تحقیر و تذلیل کا کوئی تصور اس سے زیادہ بھیانک نہیں ہو سکتا۔ باندیوں سے انسانی جماعت کی ایک حقیر مخلوق کا سا معاملہ کیا جاتا تھا جب یہ شادی کے قابل ہوتی تھیں تو ان کو شادی کے حقوق سے کلیتہً محروم کر دیا جاتا تھا اور غلام پورے طور پر آقاؤں کے قبضہ میں ہوتے تھے"

یہی مصنف ایک دوسری جگہ تحریر کرتا ہے:

"عورتوں کی غلامی، "تسری" (باندیوں کے ساتھ ہمبستری کرنا) کے جواز کے لیے ایک ضروری شرط ہے۔ اس لیے مسلمان کبھی اولی جوش اور استحاد کے ساتھ اس کے مٹانے کی کوشش نہ کریں گے[2]"

ایک اور دریدہ دہن عیسائی ٹی پی ہیوز کہتا ہے:

"غلامی کی تعلیم اسلام کے عین مطابق ہے لیکن مذہب عیسوی کو غلامی سے نفرت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب جاہلیت کی غلامی میں کچھ اصلاح کی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ شارع عرب کا منشا غلامی کو ہمیشہ قائم رکھنے کا تھا[3]"

عیسائی مصنفین بے باکانہ کہتے ہیں کہ غلامی کے رواج کے باعث مسلمانوں کو ملک ملک کی حسین و جمیل اور دوشیزہ لڑکیوں کے ساتھ لطف اندوز ہونے کا موقعہ ملتا تھا اس لیے انہوں نے غلامی کے رواج کو باقی رکھا اور نہ صرف یہی کہ باقی رکھا بلکہ اس کی بڑی شد و مد کے ساتھ حمایت کی اور ترقی دی۔

پول غلامی کی حمایت کے اسباب پر زور بیان صرف کرنے کے بعد لکھتا ہے:

"اب ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ جن اسباب نے مسلمانوں کو غلامی کے رواج کو باقی رکھنے پر مجبور کیا وہ کس قدر قوی ہیں۔ اس کو ختم کرنے کے معنی ایک بڑی حد تک یہ تھے کہ مسلمانوں میں "حرم" کا جو رواج جڑ پکڑ گیا تھا اس کا خاتمہ کر دیا جائے[4]"

یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے:

''موت ہائے مدید تک مسلمان جنگوں کے ذریعہ غلام حاصل کرتے رہے۔ ہر ایک قیدی غلام بنا لیا جاتا تھا۔ فاتح کو اختیار تھا کہ قیدیوں کو زرفدیہ کے بدلے میں یا اس کے بغیر ہی آزاد کردے لیکن دستور کے مطابق جو عورتیں گرفتار ہوتی تھیں ان کا زرفدیہ قبول نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ آرائش و اضافہ حرم کے لیے ان کو روک لیا جاتا تھا۔''

غلامی کی نسبت یہ اور اسی طرح کے بے شمار افسانے ہیں جن کو عیسائی مصنفین اپنی تصنیفات میں بڑی رنگین بیانی سے لکھتے اور اس طرح اسلام کے خلاف غیظ و غضب کی آگ مشتعل کرتے ہیں۔ ایک طرف تو اسلام کے دشمنوں کی حالت یہ ہے کہ وہ کسی جگہ کوئی رائی دیکھتے ہیں تو اس کو پہاڑ بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف ہمیں بھی ایمانداری سے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ بعض شہوت پرستوں نے غلامی کے مسئلہ سے بالکل ناجائز فائدہ اٹھایا۔ شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جن حالات گردوپیش کو ملحوظ رکھتے ہوئے استرقاق کے جواز کا حکم دیا تھا بعد کے بعض مسلمانوں نے عملی اعتبار سے قطعاً اس کی اصل روح کو فراموش کردیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تدریجی طور پر اس رسم بد کو ختم کرنا چاہتے تھے لیکن غرض مندوں نے الفاظ اباحت سے فائدہ اٹھا کر اس کو اس قدر قوی کردیا کہ آج عیسائی بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ غلامی کے خلاف عملی جدوجہد کرنے والے ہم ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ صرف عیسائی مبلغین تھے جنہوں نے بڑے زور شور سے اس کے خلاف وعظ کہے اور اس کی برائیاں واضح کیں اور قانونی طور پر اس کا انسداد کرایا۔ صد حیف کہ جو فخر مسلمانوں کے لیے مخصوص ہونا چاہیے تھا غیر اس پر دعویٰ کر بیٹھے اور اس کو اپنے لیے خاص سمجھنے لگے۔ یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ مسلمانوں نے عملاً غلامی کے مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منشائے گرامی کو بالکل نظر انداز کردیا اور غلاموں کے متعلق جو ارشادات نبوی ہیں ان کی روح کو یکسر بھلا دیا۔

ان وجوہ کی بناء پر سخت ضرورت تھی کہ ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں اسلامی نقطہ نظر سے مسئلہ غلامی پر تفصیلی بحث ہو اور اس میں یہ بتایا گیا ہو کہ غلامی کا رواج کب سے ہے؟ کن کن قوموں میں اور کس کس طرح باقی رہا؟ اور پھر اسلام نے اس کو باقی رکھا تو کیوں؟ اور کن مصالح کی بناء پر؟ اور نیز یہ کہ شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل منشاء کیا تھا۔ کتاب زیر نظر اسی ضرورت کو پورا کرنے کی طرف ایک قدم ہے:

و علی اللہ التکلان و ھو نعم المعین و نعم الوکیل.

غلامی کی تعریف

غلامی کی تعریف مذہب واخلاق کے انسائیکلوپیڈیا میں یہ کی گئی ہے: ''وہ ایک معاشرتی رواج ہے جس کے باعث ایک شخص دوسرے کی ملکیت میں داخل ہو جاتا ہے۔'' ویسٹر مارک (westermark) غلامی کی تعریف میں کہتا ہے: ''مالک کا حق غلام کی ملکیت پر اگرچہ ضروری اور قطعی نہیں ہے لیکن ایک مخصوص قسم کا ہے۔ یعنی وہ ایک ایسا حق ہے کہ آقا ہی اس سے دستبردار ہو سکتا ہے لیکن اس کو ملک محض نہیں کہا جا سکتا کیونکہ قانون اور عرف نے غلام کو بھی یک گونہ کوئی حق دیا ہے۔''

غلامی کی اقسام

اصولی طور پر غلامی کی دو قسمیں ہیں یعنی ایک یہ کہ ایک قبیلہ کے بعض آدمی اپنے بعض ہم قبیلہ آدمیوں کو اپنا غلام بنالیں اور دوسری قسم یہ ہے کہ ایک قبیلہ کے بعض افراد کسی دوسرے قبیلہ کے بعض افراد کو یا سب کو اپنی غلامی میں لے لیں پہلی قسم کو انگریزی میں Intera-tribal slavery اور دوسری قسم کو Extra-tribal slavery کہتے ہیں۔

بالکل ابتدائی زمانہ میں قبائل میں مساوات انسانی کا احساس تھا اور ایک قبیلہ کے بعض افراد اپنے ہم قبیلہ لوگوں کو اسی عزت واحترام سے دیکھتے تھے جس سے کہ وہ خود اپنے آپ کو دیکھتے تھے اس لیے اغلب یہی ہے کہ غلامی کی قسم اول کا وجود شروع زمانہ میں نہیں ہوگا۔ اب رہی دوسری قسم تو اس کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی غلامی کا وجود جنگ کے لوازم میں سے ہے جب ایک قوم دوسری قوم سے یا ایک قبیلہ اپنے حریف مقابل کسی دوسرے قبیلہ سے برسرپیکار ہوتا ہے تو ہر ایک فریق کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے مخالف کے ساتھ ہر وہ معاملہ کر گزرے جو اس کے بس میں ہو اور جس سے دشمن کو زیادہ سے زیادہ مضرت پہنچ سکتی ہو۔ یہی انسان جو بحالت امن وامان آپ کو فرشتہ محاسن اور پیکر صلح وصفا نظر آتا ہے۔ اس کو جنگ میں دیکھیے تو پہلے سے بالکل مختلف نظر آئے گا۔ پہلے یہ غیروں کا محافظ، بیگانوں کا نگہبان تھا۔ نرم دل اتنا کہ کسی یتیم بچہ کی چیخ وپکار سنتا تو کلیجہ شق ہو جاتا۔ کسی کے پاؤں سے خون نکلتا دیکھتا تو بے چین ہو جاتا اور دوڑ کر اس کی مرہم پٹی کرتا لیکن وہی

نرم خو اور رقیق القلب انسان جنگ کے وقت بالکل بدلا ہوا ہے۔ اب اس کی تلوار سے جتنے زیادہ سر قلم ہوتے ہیں اسی قدر زیادہ خوش ہوتا ہے۔ بیوہ عورتوں کے نالے اور یتیم بچوں کی آہیں اور کمزور وناتواں انسانوں کی چیخ و پکار اس کے دل کو نہیں پسیج سکتی۔ پہلے وہ فرشتہ کرم تھا مگر اب ایک خون آشام درندہ ہے، جو ہر ممکن تدبیر سے اپنے دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ دشمن کے گھر سامنے آجائیں تو انہیں آگ لگا دے۔ مال مل جائے تو لوٹ لے۔ مرد اور بچے ہاتھ آ جائیں تو غلام بنا لے اور عورتیں اس کے قبضہ میں گرفتار ہو جائیں تو ان کو اپنی باندیاں بنا کے رکھے۔

بہرحال غلامی کی دوسری قسم یعنی Extra-tribal slavery جنگ کے نتائج میں سے ہے۔ اس بناء پر یہ کہنا صحیح ہے کہ جب سے دنیا میں جنگ کا وجود ہے غلامی بھی قائم و موجود ہے۔ اخلاقی نقطہ نظر سے پہلے زمانہ کے لوگوں کا خیال یہ تھا کہ فریق فاتح کا غالب آنا اس کے برحق ہونے کی اور فریق مفتوح کا مغلوب ہونا اس کے سچے نہ ہونے کی دلیل ہے اور اس بناء پر فاتح کو اختیار ہے کہ وہ جس طرح چاہے مفتوح کو اپنے آرام و آسائش کے لیے استعمال کرے[5]۔ اس کی خواہش ہو تو مغلوب کو قتل کر دے اور اگر چاہے تو اس کو قیدی بنا کر رکھے۔ اب اس حالت میں وہ ان قیدیوں کو مار سکتا ہے، کھا سکتا ہے۔ غلام بنا سکتا ہے، کسی چیز کے تبادلہ میں دیا اور لیا جا سکتا ہے اور اس کو آزاد بھی کر سکتے ہیں[6]۔

غلامی کے رواج کے اسباب

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس رواج غلامی کے اسباب کیا تھے؟ جواب یہ ہے کہ اس کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔ مسٹر اے این۔ گلبرٹسن نے لکھا ہے کہ شمالی امریکہ کے ہندوستانیوں میں ایک رواج قائم تھا جس کو (Adoption) کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ اس رواج کی رو سے فریق مغلوب کے مرد قتل کیے جا سکتے تھے اور بچوں اور عورتوں کو زندہ رکھ کر اپنے گھر میں رکھ لیتے تھے۔ اس نامور مصنف کی رائے ہے کہ غلامی اسی رواج کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جس میں عورتوں اور بچوں کی طرح مردوں کو بھی زندہ رہنے دیا جاتا ہے اور ان کو غلام بنا کر رکھتے ہیں۔ نیبور (Nieboer) نے ایک بڑی دلچسپ بات لکھی ہے وہ کہتا ہے کہ "انسان کو جانور پالنے کی عادت ہوتی ہے اسی عادت نے بڑھتے بڑھتے انسانوں کو پالنے کی عادت کی شکل اختیار کر لی اور اس کو غلامی کہا جانے لگا"[7]۔

ہمارے خیال میں اصل یہ ہے کہ شروع شروع میں جبکہ تہذیب و تمدن کا پتہ نہ تھا اور عام انسانی طبائع پر بہیمیت و بجیمیت غالب تھی فریق فاتح اپنے گرفتار شدہ قیدیوں کو فرط غیظ و غضب میں قتل ہی کر دیتا ہوگا لیکن پھر جب لوگوں کی اقتصادی اور معاشرتی ضرورتیں وسیع ہوئیں اور ان کو ''بے معاوضہ مزدور'' کی ضرورت پیش آئی تو اس وقت انہوں نے اس امر پر غور کیا ہوگا کہ جنگ کے قیدیوں کو قتل کرنے کے بجائے اگر زندہ رکھا جائے تو ان سے بہت سے معاشرتی اور اقتصادی فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک انسان اپنے مخصوص دل و دماغ اور طبعی و عملی استعداد و صلاحیت کے باعث جماعت کو جو نفع پہنچا سکتا ہے قتل ہو جانے کے بعد اس سے اس طرح کے فوائد و منافع کی امیدیں یک لخت منقطع ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ فاتح قوم میں اگر کوئی ایسی اخلاقی و تمدنی خوبی موجود ہے جو لوگوں کے لیے جذب التفات و جلب محبت کا سبب ہو سکتی ہے تو قوی امید ہے کہ مفتوح قوم کا ایک فرد یا چند افراد جب بحیثیت غلام کے فاتح جماعت کے افراد کے ساتھ معاشرت کریں گے تو فاتح کی اخلاقی اور تمدنی خوبیاں ان کو بھی اپنا حقیقی ہمدرد و بہی خواہ بنا لیں گی۔ پھر ان زندہ قیدیوں سے اندرون خانہ و بیرون خانہ دونوں قسم کے کام لیے جا سکتے ہیں اور اس طرح ''محنت'' میں کمی اور آرام میں زیادتی پیدا ہو سکتی ہے۔ ان خیالات کی بنا پر لوگوں نے غلامی کا رواج قائم اور اسیران جنگ کو قتل کرنے کا طریقہ مسدود کیا ہوگا کیونکہ اس سے بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ فاتح قوم کے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے جو اس کے لیے ایک گونہ تقویت کا باعث ہے۔

غلامی کی نفسیاتی حیثیت

نفسیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو بعض اوقات غلامی ناگزیر یا متعدد فوائد کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جنگ میں فرض کیجئے ایک فریق کے مرد کثرت سے قتل کر دیئے گئے ہیں۔ اب جو عورتیں اور بچے ان کے پسماندگان ہیں اور جو جنگ کے موقعہ پر گرفتار کر لیے گئے ہیں ان کے لیے دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو آزاد کر دیا جائے دوسری صورت یہ ہے کہ ان کو لونڈی غلام بنا کر رکھا جائے۔ پہلی صورت میں اشکال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جبکہ ان کے سرپرست مرد زندہ نہیں ہیں تو اس آزادی کے عالم میں قوی اندیشہ ہے کہ یہ کہیں اخلاقی فواحش اور بدکاریوں میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ (جیسا کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد انگلینڈ اور جرمنی کی عورتوں کا حال ہوا)

اس بناء پر ان کے لیے آسان اور زیادہ سہل صورت یہ ہے کہ یہ کسی گھر میں باندی یا غلام ہو کر رہیں۔ ان کے اخراجات کی ذمہ داری ان کے آقاؤں پر ہوگی اور یہ بطور خدمت گزار ان کے گھروں میں رہیں گے۔ ان کے طور طریقہ میں تبدیلی ہوگی۔ اخلاق کی تہذیب و تربیت ہوگی اور پھر یہ اس گھر کے لیے اور یہ گھر ان کے لیے مفید و سودمند ثابت ہوگا۔

عورتوں اور بچوں پر ہی مردوں کو قیاس کر لیجئے۔ جو مرد جنگ میں گرفتار ہوتے ہیں عقلاً ان کے ساتھ حسب ذیل معاملہ کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ان کو قتل کر دیا جائے۔

۲۔ بے معاوضہ آزاد کر دیا جائے۔

۳۔ کسی معاوضہ کے بدلہ میں آزاد کر دیا جائے۔

۴۔ ان کو کسی جگہ شاہی قیدی (State prisoner) کر کے رکھا جائے۔

۵۔ ان کو غلام بنا لیا جائے۔

اب غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ قیدیوں کے مختلف حالات اور سیاسی مقتضیات کی بناء پر تمام اسیران جنگ کے ساتھ یکساں معاملہ نہیں ہو سکتا۔ ایک قیدی اگر آپ کا شدید دشمن ہے اور اس کے زندہ رہنے سے ملک کے امن و امان کو عظیم خطرہ پہنچنے کا اندیشہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کو قتل نہ کیا جائے۔ اس کے برخلاف بعض قیدی ایسے ہیں جن کی آزادی سے ملک کے امن کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تو موقعہ ہو تو بلا معاوضہ ورنہ کوئی عوض لے کر ان کو آزاد کیا جا سکتا ہے۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک قیدی اپنی فطری استعداد و صلاحیت کی وجہ سے تو قابل تحسین و لائق ستائش ہے لیکن ایک فساد انگیز ماحول میں رہنے کے باعث ہمارا دشمن بنا ہوا ہے تو اب اس شخص کے لیے ضروری ہے کہ اس کو اس ماحول سے نکال لیا جائے اور ایک صالح آب و ہوا اور درست فضا میں اس کی تربیت کی جائے۔ اس شخص کو نہ قتل کیا جا سکتا ہے اور نہ یونہی آزاد چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ اس کو غلام بنا کر رکھا جائے۔ رہی ایک صورت "شاہی قیدی" ہونے کی تو ظاہر ہے کہ قیدی کو اس صورت میں اخلاقی تربیت اور تہذیب و اکتساب ادب کا ایسا عمدہ اور اچھا موقع نہیں مل سکتا جتنا کہ اس صورت میں مل سکتا ہے جبکہ وہ غلام کی حیثیت سے کسی گھر کا ایک فرد ہو کر رہے۔

بہر حال یہ وجوہ و اسباب ہیں جن کے باعث غلامی کے رواج کا ظہور ہوا اور نہ صرف کسی ایک ملک و قوم میں بلکہ قریب قریب دنیا کی تمام قوموں میں شائع ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ غلامی کو

خواہ کتنا ہی برا کہا جائے اور اس کو مذموم و قبیح قرار دیا جائے لیکن وہ نتیجہ جنگ ہے اور جس طرح آپ مخصوص حالات میں جنگ ایسی ہولناک، مصائب بار اور تباہ کن چیز کو برداشت کر لیتے ہیں اور نہ صرف برداشت بلکہ اس کو بعض اوقات صنعت و حرفت کی ترقی اور ملکی عروج و ارتقاء کا باعث قرار دیتے ہیں۔ مخصوص حالات میں اگر آپ اسی طرح غلامی کے جرعہ تلخ کو بھی دوا کا ایک گھونٹ سمجھ کر پی جائیں تو کیا مضائقہ ہے؟

غلامی کا اجتماعی و تمدنی پہلو

یہی وجہ ہے کہ اخلاقیات و اجتماعیات کے بعض علماء متبحرین نے غلامی کے رواج کو بعض خاص حالات کے پیش نظر مفید اور نافع اور تمدن کی ترقی کا باعث کہا ہے۔ ہربرٹ اسپینسر کہتا ہے:

"یہ تسلیم کر لینا بالکل ممکن ہے کہ جب ایک فریق نے تسلط و اقتدار کے باوجود اپنے دشمنوں کو ہضم کرنے کے بجائے اپنا غلام بنا لیا ہے، تو ان کو زندہ چھوڑ دینا ہی ترقی کی طرف ایک قدم ہے۔ غلامی خواہ کتنی ہی بری ہوتا ہم وہ اضافی طور پر اچھی ہے اور بعض حالات میں ہنگامی طور پر وہی سب سے زیادہ قابل عمل ثابت ہوتی ہے۔[8]"

لارڈ ایکٹن نے کہا ہے:

"بعض اوقات حالات ہی ایسے رونما ہوتے ہیں کہ ان کے پیش نظر یہ کہنا نامناسب نہیں ہوتا کہ غلامی بذات خود آزادی کی منزل کا ایک مرحلہ ہے۔[9]"

مسٹر آر۔ ایچ بارو نے "رومن امپائر میں غلامی" کے نام سے ایک نہایت محققانہ اور قابل قدر کتاب لکھی ہے، اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"غلامی ایک ایسا لفظ ہے جو سنتے ہی کانوں کو برا لگتا ہے اس لفظ کے کان میں پڑتے ہی گراں بار زنجیروں کی جھنکار کوڑوں کی چٹاخ پٹاخ اور مظلوم غلاموں کی چیخ و پکار کا تصور قائم ہو جاتا ہے...... غلامی کو عموماً اس کے برے پہلوؤں کے ساتھ دیکھا جاتا ہے لیکن اگر تحقیق کی جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ غلام خواہ کچھ زیادہ مقدس اور پارسا نہ ہو، تاہم اس کو بھی تہذیب کی ترقی میں کسی حد تک ضرور دخل ہوتا ہے، تاہم غلامی کے رواج کا خاتمہ کر سکتے ہیں لیکن ہم کو نہیں چاہیے کہ عہد گزشتہ کے رواج غلامی کو قطعی طور پر برا کہیں اور اس کو بالکل ہی مذموم قرار دیں"

ہوب ہاؤس (Hobhouse) اپنی کتاب ارتقاء اخلاق (Morals in coolution) میں لکھتے ہیں:

"معاشرتی ترقی میں کبھی ایسا دور بھی آتا ہے جبکہ فتح یاب یہ خیال کرتا ہے کہ زندہ گرفتار قیدی مردہ کی نسبت زیادہ مفید و کار آمد ہے[10]"

ایک اور انگریز مصنف نے لکھا ہے:

بہر حال جماعت کے خارجی تعلقات اور رشتے خواہ کچھ ہی ہوں، غلامی ہرگز وجود میں نہ آتی اگر اخلاقی اور اقتصادی نقطہ ہائے نظر کے ماتحت کسی قبیلہ کی معاشرتی ضروریات اس رواج کے ساتھ وابستہ نہ ہوتیں[11]"

غلامی کا اخلاقی اور اقتصادی پہلو

اخلاقی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ غلامی کے رواج کا برا یا اچھا ہونا موقوف ہے غلام بنانے والوں کے اخلاق کے اچھا یا برے ہونے پر اگر وہ لوگ اخلاقی اعتبار سے بلند و برتر ہیں تو غلام ان کے پاس خوش رہیں گے اور ان کے فیض صحبت سے ان کے اخلاق بھی اچھے ہو جائیں گے۔ انیسویں صدی کے فرانسیسی دائرۃ المعارف میں مذکور ہے:

"لڑائیوں نے نوع بشری کو بہت بڑا فائدہ پہنچایا ہے، یہاں تک کہ لڑائی کا ایک بدترین نتیجہ یعنی گرفتار شدہ قیدیوں کو غلام بنا لینا بھی ایک فائدہ عظیم سے خالی نہیں ہے...... نوع بشری کبھی ایسے طریقوں کے ماتحت ترقی پذیر ہوتی ہے کہ اس کا وہم و گماں بھی نہیں ہوتا...... غلام بنانے سے ایک بڑا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ عورت ان مصائب سے بچ جاتی ہے جو اس کو اس وقت پیش آتے ہیں جبکہ خاوند کے گھر پر کوئی غلام نہیں ہوتا۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ہر انسان فطرۃً جب کسی دوسری قوم کے افراد کے سامنے ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ اس اجنبی کے سامنے اس کے قول و عمل سے کسی عزیز و قریب سے متعلق کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس کے باعث وہ خود اور اس کا تمام قبیلہ ذلیل و خوار ہو جائے اس بناء پر بڑا فائدہ یہ ہے کہ غلام کی وجہ سے شوہر اپنی بیوی کا، بیوی اپنے شوہر کا اور دوسرے رشتہ داروں کا ادب و احترام کرنا سیکھ جاتی ہے۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غلامی کا رواج ہنگامی طور پر ہی ضروری یا مفید ہو سکتا ہے۔ تہذیب و تمدن اور صنعت و حرفت کی غیر معمولی ترقی کے زمانہ میں اس کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ فائدہ۔ چنانچہ یہی مضمون نگار اس مقالہ کے آخر میں کہتا ہے[12]

"لیکن اب غلام بنانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ طرح طرح کی مشینیں ایجاد ہو گئی ہیں جن کے باعث لوگوں کو کاروبار میں غلاموں سے مدد لینے کی ضرورت نہیں ہے۔"

ہربرٹ اسپینسر نے اپنی کتاب "اصول عمرانیات" (The principles of sociology) میں ایک مقام پر بڑی صفائی کے ساتھ لکھا ہے کہ:

"غلامی کے بغیر سیاست کا مرحلہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔"

سمنر (Sumner) کا خیال ہے کہ غلامی جہاں کہیں بھی رہی ہے اس نے سوسائٹی کے تمام گوشوں کو متاثر کیا ہے۔ اس کو قبیلوں اور جماعتوں میں اختیار کیا جاتا ہے تو اس سے ان تمام شعبوں میں ایک طرح کا رنگ و روغن پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر اسی نامور مصنف نے ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ "غلامی ایک بڑی معلمہ ہے جو پھرتی کے ساتھ کام کرنا سکھاتی ہے اور وہ ایک ایسی جماعت ہے جس کے باعث لوگوں کو صنعتی نظام کے چلانے میں مدد ملتی ہے۔ ایک اور انگریز مصنف کا مقولہ ہے:

"فرصت ابتدائی جماعتوں کی اولین ضرورت ہے اور اس کی تکمیل صرف غلاموں کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔"

ڈیلے اور وارڈ (Dealey and Ward) ان دونوں کا خیال یہ تھا کہ اصل مشکل یہ ہے کہ لوگوں سے کس طرح کام کرائیں اور سوائے غلامی کے کوئی دوسری چیز اس مقصد کے لیے مفید نہیں ہو سکتی تھی۔

یونان کے فلاسفۃ کا عام خیال یہ تھا کہ انسانی طبقات کو راعی اور رعایا، حاکم اور محکوم، آقا اور غلام کی طرف منقسم ہونا فطرتاً ضروری ہے۔ دنیا کا نظام اجتماعی اس وقت تک باقی اور قائم و برقرار نہیں رہ سکتا جب تک کہ بعض لوگ حکومت کرنے والے قانون بنانے والے اور اس کو نافذ کرنے کی طاقت و قوت رکھنے والے نہ ہوں اور ان کے بالمقابل اکثر وہ نہ ہوں جو رعایا کہلائیں[13] اور جن پر حکومت کی جائے۔ ایک ملک کا مختار کل اور حاکم اعلیٰ کہلاتا ہے اور تمام اہل ملک اس کی رعیت کہلاتے ہیں۔ پس جس طرح انسانوں کی ایک بڑی جماعت ایک شخص واحد کی یا چند آدمیوں کی محکوم ہو سکتی ہے انفرادی طور پر ایک فرد واحد ایک شخص واحد کا بھی محکوم ہو سکتا ہے۔ یہی محکومیت اگر

ملکیت کا رنگ اختیار کر لے تو غلامی کہلاتی ہے۔ یونانی فلاسفہ قدیم کی رائے تھی کہ تمدنی اعتبار سے غلاموں کا وجود ناگزیر ہے۔ تاکہ اہل دماغ جسمانی محنت سے محفوظ رہ کر اعلیٰ سے اعلیٰ دماغی کام کر سکیں اور فکر و نظر کی یکسوئی میں جسمانی سخت کام مخل نہ ہوں۔

مسٹر البرٹ۔ این گلبرٹسن نے ذیل کی عبادت میں بور حقیقت انہی فلاسفہ کی ترجمانی کی ہے۔

"غلامی نے انسان کی اقتصادی کوششوں اور اس کے ذریعہ معاشرتی شعبوں پر جو عمیق اثر کیا ہے وہ محنت کا منقسم ہو جانا ہے۔ انسانی جماعت کی یہ تقسیم کہ بعض حاکم ہوں اور بعض محکوم، بالکل ابتدائی اور طبعی تقسیم و تفریق ہے۔ غلامی ایسے افراد کو پیدا کرتی ہے جو کام کرنے ہی کے لیے..... سوچنے کے لیے نہیں پیدا کئے گئے ہیں۔ یہ لوگ سوچنے کے مکلف نہیں ہوتے کیونکہ فکر و نظر کے لیے دوسرے افراد ہوتے ہیں۔"

یہی مقالہ نگار آگے چل کر لکھتا ہے:

"انسانی سوسائٹی کے انتہائی سادہ طبقوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ غلامی کا ظہور اور اس کی نشوونما معاشرتی حالات پر موقوف ہے یہ حالات ہمارے زمانہ کے ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کے معاشرتی احوال میں سراسر ناپید ہیں"[1]

پھر یہی مصنف اسی مقالہ میں ایک اور جگہ لکھتا ہے:

اگر غلامی کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ وہ قتل کر دینے کا عوض و بدل ہے تو صرف یہی ایک حیثیت اس بات کی دلیل ہے کہ غلامی اخلاقی ترقی کی طرف ایک پیش قدمی ہے۔

غلامی پر ایک تاریخی نظر

غلامی سے متعلق مصنفین مغرب کے ان خیالات کو معلوم کرنے کے بعد اس پر ایک تاریخی نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ غلامی ازمنۂ قدیمہ کی تمام ترقی یافتہ قوموں میں پائی جاتی تھی اور مذہبی اعتبار سے دیکھیے تو ثابت ہوتا ہے کہ مسیحیت اور یہودیت اور ہندومت ان تینوں کی مذہبی کتابوں میں غلامی کے رواج کی مذمت کہیں نہیں کی گئی جس کی توجیہ آج کل کے عیسائی عجیب و غریب طریقے سے کرتے ہیں۔

غلامی اور مسیحیت

مسٹر ایل۔ڈی۔ اگیٹ (L.D. Agate) لکھتے ہیں:

حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات میں غلامی کی صاف طور پر مذمت کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غلامی کا مخالف گروہ اپنی تائید کے لیے انجیل کی کسی ایک آیت کو بھی پیش نہیں کرسکتا۔ اس کے برخلاف غلامی کا حامی گروہ اپنی تائید میں انجیل کے اصل متن (Scripture) کے الفاظ سے استدلال کرسکتا ہے۔ ہمارے آقا (حضرت مسیح) نے اپنے عہد کے سیاسی اور معاشرتی حالات کو پیش نظر رکھ کر ایسی تعلیمات تلقین کی ہیں جو عیسائی گرجا اور تاریخ کے دور میں خود بخود حالات کے مطابق کام کرتی رہیں۔ سینٹ پال کی تعلیمات میں کہا گیا ہے کہ "آزاد و غلام دونوں برابر ہیں" لیکن اس سے زیادہ وضاحت ہم کو اس پیغام میں ملتی ہے جو سینٹ پال نے فائلمین (Philman) کے نام بھیجا تھا اور جس میں انہوں نے اس کے بھاگے ہوئے غلام اونیسمس (Onisemus) کو حکم دیا ہے کہ پھر اپنے آقا کے پاس واپس چلا جائے۔ سینٹ پال اپنے پیام میں فائلمین سے درخواست کرتا ہے کہ اونیسمس کا گناہ معاف کردینا چاہیے لیکن نفس غلامی کی مذمت انہوں نے کہیں نہیں کی ہے[1]۔

عیسائی ارباب قلم نے جب دیکھا کہ غلامی کی مذمت تمام انجیل میں کہیں نہیں ہے اور عیسائی ممالک میں غلام بنانے اور غلاموں کی خرید و فروخت کرنے کا رواج بہت افراط و بہتات کے ساتھ پایا جاتا ہے تو اب انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں تاویلات و توجیہات پیدا کرنی شروع کیں اور اس سلسلہ میں خوب موشگافیاں کیں۔

چنانچہ یہی مصنف لکھتا ہے:

"اب سوال یہ ہوتا ہے کہ حضرت مسیح نے غلامی ایسی وحشیانہ رسم کی مذمت کیوں نہیں کی؟ تو جواب یہ ہے کہ اس کے تین اسباب ہیں:

۱۔ ہمارا آقا (حضرت مسیح) نے اپنی تعلیمات ایسے انداز میں پیش کی ہیں جو ہر زمانہ کے سیاسی حالات کے ماتحت قابل عمل ہو سکیں۔

۲۔ یک لخت غلامی کے رواج کا خاتمہ کر دینا، اس کے لیے کوشش کرنا رومانی سوسائٹی کے نظام معاشرت کو صدمۂ عظیم پہنچاتا۔

۳۔ گرجا کا ابتدائی عہد اس امید میں تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھر دوبارہ جلد ہی تشریف لائیں گے۔ اس بناء پر غلامی ایسی مادی چیز پر کوئی توجہ نہیں کی گئی اور یہ خیال قائم کر لیا گیا تھا کہ ہر انسان کو اپنی اس دنیوی زندگی میں اپنی حالت پر قانع رہنا چاہیے خواہ وہ کسی کا حاکم ہو کر زندگی بسر کر رہا ہو یا کسی کا محکوم و مغلوب ہو کر"

اسی مضمون میں اس کی ایک اور توجیہ کی گئی ہے اور وہ غالباً سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ فاضل مقالہ نویس کہتا ہے: "غالباً سینٹ پال کو اس کا خطرہ تھا کہ اگر عیسائیوں نے یہ محسوس کر لیا کہ تمام عیسائی خواہ وہ دنیوی پوزیشن کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف ہوں روحانی برتری اور معنوی بزرگی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے برابر ہیں تو کہیں اس احساس کے باعث پرانا نظام معاشرت درہم برہم نہ ہو جائے"

ہم نہیں کہتے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کی یہ توجیہات و تاویلات غلط ہیں لیکن کیا اچھا ہوتا کہ اسلام پر اعتراض کرتے وقت بھی یہ تاویلات ان مسیحی ارباب قلم سے فراموش نہ ہو جاتیں۔

غلاموں کا مسیحی تخیل

آقا اور غلام کا رشتہ کیا ہوتا ہے؟ اسکندریہ کے سینٹ کارُل (Cyril) نے ان دونوں کو صانع اور مصنوع سے تشبیہ دی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات غلام کو کس حقارانہ نظر سے دیکھتے تھے[۱۶]۔

انجیل میں غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم کہیں نہیں ہے اور نہ ان کے ساتھ حسن معاشرت کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس غلاموں کو جگہ جگہ تنبیہ کی گئی ہے کہ اپنے آقاؤں کی اطاعت کریں اور ان کے حکم سے سرمو منحرف نہ ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری بولیس نے اپنے ایک خط میں جو اس نے افسسین کے نام لکھا ہے، غلاموں کا ذکر کیا ہے اور ان کو تاکید کی ہے کہ تم اپنے آقاؤں کی اطاعت ایسی ہی کرو جیسی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کرتے ہو۔

اور جو خط تیموشاؤس کو لکھا ہے اس میں بھی یہی تحریر کیا ہے اور اخیر میں یہ تصریح کر دی ہے کہ "جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی بعینہ تعلیم ہے اور جو شخص اس سے انکار کرتا ہے جھوٹا ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک دوسرے حواری پطرس نے بھی غلاموں کو وصیت کی ہے کہ "انہیں چاہیے ہر وقت اپنے آقاؤں کے اطاعت گذار و فرمانبردار بنے رہیں۔"

بولیس نے جو خط اہل افسس کے نام لکھا تھا قدیس باسیلیوس نے اپنی کتاب "القواعد الادبیہ" میں اس کے بعض حصوں کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "یہ خط اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ غلام پر اپنے آقاؤں کی اطاعت واجب ہے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے۔"

مسیحی علماء غلامی کو انسانی بے کسی و بے بسی کا کوئی المناک حادثہ نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انسانی طبیعت کا اقتضاء ہی یہ ہے کہ ان میں بعض افراد احرار ہوں اور بعض غلام۔ جیسا کہ قدیس توماس نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے اور پھر اپنے دعوے کو مذہبی وضعی قوانین سے ثابت کیا ہے۔

ان لوگوں کو غلاموں پر رحم کیوں آتا۔ یہ سمجھتے تھے کہ ہم نے غلاموں کو قتل نہیں کیا یہی ہمارا سب سے بڑا احسان اور کرم ہے۔ جیسا کہ ایک مشہور پادری بوسونٹ فرنساوی نے لکھا ہے [17]۔

علامہ فرید وجدی نے لاروس کے انسائیکلو پیڈیا کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ تمام عیسائی علماء اس کا اقرار کرتے ہیں کہ غلام بنانے کا رواج ان کے ہاں مشروع تھا اور مذہبی احکام میں داخل تھا۔

مسٹر اے۔ این گلبرٹسن تحریر فرماتے ہیں:

"ہم کو یہ یاد دلانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ابھی تھوڑے ہی زمانہ تک غلامی نہ صرف یہ کہ ترقی یافتہ قوموں کی حکومتوں میں منظم طریقہ پر قائم تھی......

وہ قومیں جو مذہباً عیسائی تھیں...... بلکہ دینیات کے بڑے بڑے عالم اس کو حکم خداوندی سمجھتے تھے اور ایک مصلحانہ قانون یقین کرتے تھے [18]۔

پھر اس "مصلحانہ قانون" میں اس قدر شدت اور افراط ہوئی کہ افریقہ کی بعض قوموں کا بالکل خاتمہ ہی ہو گیا اور یورپ والوں نے ان کو پکڑ پکڑ کے غلام بنا لیا۔ ایک عیسائی مبلغ لکھتا ہے:

یورپ والوں نے افریقہ کے سیاہ فام انسانوں پر بڑے بڑے مظالم کیے ہیں اور اتنے سخت کہ اب ان کا کفارہ بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر قومیں بالکل ختم ہو گئی ہیں۔ مثلاً مونغوی اور فالوہ اور نکوی سفید فام نخاس آتے تھے اور انہیں اور ان کے بچوں کو گرفتار کر کے لے جاتے تھے۔[19]

غلاموں کی تجارت

بازاروں میں غلاموں کی کھلم کھلا تجارت ہوتی تھی اور بازاری چیزوں کی طرح ان کا لین دین ہوتا تھا۔[20] مختلف شہروں میں ان کے مستقل بازار قائم تھے اور ان کے لیے پوپ سلیطائن پنجم (۱۹۱۴ء) نے خاص خاص قواعد بنائے تھے جن میں سے بعض یہ ہیں۔

۱۔ یہودی صرف وہی غلام رکھ سکتے ہیں جن کو گھروں میں پالا گیا ہو۔

۲۔ اگر وہ غلام عیسائی ہوں تو آزاد ہو سکتے ہیں۔

۳۔ اگر کسی پادری نے کسی باندی سے شادی کر لی ہے تو اس کے تمام بچے گرجا کے غلام سمجھے جائیں گے۔ ان کو اپنے باپ (پادری صاحب) کے گناہ کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔

مسٹر اے۔ این گلبرٹسن نے بالکل صاف لفظوں میں کہا ہے کہ مسیحی پیشوایان قوم غلاموں سے تو یہ کہتے تھے کہ اپنے آقاؤں کی اطاعت کرو لیکن آقاؤں سے یہ نہیں کہا کہ اپنے غلاموں کو آزاد کرو۔[21]

غلاموں کے ساتھ سلوک

غلاموں کے ساتھ عیسائی اقوام کا معاملہ اچھا نہیں تھا، زمین میں کاشت کراتے تھے، سخت سے سخت کام لیتے تھے اور چھوٹی چھوٹی خطاؤں پر بری طرح زدوکوب کرتے اور سنگین سزائیں دیتے تھے۔ ویسٹر مارک کہتا ہے: "غلامی کا رواج کم از کم برطانوی مستعمرات میں اور ان مقامات پر جہاں غلامی کا رواج ہے ظلم و ستم کے اعتبار سے اس غلامی سے بدرجہا زیادہ ظالمانہ اور جابرانہ ہے جو کافروں کے قدیم و جدید ممالک میں پایا جاتا ہے"

یہی مصنف دوسرے مقام پر یوں رقمطراز ہے:

تیرہویں صدی میں آقا کو اپنے غلام پر ہر طرح کا حق تھا کہ چاہے تو اس کو زندہ رہنے دے یا ہلاک کر دے۔ یہ لوگ غلام کو لکھنے پڑھنے سے منع کرتے تھے اور جو اس کے خلاف کرتا تھا اس کو سزا دی جاتی تھی۔ غرض یہ تھی کہ غلام اپنے حقوق سے بے خبر رہیں۔[22]

قرون وسطیٰ میں، یورپ میں غلاموں کا حال

قرون وسطیٰ میں یعنی عین اس وقت جبکہ دنیا اسلام کے نور سے جگمگا رہی تھی۔ صرف ایک یورپ تھا جو مسیحیت کے نام پر دنیا بھر کے تمام اخلاقی عیوب وقبائح کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اس زمانہ کے جاگیرداری نظام میں غلام کی کیا حیثیت تھی اور اس نظام کے ماتحت قانونی طور پر اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جاتا تھا؟ اس کا جواب آپ کو مسٹر سی۔ پی اسکاٹ کی ضخیم اور پر از معلومات کتاب "ہسٹری آف دی مورش ایمپائر ان یورپ" کے اقتباسات ذیل سے ملے گا۔ ملاحظہ فرمائیے۔ جناب موصوف لکھتے ہیں:

"غلاموں کی دو بڑی قسمیں تھیں، جو قانون کی کج مج زبان اور پیچ دار اصطلاح کے مطابق "غلام اسفل" اور "غلام اعلیٰ" کہلاتے تھے۔ ان دونوں پر جاگیرداروں کو اختیار کلی حاصل تھا۔ ان کے معاملوں میں جاگیردار کو کسی کی جواب دہی کرانے کی ضرورت نہ تھی۔ مقدم الذکر تو جاگیردار کی ذات خاص سے وابستہ تھے اور جائیداد منقولہ کی طرح سے ہر وقت فروخت یا کسی اور طرح منتقل کیے جاسکتے تھے۔ مؤخر الذکر کا تعلق اراضی سے تھا اور وہ کسی طرح اس سے جدا نہ ہو سکتے تھے لیکن بہر حال یہ غریب بار بردار جانوروں کی فہرست میں شامل تھے اور ان کی انہیں جیسی قدر و قیمت تھی ان کو وہ تمام سختیاں اٹھانی پڑتی تھیں جو طمع اور خوئے بد اختراع کر سکتی تھی، یا جذبات بے رحمی ان پر ڈال سکتے تھے۔ صرف یہی نہیں تھا کہ وہ اپنے جاگیرداروں کے جبر و ظلم کو سہتے تھے بلکہ ان پر کچھ پابندیاں بھی تھیں جن کو اسی زمانہ کے لوگ گوارا کر سکتے تھے کہ جب نہ عزت و حرمت کا خیال تھا نہ انصاف و عدل کا اور نہ ننگ و ناموس کا۔ اگر کوئی جاگیر کسی وجہ سے منتقل ہوتی تھی تو دستاویز میں ان غریبوں کا نام بھی نہیں آتا تھا کیونکہ قانون نافذ الوقت کے بموجب ان کو جاگیر کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا، جیسے اینٹ پتھر، درخت اور جھاڑیاں وغیرہ حالانکہ یہی لوگ وہ چیز تھے جن کی وجہ سے کسی جاگیر کی قیمت میں کمی یا اضافہ ہوتا تھا۔ بے رحم جاگیردار اپنی دناءت نفس کی وجہ سے ان سے رات دن برابر کام لیتے تھے اور جہاں جانور باندھتے تھے وہیں ان کو پڑ رہنے کی جگہ دیتے تھے۔ ان کی گردن میں کسی دھات کا ایک طوق پڑا رہتا تھا (تانبے کا یا چاندی کا) اور اس پر اس کا اور اس کے آقا کا نام کھدا رہتا تھا۔ اس کی عمر دیدہ و دانستہ ضائع کی جاتی تھی، اس کو کوئی حقوق حاصل نہ تھے، آزادی کے نام سے بھی وہ

آشنا نہ ہوتا تھا، اس کو سیر و تفریح سے کوئی سروکار نہیں تھا، اس کی شخصیت گم ہو جاتی تھی وہ اسی زمین کی مٹی ہو جاتا تھا جس پر وہ دن رات محنت و مشقت کرتا تھا جب موت آ کر اسے اس مصیبت سے رہائی دلواتی تھی تو وہ اسی خاک میں مل کر خاک ہو جاتا تھا۔ بے کسی اور جان کاہی کی کوئی مثال اور انسانی ظلم و ستم کی کوئی افسوسناک نظیر دنیا بھر میں ایسی نہیں ملتی جیسی کہ قرون متوسطہ کے ہاں غلامان اعلیٰ کی تھی۔ (اخبار الاندلس ج ۳، ص ۲۴۳، ۲۴۴)

یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے:

"جاگیرداروں کو اپنے غلاموں کے لوٹنے کا حق تو قانونا حاصل تھا ہی، لوٹ میں اضافہ کرنے میں وہ عجیب محیر العقول ذرائع سے کام لیتے تھے غلاموں کی زندگی میں جو تبدیلی ہو۔ وہ کوئی نیا کام شروع کریں، ان کے یہاں کوئی بچہ پیدا ہو، شادی ہو یا مرے وہ کوئی نیا جھونپڑا یا مکان بنائیں، جانور رکھیں، فصل اٹھا کر گھر لائیں تو اجازت کی ضرورت ہوتی تھی اور ہر اجازت کے لیے الگ نذرانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ غلاموں کے خاندان کی عورتوں کی عصمت و عفت بالکل آقاؤں کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔ قانون مذکورہ کی نہایت شرمناک دفعات کے بموجب ان عورتوں کی حالت انتہا سے زیادہ بری تھی۔ بہت سی جاگیروں میں قانون نے غلاموں کی دلہن کے متعلق جاگیرداروں کو بے انتہا آزادانہ حقوق عطا کر رکھے تھے اور جہاں جہاں یہ قانون نافذ تھے وہاں اس پر عمل درآمد بھی تھا اور کوئی شخص خواہ کسی حیثیت کا ہو، بشرطیکہ وہ جاگیردار کے اقتدار کو تسلیم کر چکا ہو اس قانون کی پابندی سے انکار نہیں کر سکتا تھا، مختلف ممالک میں اس ٹیکس کا جس کو "دلہن کا ٹیکس" کہتے تھے الگ الگ نام تھا۔ قانون جاگیرات کی بعض دفعات پر عمل ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو۔ اس کی ہر جگہ ہی پابندی ہوتی تھی۔ شرفاے کلیسا اس کی ہر جگہ پابندی کراتے تھے۔ سب سے پہلے انہی حضرات نے اس قانون پر عمل کرنا شروع کیا اور سب کے بعد انہی نے اس کو چھوڑا۔ یہ شرمناک حق ہر بڑے بڑے دیر (Monastary) کے جاگیرداروں کو اور یورپ کے تمام کیتھولک اسقفیہ کو حاصل تھی۔ کچھ رقم ادا کرنے کے بعد دلہن اس ٹیکس کے ادا کرنے سے معاف ہو سکتی تھی لیکن یہ بھی جاگیردار کی مرضی پر منحصر تھا۔ کوئی شخص استحقاقاً یہ معافی نہ لے سکتا تھا۔ مختلف مقامات میں یہ اثر ہمسایہ جاگیرداروں کی باہمی رضامندی سے وسیع کر لیا جاتا تھا۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مداخلت بیجا کے تاوان میں ہمسایہ جاگیر کی دلہنوں پر اس قانون کا نفاذ کر دیا جاتا تھا۔ زمانہ حال کی تہذیب و ثقافت اس کو گوارا نہیں کر سکتی کہ اس عجیب و غریب اور شرمناک قانون کی تعطیل کی

جائے قرون متوسطہ کے قانون کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ جو خرابیاں اس قانونی رسم پر عمل درآمد کرنے سے پیدا ہوئی تھیں ان کا ایک ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ نہایت بے زبان اور حلیم الطبع غلام بھی بعض اوقات اس بے عزتی سے برافروختہ ہو جاتا تھا اور اس کے انتقام میں یا تو اپنے آقا کی جان لے لیتا تھا، یا بغاوت کرا دیتا تھا۔ (اخبار الاندلس۔ ج ۳، ص ۴۲۶، ۴۲۵)

غلامی اور یہودیت

یہودی شریعت کی رو سے ایک عبرانی دوسرے عبرانی کو غلام بنانے کے لیے ان تینوں صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو اختیار کر سکتا تھا۔

۱۔ کوئی شخص غربت کے باعث قرض ادا نہیں کر سکتا، اس صورت میں ایک امیر کو یہ حق حاصل تھا کہ اس مدیون غریب کی طرف سے اس کا قرض ادا کر دے اور اس کو اپنی غلامی میں لے لے۔

۲۔ کسی نے چوری کی ہے اور اب وہ چوری کا مال اس کے مالک کو واپس نہیں کر سکتا تو اس شخص کو یہ حق تھا کہ اپنے تئیں کسی امیر کے ہاتھ فروخت کر دے اور وہ اس کی طرف سے چوری کا مال ادا کر کے اس شخص کو اپنی غلامی میں قبول کر لے۔

۳۔ والدین کسی بناء پر اپنے بیٹے یا بیٹی کو کسی کے ہاتھ بیچ ڈالیں۔[۲۳]

یہودی غلاموں کی تجارت بھی کرتے تھے۔ لوئس مقدس (Louis tho pious) کے عہد میں عیسائی غلاموں کی ایک بڑی تعداد اسپین اور شمالی افریقہ میں لائی گئی تھی۔ یہ لوگ مسٹر جے ابلسن کے بقول دلالی کرتے تھے۔ مسلمان غلام، عیسائیوں کو اور عیسائی غلام، مسلمانوں کو پہنچاتے تھے۔

اسپین کی خوشحالی کے زمانہ میں (جس کی مدت دسویں صدی عیسوی سے پندرہویں صدی کے ختم تک ہے) یہاں کے بہت سے متمول یہودی خاندان غلاموں کے فراہم کرنے سے بہت کچھ مال و دولت جمع کرتے تھے۔[۲۴]

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ دوسری اقوام کی بہ نسبت یہودیوں کے ہاں غلاموں کے حقوق زیادہ تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے ہاں غلامی کی مدت سات برس تھی، اس کے بعد وہ آزاد ہو جاتا تھا بعض بعض عبرانی تو اپنی باندیوں کو بیوی بنا لیتے تھے اور ان کو اپنے گھر کی ملکہ بنا کر رکھتے تھے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بعض غلاموں کا نکاح ان کے آقاؤں کی بیٹیوں تک سے بھی ہو جاتا تھا۔[۲۵]

یہودیوں کے مذہب میں غلاموں کے لیے جو حقوق اور رعایتیں تھیں وہ اسلام سے بہت ملتی جلتی ہیں، مثلاً تلمود اور دوسری مذہبی و اخلاقی کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہے۔

۱۔ اگر کوئی شخص اپنے غیر یہودی غلام کے ساتھ برا معاملہ کرے گا تو اس کو مجبوراً غلام آزاد کرنا ہوگا۔

۲۔ اگر آقا غلام کو آزاد کرنے کا منشاء زبانی طور پر ظاہر کرتا ہے تب بھی وہ غلام آزاد ہو جائے گا اور وہ شخص اپنے الفاظ واپس نہ لے سکے گا۔

۳۔ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب قانون یہ تھا کہ اگر آقا نے اپنے غلام کی شادی کسی آزاد عورت سے کر دی یا اس کے سر پر کوئی تعویذ رکھ دیا یا اس کو کسی ایسے کام کے کرنے کا حکم دیا جو آزاد لوگوں کے لیے ہی مخصوص ہیں تو ان تمام صورتوں میں غلام آزاد ہو جائے گا اور اس کا آقا مجبور ہوگا کہ اس کو پروانۂ آزادی لکھ کر اور اپنے دستخط ثبت کر کے دے[۲۶]۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے قوانین وضوابط سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہودی غلاموں کے ساتھ کس قدر نرم اور قابل تحمل معاملہ کرتے تھے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ غلاموں کا مرتبہ معاشرتی اعتبار سے کتنا پست اور ذلیل سمجھتے تھے، گویا ان کے نزدیک غلام بحیثیت غلام ہونے کے نہ تو اس قابل تھا کہ کسی شریف عورت سے نکاح کرے اور نہ اس لائق تھا کہ کسی مجمع کے سامنے کسی مذہبی کتاب کی تین آیتیں پڑھے اور نہ اس کا حقدار تھا کہ اس کے سر پر از راہ شفقت و محبت کوئی تعویذ آقا کے ہاتھ سے رکھا جائے۔

غلامی اور ہندو مذہب

سنسکرت کی تمام مذہبی قوانین کی کتابوں میں غلامی کا ذکر موجود ہے اور اس کی اصل حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ منو کی کتاب میں غلام بنانے کے سات اسباب مذکور ہیں۔

(۱) جنگ میں گرفتار ہونا۔ (۲) نان نفقہ کے لیے خود برضا و رغبت اپنے آپ کو کسی کی غلامی میں دے دینا (۳) کسی باندی کے بطن سے پیدا ہونا (۴) خریدنا (۵) بطور ہبہ یا تحفہ کے حاصل کرنا (۶) اپنے بزرگوں سے وراثۃً پانا (۷) سزا کے ذریعہ غلامی کی تحقیر کرنا۔

نارد نے غلاموں کی پندرہ قسمیں شمار کی ہیں، جن میں سے سات یہی ہیں اور آٹھ ان کے علاوہ ہیں۔ ان میں قمار بازی میں ہار کر کسی کا غلام بن جانا اور قرض ادا نہ کر سکنے کی بنا پر کسی کا غلام ہو جانا خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

شودروں کی نسبت ان کا خیال یہ تھا کہ یہ لوگ برہما کے قدموں سے پیدا ہوئے ہیں، اس بنا پر غلامی ان کے بدن کا جزو بن گئی ہے۔ اگر ان کا مالک انہیں آزاد کردے یہ لوگ پھر بھی غلامی سے نہیں نکل سکتے۔

ان کا اعتقاد تھا کہ شودر برہمنوں کی خدمت کے سوا کسی اور مقصد کے لیے پیدا ہی نہیں کیے گئے۔ ہندو مذہب میں انسانی طبقات کی چار قسمیں کی گئی ہیں۔ سب سے اعلیٰ طبقہ برہمنوں کا اور سب سے ادنیٰ طبقہ شودروں کا سمجھا جاتا تھا۔

ہندوؤں کے مذہبی قوانین کی رو سے شودروں کے لیے جو تعقیبی دفعات تھیں ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ برہمن کے لیے جائز ہے کہ وہ شودر کو اپنی خدمت پر مجبور کرے خواہ اس نے اس کو خریدا ہو یا نہ خریدا ہو۔

۲۔ شودر کا آقا اگر اس کو آزاد کردے تب بھی اس کو ہر وقت اختیار حاصل ہے کہ جو خدمت چاہے لے، کیونکہ غلامی اس کے وجود کا جزو لاینفک ہے جو آزاد کر دیے جانے پر بھی اس سے منفک نہیں ہو سکتی۔

۳۔ کسی شودر کے ہاتھ سے اگر کسی برہمن کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو اس کے لیے بجز قتل کے کوئی اور چارہ کار نہیں ہے۔

۴۔ کسی شودر کی زبان سے کسی برہمن کے لیے گالی کا کوئی کلمہ نکل جائے تو اس کی سزا یہ ہے کہ اس کی زبان پکڑ کر گدی سے باہر کھینچ لی جائے۔

۵۔ کوئی شودر کسی برہمن یا اس کے خاندان کو حقارت آمیز کلام سے خطاب کرے تو اس کی سزا یہ ہے کہ ایک خنجر جس کا طول دس انگل ہو سخت گرم کرانے کے بعد اس کے منہ میں رکھا جائے۔

۶۔ جو چیزیں برہمنوں کے واجبات سے متعلق ہیں ان میں سے کسی ایک کی نسبت اگر کسی شودر کی زبان سے کوئی کلمہ نصیحت ادا ہو تو بادشاہ پر فرض ہے کہ کھولتا ہوا تیل اس کے منہ اور کانوں میں ڈلوائے۔

۷۔ برہمن اگر کسی شودر کی چوری کرے تو اس کی سزا صرف یہ ہے کہ شودر کو مال کا تاوان دلا دیا جائے لیکن یہی جرم شودر سے کسی برہمن کے لیے صادر ہوتا تو اس کی سزا یہ تھی کہ شودر کو جلا دیا جاتا تھا۔

۸۔ کسی حاکم کو مارنے کی جسارت کسی شودر سے سرزد ہو جائے تو چاہیے کہ شودر کو زندہ بھی بھون لیا جائے لیکن کوئی برہمن اگر ایسی حرکت کر بیٹھے تو اس کو صرف تاوان خیانت دینا پڑے گا۔

پھر غلاموں میں کام کے اعتبار سے ایک تفریق یہ تھی کہ بعض غلام تو وہ تھے جو غلیظ اور گندے کاموں کے لیے وقف ہوتے تھے، مثلاً بول و براز کو صاف کرنا۔ گائے بیل کے لیے کٹی کرنا، اپنے آقا کو بحالت برہنگی کپڑے پہنانا اور نہلانا گھروں میں جھاڑو دینا، وغیرہ وغیرہ۔

غلاموں کو آزاد کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ آقا غلام کے کاندھوں سے ایک پانی بھرا برتن اتارتا اور اس سے پانی کے چند قطرے لے کر غلام پر چھڑک دیتا تھا اور پھر تین مرتبہ اس کو آزاد کرنے کے کلمات کہتا تھا۔

قدیم ہندو قانون کے مطابق والدین کو اس بات کا پورا حق تھا کہ وہ اپنے بچوں کو فروخت کر دیں یا بطور بخشش کسی کی غلامی میں دے دیں[۱]۔

اہل فارس

اہل فارس ان قوموں میں سے تھے جو غلاموں کی کثرت کو تمول کی نشانی اور ریاست و امارت کی علامت سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں غلام کو محض بدزبانی کے باعث کوئی شدید سزا نہ دی جاتی تھی، البتہ اگر وہ اپنی اس عادت کی اصلاح نہ کرتا اور بار بار اس سے اسی طرح کی حرکات صادر ہوتیں تو پھر اس کو قتل کر دیا جاتا۔

اہل چین

چین والے بھی اپنے مذہبی اور ملکی دستور کے مطابق غلام سے ہر طرح کا خاطر خواہ معاملہ کرنے میں مختار تھے لیکن چینیوں کے اخلاق و عادات دوسری قوموں کی بہ نسبت اچھے تھے۔ اسی لیے وہ غلاموں کے ساتھ زیادہ وحشیانہ معاملہ نہیں کرتے تھے۔ پہلی صدی عیسوی میں ان کے ہاں ایسے قوانین بنائے گئے تھے جن کی رو سے ہر شخص کو اپنے غلام کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔

یونان میں غلامی کا رواج

بقول مسٹر ڈبلو جے۔ وڈ ہاؤس یونان میں غلامی کا ظہور دو اسباب سے ہوا۔ ایک جنگ اور دوسری ضرورت۔

یونان میں غلامی کے وجود کا پتہ ہومر کے عہد میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس عہد کا غلام کوئی طاقت نہیں رکھتا تھا اور تعجب انگیز یہ بات ہے کہ اس باب میں یونان کے بڑے بڑے فلسفی بھی رائے عامہ کے تابع اور عوام کے ہم خیال وہم عقیدہ تھے۔ ارسطو جو حکماء یونان میں ایک مرتبہ خاص کا مالک ہے اکثر کہا کرتا تھا کہ "غلام ایک آلہ ہے مگر ذی روح اور ایک کھلونہ ہے مگر جاندار"۔

یونانیوں کے نزدیک انسانوں کی دو قسمیں ہیں: احرار اور غلام اور پھر غلام دو قسم کے تھے ایک وہ جن کے ملک پر زبردستی تسلط واستیلاء حاصل کر لیا گیا ہو دوسری قسم ان غلاموں کی تھی جن کو بازار سے خریدا گیا ہو پہلی قسم کے غلام محض نام کے غلام تھے، ورنہ ان کو زمینوں کے تابع سمجھا جاتا تھا۔ زمینوں کے ساتھ ان کی بھی خرید وفروخت ہوتی تھی۔ دوسری قسم کے غلام اپنے آقاؤں کے رحم وکرم پر زندگی گزارتے تھے۔ آقا جو چاہتا ان کے ساتھ معاملہ کر سکتا تھا۔ کوئی نہ تھا جو اس سے باز پرس کر سکتا۔

غلاموں کی تجارت

یونان میں اینتا نامی ایک بڑا بازار تھا جہاں غلاموں کی تجارت ہوتی تھی یہاں سے جو غلام خریدے جاتے تھے مالک ان سے اپنا ذاتی کام لیتا اور ان کو کرایہ پر بھی دے سکتا تھا۔

غلاموں کو سزائیں

یونان کے دستور ملکی کے مطابق کوئی اجنبی کسی کے غلام کو نہیں مار سکتا تھا لیکن آقا کو معمولی معمولی خطاؤں پر سخت سے سخت سزا دینے کا اختیار کلی حاصل تھا۔ صرف ایتھنز میں یہ قاعدہ تھا کہ غلام اپنے آقا کی غیر انسانی حرکت کے خلاف احتجاج کر کے کسی ایک "جائے پناہ" میں پناہ لے سکتا تھا۔

غلاموں کی عام سزا کوڑا تھی جس کی مقدار پچاس تک ہوتی تھی۔ دوسری قسم کی سزا حبس تھی، جس کی مختلف صورتیں اور شکلیں ہوتی تھیں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال دینا تو اس قدر عام تھا کہ مذہب و اخلاق کے انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار کے بقول اس کو سزا ہی نہ کہنا چاہیے۔ اس کے علاوہ داغنے کی سزا

کا بھی دستور تھا مگر یہ سزا خصوصاً ان غلاموں کو دی جاتی تھی جو اپنے آقا کے پاس سے فرار ہو گئے ہوں اور پھر گرفتار کر لیے گئے ہوں۔ چوتھی قسم کی سزا یہ تھی کہ غلام سے کانوں میں یا چکیوں پر بڑی ہی سخت محنت لی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات یہی محنت ان کی حسرت ناک موت کا سبب ہوتی تھی۔

غلاموں کو آزاد کرنے کے طریقے

یونان میں غلاموں کی آزادی کے تین طریقے تھے:

۱۔ یہ کہ ملک کی طرف سے مدافعت کرنے کے لیے حکومت کو غلاموں کی فوجی خدمات کی ضرورت ہوتی تو اس صورت میں حکومت بااختیار خود جتنے غلاموں کو چاہتی آزاد کر دیتی۔ آزاد ہونے کے بعد ان لوگوں کو فوج میں بڑے سے بڑا عہدہ دیا جا سکتا تھا۔

۲۔ آقا خود اپنی رضا و رغبت سے ازراہ کرم و عنایت غلام کو یونہی بغیر کسی معاوضہ کے آزاد کرے۔ یا اسلام میں عبد مکاتب کے ساتھ جو معاملہ کیا جاتا ہے وہ اختیار کرے۔ یعنی اپنے غلام سے کہے کہ تو اتنی رقم مجھ کو کما کر دے دے، اس کے بعد تو آزاد ہو جائے گا تو اس صورت میں حکم یہ تھا کہ اس مقررہ رقم کو ادا کرنے کے بعد ہی غلام آزاد سمجھا جاتا تھا۔

۳۔ آزادی کی تیسری صورت یہ تھی کہ آقا اپنے غلام کو کسی دیوتا کی خدمت کے لیے وقف کر دیتا تھا۔ پھر اس میں بھی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ آقا اس کے بدلے میں اپنے غلام سے یا بالفاظ دیگر دیوتا سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیتا تھا، بلکہ اس کی جانب سے ایک طرح کا نذرانہ تھا اور دوسری شکل یہ تھی کہ آقا غلام سے کہتا کہ اگر تو نے اتنی رقم مجھ کو ادا کر دی تو میں تجھ کو فلاں دیوتا کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گا۔ غلاموں کو اس صورت میں شخصی ملکیت سے نکل آنے کے باعث یک گونہ راحت ملتی تھی۔ اس لیے وہ بسا اوقات اس شرط کو منظور کر لیتے تھے۔ پھر جو رقم غلام ادا کرتا تھا اس کو سمجھا جاتا تھا کہ وہ درحقیقت دیوتا کی طرف سے ادا کی جا رہی ہے۔ یعنی دیوتا خریدار اور مالک بائع اور غلام مبیع ہوتا تھا۔ اس قسم کا معاملہ پیشوائے مذہبی کی موجودگی میں ہوتا، غلام کا باقاعدہ بیع نامہ لکھا جاتا اور وہ مالک کی ملکیت سے نکل کر دیوتا کی ملکیت میں داخل ہو جاتا۔

درحقیقت یہ صورت آزادی کی نہیں ہے لیکن چونکہ غلام اس معاملہ کے بعد مالک کی ملکیت سے نکل جاتا ہے اور ایک شخص کی بجائے ایک عبادت گاہ کا غلام ہو جاتا ہے جس میں اس کو صورت اول کے بالمقابل یک گونہ راحت و آرام ہے اس لیے اس صورت کو بھی آزادی کی صورتوں میں شمار کیا گیا ہے۔

آزاد کردہ غلام

روما کی تاریخ بنانے میں آزاد کردہ غلاموں کو بھی بڑا دخل ہے لیکن یونان میں جو غلام آزاد ہوتے تھے ان کو کوئی شہری حق مطلق نہیں ملتا تھا۔ آزاد ہونے کے بعد وہ اور چند در چند مصائب میں گرفتار ہو جاتے تھے۔ رہنے کے لیے ان کو کسی شخص کی سرپرستی حاصل کرنی ضروری تھی اور پھر ان غریبوں کو ایک بھاری ٹیکس بھی ادا کرنا پڑتا تھا اور یہ ٹیکس وہ تھا جو اجنبی باشندگان شہر سے وصول کیا جاتا تھا۔ پھر اس کے لیے خاص خاص قواعد تھے جن کی پابندی اس پر لازم تھی۔ اگر ان میں سے کبھی کسی ایک قاعدہ کی خلاف ورزی ہوتی تو بطور سزا اس کو دوبارہ غلام بنالیا جاسکتا تھا۔ اسمبلی کا کوئی غیر معمولی ووٹ ہی اس کو شہری حقوق دلا سکتا تھا۔[1]

مصر قدیم

دنیا کی قدیم تہذیبوں میں مصر کی تہذیب کو نمایاں امتیاز حاصل ہے لیکن آپ کو تعجب ہوگا کہ تہذیب و تمدن کے اس قدر عروج کے باوجود اہل مصر کے نزدیک غلام صرف خدمت گذاری اور چاکری کے لیے مخصوص سمجھا جاتا تھا۔ آقاؤں کو غلاموں پر ہر طرح کا تسلط و استیلا تھا، زندہ رکھیں یا قتل کردیں۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان سختیوں میں کمی پیدا ہوتی رہی لیکن پھر بھی سب سے بڑی رعایت جو ان کو دی گئی وہ یہ تھی کہ مصری حکومت کے اعلان کے مطابق یہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ جو شخص کسی غلام کو قتل کرے گا انتقام میں اس کو بھی قتل کردیا جائے گا۔

فینیقیوں میں غلامی کا رواج

سولہویں صدی قبل مسیح میں جبل لبنان اور سمندر کے درمیان کچھ لوگ رہتے تھے جو عرب اور یہود کے ساتھ ہم جنس تھے۔ یہ "اہل فینیقیہ" کہلاتے تھے۔ فینیقیہ کے دو شہر بہت مشہور تھے، پہلے صیدا اور اس کے بعد صور۔ ان لوگوں میں بھی غلام حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا یہ ہر جگہ غلاموں کی جستجو میں رہتے تھے، خصوصاً جوان لڑکیاں، لڑکے اور جنگی غلام فاتحوں سے خریدتے تھے۔ اکثر اوقات صیدا کے لوگ غلاموں اور باندیوں کے خریدنے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ آدمیوں کو چرالاتے اور زبردستی غلام بنالیتے تھے۔ ہیروڈوٹس ایک حکایت بیان کرتا ہے کہ ایک

روز فینیقی ارگوس (Argos) میں اترے جو اس زمانہ میں یونان کا بہترین شہر تھا اور اپنا سامان بھی کنارے پر اتارا۔ یونانی ان سے سامان خریدنے کے لیے وہیں آنے لگے۔ چند روز کے بعد جب ان کا سب مال فروخت ہو چکا تو وہاں کے بادشاہ کی لڑکی عورتوں کی ایک جماعت کے ساتھ فینیقیوں کے پاس آئی، ابھی یہ عورتیں خریدنے میں مصروف تھیں کہ اچانک بیچنے والوں نے ان پر حملہ کر دیا اور زبردستی انہیں پکڑ کر اپنی کشتیوں میں بٹھا کر چلتے ہوئے۔[29]

رومیوں میں غلامی کا رواج

غلامی کی تاریخ میں روما کی غلامی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ صرف اسی موضوع پر متعدد ارباب قلم نے قیمتی تصنیفات لکھی ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک لوگوں کو غلام بنانے کے مختلف طریقے تھے، جن قوموں پر فتح حاصل کرتے تھے انہیں اپنا غلام سمجھتے تھے اور جو بچے باندیوں کے بطن سے پیدا ہوتے تھے وہ بھی غلام ہی سمجھے جاتے تھے اس کے علاوہ رومانی قانون میں چند دفعات ایسی تھیں جن کی رو سے وہ جب چاہتے کسی حلال الاصل آدمی کی بھی آزادی کو سلب کر سکتے تھے۔ جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوتے تھے ان کو روما کے بازاروں میں بہت کم قیمت پر فروخت کر دیا جاتا تھا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو چرا لاتے اور غلام باندیاں بنا کر بیچ دیتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اخلاقی اعتبار سے روم کے لوگ بردہ فروشی کو بدترین کام سمجھتے تھے لیکن چونکہ اس میں نفع بہت تھا اس لیے اس کا رواج بھی بہت عام تھا۔

ان کا عام دستور تھا کہ جس غلام کو بیچنا ہوتا تھا اس کو پتھر کی ایک اونچی چٹان پر کھڑا کر دیتے تھے تاکہ ہر ایک گاہک اسے دیکھ سکے اور جس کو پسند ہو وہ خرید سکے۔

روما کی حکومت آٹھ سو برس تک رہی اور کہا جاتا ہے کہ یہ عہد قدیم کی سب سے بڑی مہذب اور متمدن حکومت تھی لیکن اس کے باوجود ان کے تمدنی اصول و قواعد میں غلاموں کے لیے کچھ حقوق نہیں تھے اور انسانی زندگی کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے کا انہیں کوئی حق نہ تھا۔ زندہ رکھنے اور قتل کرنے میں آقا مختار کل ہوتے تھے۔ کسی کو ان کے کسی فعل پر نکتہ چینی ہونے کا حق نہ تھا۔

غلاموں کو سزائیں

ان کے یہاں غلاموں کو سزا دینے کے بھی عجیب و غریب طریقے رائج تھے مثلاً کسی غلام سے کوئی ادنیٰ سا جرم صادر ہوا اور انہوں نے ایک بڑا بھاری پتھر اس کی کمر پر لاد دیا اور اس پر طرفہ

ستم یہ کہ غلام سے کہا جاتا کہ اسی حالت میں جا کر کھیتوں میں کاشت کا کام کرو۔ کبھی ان کو بطور سزا الٹا لٹکا دیا جاتا اور بڑی بڑی وزنی چیزیں ان کے جسم سے باندھ دی جاتیں اور کبھی ان کو اس بے دردی سے مارا جاتا کہ بیچارے پچھے پچھے ہستی سے ہی آزاد ہو جاتے تھے۔

مسٹر آر۔ ایچ۔ بارو نے خاص "رومن سلطنت میں غلامی" کے نام سے ایک ضخیم اور پراز معلومات کتاب لکھی ہے۔ اس میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ روما میں جو لوگ آباد تھے ان کی تعداد تو مورخین نے لکھی ہے لیکن غلاموں کی صحیح تعداد کسی نے نہیں بتائی۔ قیاس و تخمین سے جو تعداد بتائی جاتی ہے وہ مختلف ہے اور اس کے اعتبار سے غلاموں کی آبادی روم کی آبادی کی تقریباً ایک چوتھائی تھی[۲۰]۔

رومانی لشکر نقل و حرکت کرتا تھا تو اس کے جلو میں بردہ فروش بھی ہوتے تھے۔ ان کو جہاں کہیں موقع ملتا لڑکوں کو چرا کر اور عورتوں کو گرفتار کر کے لے آتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ رومن سلطنت کے اخیر دور میں غلاموں پر زیادہ سخت اور بہیمانہ مظالم ہونے بند ہو گئے تھے اور یہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ جو شخص کسی غلام کو قتل کرے گا اس سے غلام کے خون کا انتقام لیا جائے گا۔ لیکن اس قانون کے نفاذ سے قبل غلام کی حیثیت محض ایک جانور کی سی تھی جس کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ وہ ایک ایسا ذی روح ہے جس کو مملوک ہی ہونا چاہیے اس کے برخلاف آقاؤں کو غلاموں پر جو اختیارات حاصل تھے ان کا کوئی حدو حساب نہ تھا۔ سیاسی اور شہری معاملات میں غلاموں کو کوئی دخل نہ تھا، وہ نہ کسی پبلک اجتماع میں شریک ہو سکتا تھا اور نہ کوئی فوجی خدمت اس کے سپرد کی جا سکتی تھی۔ قانونی طور پر یہ غریب شادی کے بھی مجاز نہیں تھے[۲۱] اور وہ عدالت میں کسی کی طرف سے گواہی بھی نہیں دے سکتے تھے۔

روما کی تاریخ میں محمود و ایاز کے تعلقات کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سیسیرو (Cicero) اور اس کے غلام تیرو (Tiro) اور ایٹیکس (Atticus) اور اس کے غلام ایلیکسس (Alexis) کے درمیان بہت خوشگوار اور دوستانہ تعلقات تھے لیکن ڈبلیو جے وڈ ہاؤس (W.J. Wood house) کے قول کے مطابق اس طرح کی مثالیں شاذ و نادر ہی ہیں اور ان کو عام اجتماعی اور تمدنی زندگی کا آئینہ دار نہیں کہا جا سکتا۔

غلاموں کے ساتھ مراعات

روم کی غلامی کو تین ادوار پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ سب سے آخری دور میں غلاموں سے متعلق متعدد اصلاحی قوانین بنائے گئے اور بقول ایک یورپین مصنف کے سلطنت روما کا یہ اقدام رواج غلامی کے تدریجی انسداد کا پیش خیمہ تھا۔ ان قوانین مراعات و اصلاح میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ بچوں کو بیچنا اور قرض کے بدلے میں دے دینا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

۲۔ روم میں غلاموں کو سزا دینے کا ایک عجیب طریقہ تھا کہ وہ غلاموں کو درندوں سے لڑنے کے لیے بھیج دیتے تھے اور ان کا تماشا دیکھتے تھے۔ اس آخری دور غلامی میں اس کو بھی ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

۳۔ ہارڈین (Hardian) نے ایک آقا کے لیے یہ ناجائز قرار دیا کہ وہ مجسٹریٹ کی اجازت کے بغیر اپنے غلام کو قتل کرے[1]۔ اینٹونینس (Antoninus) کے سامنے ایک ایسا ہی مقدمہ پیش ہوا تو اس نے غلام مقتول کے آقا کو ایسا ہی ملزم قرار دیا جیسا کہ کسی دوسرے کے غلام کو قتل کرنے پر ملزم ٹھہرایا جاتا۔

اس نے یہ قانون بھی بنایا تھا کہ جس غلام کے ساتھ برا معاملہ کیا جائے گا وہ عبادت گاہ کے لیے وقف ہو جائے گا۔

روم میں ایک عام دستور یہ تھا کہ لوگ اپنی باندیوں سے پیشہ کراتے تھے لیکن حیرت کا مقام ہے کہ غلاموں سے متعلق جو اصلاحی قوانین بنائے گئے تھے ان میں کہیں باندیوں کی نسبت اس طرح کی کوئی اصلاحی چیز موجود نہیں تھی، البتہ حضرت مسیح کی وفات کے چار سو اٹھائیس برس بعد یہ قانون بنایا گیا تھا کہ جو کوئی شخص اپنی باندیوں سے کسب کرائے گا اس کو سزا دی جائے گی جسٹینین (Justinian) نے اس میں اور اضافہ کیا، باندی کی عصمت دری پر سزائے موت تجویز کی۔

انہی اصلاحات کا ایک جز یہ تھا کہ کانسٹینٹائن (Constantine) نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ غلاموں کی تقسیم میں میاں بیوی، بھائی اور بہن، باپ اور بیٹے میں تفریق نہ کی جائے۔ جسٹینین نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور یہ قانون بنا دیا کہ ذی رحم محرم میں سے اگر کوئی ایک آزاد کیا جائے گا تو اس کے دوسرے اعزا بھی آزاد ہو جائیں گے۔

غلاموں کی آزادی

روم میں غلام آزاد بھی ہوتے تھے لیکن اس کے لیے چند در چند قیتیں تھیں، پھر آزاد کرنے والوں کی نیت بھی بخیر نہیں ہوتی تھی۔ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"اصولی خود غرضی اور کمینگی کا ظہور شاید اس قدر بھیانک شکل میں کہیں نہیں ہوا ہوگا، جتنا کہ یہاں غلاموں کو آزاد کرنے میں ہوتا تھا۔ غلام کو آزاد کر کے آزاد کرنے والا اپنا کچھ کھوتا نہیں تھا

بلکہ کچھ اور زیادہ حاصل کر لیتا تھا۔ رومیوں میں آزاد کرنا شرافت اور نجابت کی دلیل کم اور "صنعتی دیکھ بھال" کی زیادہ تھی، آقا کو بسا اوقات یہ زیادہ سود مند معلوم ہوتا تھا کہ وہ آزاد کردہ غلام کی تجارت میں بحیثیت حصہ دار کے شریک ہو بہ نسبت اس کے کہ کچھ غلام کمائے وہ سب اسی کے نام اور اسی کی ذمہ داری کے ساتھ انجام پذیر ہو۔"

اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ روم میں لوگ غلام آزاد کرتے تھے تو ان کے اس عمل کا محرک کوئی اخلاقی نقطہ نظر نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی وجہ زیادہ تر اقتصادی ہوتی تھی۔ یہ سمجھتے تھے کہ غلام اگر بحالت غلامی کوئی کاروبار کرے گا تو اس میں اتنا فائدہ نہیں ہوگا جتنا کہ آزاد کرنے کے بعد اس کام کو کرنے میں ہو سکتا ہے۔

روم میں غلام کی آزادی دو قسم کی تھی، ایک باقاعدہ اور دوسری رسمی۔ پھر قسم اول کی تین قسمیں تھیں۔ ان سب کا حاصل یہ ہے کہ آزادی صرف زبان سے کہہ دینے سے ہی ثابت نہیں ہو جاتی تھی بلکہ آقا کو عدالت میں حاضر ہو کر کہنا پڑتا تھا کہ میں اپنے غلام کو آزاد کرنا چاہتا ہوں، اس پر مجسٹریٹ اس کا تحریری بیان لیتا تھا اور اپنے دستخط اس پر ثبت کر دیتا تھا، اس کے بعد شہر کے لوگوں کی فہرست میں اس کا نام درج کر لیا جاتا اور اس کی آزادی کا اعلان عام کر دیا جاتا تھا۔

اب وہ اپنے تجارتی کاروبار اور دوسرے معاملات میں بالکل آزاد ہوتا تھا اور آزادوں کی طرح شہری حقوق کا مالک بھی لیکن اپنے آقائے سابق اور اس کے گھرانے کے ساتھ اس کے تعلقات اب بھی نیم غلامانہ ہوتے تھے جن کے قائم رکھنے پر عرف اور قانون دونوں کی دفاعت کے پیش نظر وہ مجبور تھا۔

دو سو اٹھارہ بعد [illegible] کے [illegible] (Claudian) قانون کے مطابق جو لوگ لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر ہوتے تھے ان کو یا ان کی اولاد کو تجارت کرنے کا حق نہیں تھا۔ اس بنا پر ان لوگوں نے ترکیب یہ ایجاد کی تھی کہ غلاموں کو ایک خاص تجارتی معاہدہ کے بعد آزاد کر دیتے تھے اور اس طرح گویا خود تجارت کر کے قانون شکنی کے جرم کا ارتکاب کرتے تھے۔ روم کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ آزاد کردہ غلاموں کو ملک کی سوسائٹی میں اگرچہ کوئی وقعت حاصل نہیں تھی اور وہ مجلس حکومت میں بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے لیکن اس کے باوجود ان لوگوں نے زیادہ سے زیادہ دولت کمائی اور عرف عام میں دولت کا ہی دوسرا نام طاقت ہے۔ اس بناء پر انہوں نے اچھی خاصی قوت و طاقت بھی پیدا کر لی لیکن آگسٹس کے عہد تک ان کو پبلک زندگی میں نمایاں ہونے کا کوئی موقع نہ تھا۔

میونسپلٹی، ملک کی حکمران جماعت ان میں سے کسی ایک کے ممبر نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ان کو مجسٹریٹی کا مستحق سمجھا جاتا تھا [۳۳]۔

فرنگیوں میں غلامی کا رواج

فرنگی قبائل میں فرانسیسی لوگ غلاموں کے معاملہ میں سب سے زیادہ بے رحم، متشدد اور تند مزاج تھے۔ ان کے قانون میں اس کی صراحت تھی کہ اگر کوئی آزاد کسی باندی سے نکاح کر لے گا تو وہ بھی بیوی کی طرح غلام سمجھا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی حرہ کسی غلام سے نکاح کر لے گی تو خاوند کی طرح وہ بھی باندی بن جائے گی۔ ان میں سے بعض قبائل کی سختی کا عالم یہ تھا کہ وہ غلام سے نکاح کرنے والی شریف و آزاد عورت اور باندی سے شادی کرنے والے "مرد آزاد" کو زندہ ہی نہ چھوڑتے تھے، دونوں کو زندہ آگ میں ڈال دیتے تھے۔

یورپ میں رواج غلامی کا سبب

یورپ میں غلامی کے اس رواج کا سبب یہ تھا کہ روسی شروع شروع میں بحر اسود اور دریائے ڈینوب کے شمال میں فروکش ہوئے پھر آہستہ آہستہ وسط یورپ میں مغرب جنوب کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ اب ان کے لیے ناگزیر تھا کہ راہ میں جو قبائل واقع ہوں ان سے جنگ کریں۔ اس زمانہ میں عام قاعدہ تھا کہ جنگ کے اسیران بلا کو غلام بنا کر بیچ دیتے تھے۔ سوداگروں کی بڑی بڑی جماعتیں تھیں جو فرانس اور اسپین کی راہ سے قیدیوں کو افریقہ اور وہاں سے شام و مصر لے جاتے تھے۔

فرنگی سوداگر روسی اور جرمنی غلاموں کو فروخت کرنے کے لیے ڈینوب اور بحر اسود کے کناروں تک جاتے تھے اور بکریوں کے ریوڑ کی طرح انسانوں کے اس گلہ کو آگے آگے ہنکاتے چلتے تھے۔ اس کے علاوہ اہل جارجیا اور چرکس اپنی اولاد کو مال و متاع کی طرح بیچنے کے خوگر تھے [۳۴]۔

روس میں غلامی

بعض روسی کہتے ہیں کہ ابتداً روس میں غلامی کا وجود بالکل نہ تھا لیکن وہاں کی دیہاتی آبادی تین طبقوں پر مشتمل تھی۔ ایک غلام، دوسرے آزاد زراعتی مزدور اور تیسرے کسان۔ اٹھارویں صدی میں ان تینوں جماعتوں کو غلاموں کی ایک جماعت بنالیا گیا تھا۔ غلاموں کی طرح ان کو خریدا اور بیچا جاتا تھا اور ان کی فروخت کے لیے باقاعدہ اشتہار شائع ہوتے تھے۔ ۱۸۰۱ء کے ماسکو گزٹ میں ایک مرتبہ چند غلاموں اور باندیوں کا ایک اشتہار شائع ہوا تھا اور اس کی عبارت یہ تھی:

"برائے فروخت موجود ہیں...... تین کام کرنے والے مرد عمدہ تربیت یافتہ اور دو خوبصورت لڑکیاں جن میں سے ایک کی عمر اٹھارہ سال کی اور دوسری کی پندرہ سال کی ہے۔ یہ دونوں لڑکیاں خوش منظر اور خانہ داری کے مختلف کاموں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اسی گھر میں ان کے علاوہ دو اور بال بنانے والے غلام فروختگی کے لیے موجود ہیں، ایک کی عمر بیس سال کی ہے۔ لکھ پڑھ سکتا ہے اور آلات موسیقی پر گا سکتا ہے اور شکار میں بھی بڑی مدد دے سکتا ہے۔ دوسرا غلام عورتوں اور مردوں دونوں کے بال سنوار سکتا ہے اور اسی گھر میں پیانو و دیگر آلات غنا بھی بکنے کے لیے موجود ہیں۔"

الیگزنڈر اول (۱۸۰۱ء تا ۱۸۲۵ء) نے غلاموں کے متعلق اس طرح کے اشتہارات شائع کرنا ممنوع قرار دیا اور نکولس اول (Nicholas) نے تو اس رواج غلامی کا بالکل خاتمہ ہی کر دیا[۲۵]۔

موجودہ مغربی قومیں

موجودہ مغربی قوموں میں غلامی کا رواج انیسویں صدی کے نصف تک رہا اس کے بعد ان سب نے متفق ہو کر اس رواج کو باطل کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن جب تک رہا غلاموں پر طرح طرح کی سختیاں ہوتی تھیں۔ یہاں ایک قانون تھا جس کو ''سیاہ قانون'' کہتے تھے۔ ۱۶۸۵ء میں فرانس میں شائع کیا گیا۔ اس کی رو سے اگر کوئی حبشی کسی شریف آدمی پر دست درازی کرتا یا سرقہ کے گناہ کا ارتکاب کرتا تو اس کو قتل کی سزا دی جا سکتی تھی۔

بھاگ جانے کی سزا

فرار ہونے کی سزا یہ تھی کہ اگر اس نے اس حرکت ناشائستہ کا ارتکاب پہلی یا دوسری مرتبہ کیا ہے تو اس کے دونوں کان کاٹ ڈالنے چاہئیں اور ساتھ لوہا گرم کر کے اس کو داغنا چاہیے۔ اور اگر اس پر بھی باز نہ آئے اور تیسری بار پھر اس حرکت کا اعادہ کرے تو اس کو سپرد تیغ کر دینا چاہیے۔ اس قانون کے ماتحت انگلستان میں کثرت سے غلام قتل ہوتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ سختیوں سے گھبرا گھبرا کر بھاگ جاتے تھے اور جب گرفتار ہو کر آتے تھے تو قتل کر دیے جاتے تھے۔ فرانس میں یہ حالت ۱۸۴۸ء کے انقلاب تک رہی۔ اس سلسلہ میں جہاں اور اصلاحات ہوئیں غلامی کا رواج بھی بند ہو گیا[۲۶]۔

جنوبی امریکہ

جنوبی امریکہ میں غلام بنانے کا رواج انتہائی وحشیانہ اور جابرانہ تھا۔ ''سیاہ قانون'' کا مفاد یہ تھا کہ اگر کوئی شریف کسی باندی سے نکاح کر لے گا تو اس کو نو آبادیات میں کوئی عہدہ نہیں مل سکتا۔ ان کے قوانین میں اس امر کی تصریح تھی کہ آقا کو اپنے غلام پر ہر طرح کا اختیار حاصل ہو۔ یہاں تک کہ زندہ رکھنے اور مار ڈالنے کا بھی۔ مالک اپنے غلام کو رہن رکھ سکتا تھا۔ اجرت پر دے سکتا تھا اور اس پر قمار کھیل سکتا تھا۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ غلام شہر کی سڑکوں پر بغیر سرکاری اجازت نامے کے نہیں چل سکتا' اور اس پر طرفہ یہ کہ کسی سڑک پر کہیں سات غلام اکھٹے نظر آ جاتے تو ہر شخص کو اختیار حاصل تھا کہ انہیں قید کرا دے خواہ اس کے پاس سرکاری اجازت ہو یا نہ ہو۔ صرف سفید فام ہونا ہر طرح کی سختی کا عذر تھا۔ غلاموں کی نسبت ان لوگوں کی ''کتاب اخلاق'' کا سرعنوان یہ جملہ تھا کہ ''غلام ایک جسم ہے بے روح بے عقل اور اس کی زندگی ہمارے ہاتھ میں ہے''۔

۱۷۱۲ء اور ۱۷۴۱ء میں نیو یارک میں غلاموں نے انتہائی سختیوں سے تنگ آ کر بغاوت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو غلام گرفتار ہو کر آتے تھے یا تو گاڑیوں کے پہیوں کے نیچے دبوا دیے جاتے یا زندہ در آتش کر دیے جاتے تھے۔

نئے زمانے میں غلامی کی رسم

غلامی کی رسم اور غلاموں کی تجارت کے باعث یورپین ممالک میں کیسی کیسی قیامت سامانیاں ہوتی تھیں اس کی داستان کا ایک باب آپ پڑھ چکے ہیں یہ ناتمام رہے گا اگر آپ ذیل میں ایک مقالہ کا اقتباس نہ پڑھیں گے جو انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس کے فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے' وہ لکھتا ہے:

۱۴۴۲ء میں گونزلس (Gonzales) نے دس غلام پرتگال کے شاہزادہ ہنری کو بطور تحفہ پیش کیے۔ ۱۴۴۳ء میں نیونز ٹریستٹن (Nunez Tristan) افریقہ کے لیے ایک مہم پر بحری راستے سے روانہ ہوا اور چودہ غلاموں کو لے کر واپس آیا۔ افریقہ کے لوگ فطرتاً ان حملوں کو ناپسند کرتے تھے جو ان کو غلام بنانے کی غرض سے کیے جاتے تھے۔ یورپین تاجر اپنے حملوں کے

عذر پیدا کرنے کے لیے اہل افریقہ میں آپس میں جنگ کرا دیتے تھے۔ ۱۵۶۲ء میں سر جان ہاکنگ گونیا کے لیے روانہ ہوا اور تین سو غلام حاصل کیے۔ پھر ان کو فروخت کر کے انگلینڈ چلا آیا۔ فرانسیسی، اسپینی اور ڈچ ان سب کے ہاں غلاموں کی تجارت کا سلسلہ برابر جاری رہا لیکن انگریزوں کے ہاں اس کا سراغ چارلس (Charles) کے اس فرمان تک نہیں ملتا جو اس نے ۱۶۳۱ء میں افریقہ کمپنی کے نام مضمون لکھا تھا کہ وہ برطانوی علاقوں کے لیے افریقی غلام مہیا کرے۔ ۱۶۴۰ء میں تیرھویں لوئس نے ایک فرمان اس مضمون کا شائع کیا کہ تمام وہ افریقی جو فرانس کی نوآبادیات میں سکونت رکھتے ہیں غلام بنائے جا سکتے ہیں۔ ۱۶۵۵ء میں کرومویل نے جمیکا کو اسپین والوں سے چھینا تو دیکھا کہ وہاں پندرہ سو سفید فام اور اتنے ہی نیگرو غلام موجود ہیں اور خود وہاں کے رہنے والوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ ۱۶۶۲ء میں تیسری افریقہ کمپنی قائم ہوئی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی مغرب کی ہندوستانی نوآبادیات میں تین ہزار غلام سالانہ مہیا کیے جائیں۔ ۱۶۷۹ء اور ۱۶۸۹ء کے درمیان دس برس کی مدت میں کم و بیش ساڑھے چار ہزار غلام ہر سال نوآبادیات میں آباد کیے جاتے رہے۔ فرانسس کرو نے ۷ مارچ ۱۶۸۷ء کو ان غریبوں کی سرگزشت لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ "اس جگہ کی سب سے بڑی تجارت ان غلاموں کی ہے جن کو یہاں لایا جاتا ہے۔ یہ لوگ یہاں بالکل مادر زاد برہنگی کے ساتھ آتے ہیں اور ان کے گاہک ان کا منہ کھول کھول کر دیکھتے ہیں اور ان کا امتحان گھوڑوں اور چوپایوں کی طرح کرتے ہیں۔ ۱۷۱۳ء میں انگریزوں اور اسپینیوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے انگلینڈ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ اسپین والوں کو تیس سال تک برابر چار ہزار آٹھ سو غلام سالانہ مہیا کرتا رہے گا۔ غلاموں کی تجارت سے جو نفع حاصل ہوتا تھا انگلینڈ اور اسپین دونوں کے بادشاہ اس میں ایک حصہ کے شریک تھے۔ افریقہ کے غلاموں کی تجارت کا سلسلہ برابر جاری رہا یہاں تک کہ ۱۷۸۸ء میں جب غلامی کے انسداد کے لیے پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا گیا تو اندازہ کیا جاتا ہے اس وقت افریقہ سے ہر سال دو لاکھ غلام لائے جاتے تھے۔ جن میں ایک لاکھ امریکہ وغیرہ اور بقیہ افریقہ کے مشرقی ساحلوں سے ایران اور کچھ تھوڑے سے وسط افریقہ سے ترکی اور مصر لیجائے جاتے تھے"۔

غلامی کے لیے اصلاحی کوششیں اور اس کا انسداد

غلامی کی یہ شرمناک اور خونچکاں داستان آپ نے سن لی۔ اس سے معلوم ہوگا کہ غلامی کا رواج دنیا کی قدیم و جدید ہر قوم اور ہر ملک میں پایا جاتا تھا اور کس قدر بھیانک شکل و صورت کے

ساتھ۔ یہ رواج گویا ایک دیوجان شکار وفطرت خون آشام تھا جو اپنا دہن حرص وآز کھولے ہوئے ہر جگہ موجود تھا جسے انسانی تہذیب و شرافت کے خون کو قطرہ قطرہ کر کے چوسنے میں شہد وانگبین کا مزہ ملتا تھا۔ یہاں تک وہ قومیں جو آج تہذیب وتمدن کے آسمان پر آفتاب وماہتاب بن کر چمک رہی ہیں۔ اور جنھوں نے اجتماعی وعمرانی اصول وقوانین کی تہذیب وتربیت کر کے ازمنۂ قدیمہ کی ترقی یافتہ قوموں کے نقوش ہائے عظمت وبزرگی کو ان کے پسماندہ ماتم گزاروں کے الواح یادو ذکر سے مٹانا چاہا ہے وہ خود بھی اس لعنت میں گرفتار تھیں۔ اور ان کے جیب ودامن کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو اس نجاست وگندگی سے بچا ہوا ہو۔ غلام ان کے یہاں ایک جانور تھا۔ عیش وعشرت کا سامان فخر وغرور کی پونجی، اور راحت وآرام کا سرمایہ جس طرح انسان جانوروں کا گوشت کھاتا ہے اور نہیں پسیجتا ہے اپنے کام ودہن کی تواضع کے لیے ان کو ذبح کرتا ہے اور شرمندہ نہیں ہوتا، بلکہ سمجھتا ہے اس نے کوئی ظلم نہیں کیا۔ یہ سب اسی لیے تھے کہ اس کو لذت پہنچائیں اور اس کے لیے لطف ومسرت کا سامان بنیں ٹھیک اسی طرح پر رقص بسمل کا تماشا دیکھنے والی قومیں غلاموں کو سمجھتی تھیں اور اس کے ساتھ معاملہ کرتی تھیں لیکن انسانی فطرت میں انفعال وتاثر لازما رکھا گیا ہے۔ ایک انسان خواہ کتنا بڑا ہی سنگدل، بے رحم اور ظالم ہو۔ اپنی ظالمانہ زندگی کے دردناک واقعات کو یاد کر کے کبھی اس کی زبان سے بھی ایک آدھ کلمہ حسرت وافسوس نکل جاتا ہے۔ مظلوم وبے بس غلاموں کی آہیں بالآخر کارگر ہوئیں اور انسانی حرص استعماریت واستبداد کے ان بے گناہ شکاروں کی چیخ وپکار اثر دکھائے بغیر نہ رہی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے وسط میں غلامی کے انسداد اور اس کے لیے اصلاحی کوششوں کی آئینی تحریک کا آغاز ہوا اور انجام کار فرانسیسی نوآبادیات میں ۱۸۴۵ء میں غلامی سے متعلق بعض مفید اصلاحات ہوئیں اور ۱۸۵۸ء میں اس کا بالکل ہی خاتمہ کر دیا گیا۔ پھر دوسری جگہوں پر اس کی تقلید کی گئی۔ اور ۱۸۶۳ء میں ڈچ کے مغربی جزائر سے اور ۱۸۸۶ء میں کیوبا سے اور ۱۸۸۸ء میں برازیل سے اور ۱۸۹۷ء میں زنجبار سے غلامی کو قطعی طور پر ختم کر دیا گیا لیکن انیسویں صدی کے آخر تک بحر جنوب کے جزیروں میں کوئنز لینڈ کے حملہ آور آتے رہے اور لوگوں کو غلام بناتے رہے۔ پھر ۱۸۸۴ء میں یہاں بھی غلامی کا استیصال کر دیا گیا۔

غلامی اب بھی موجود ہے

غلامی کے انسداد کے لیے دول یورپ نے جو مستحسن اقدام کیا ہے بہر حال لائق ستائش اور قابل تعریف ہے لیکن اس کی بنیاد اقتصادی وجوہ پر زیادہ ہے بہ نسبت اخلاقی وجوہ واسباب کے

(اس کی تفصیل آگے معلوم ہوگی)۔ اس لیے سخت افسوس ہے کہ ان غلاموں کی تعداد اب بھی پانچ ملین ہے جو دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ۱۲ اپریل ۱۹۳۸ء کے اخبار نیشنل کال میں ایک خبر چھپی تھی جس کا خلاصہ یہ درج ذیل ہے:

جنیوا میں جمعیت اقوام کی مشورہ کمیٹی جو چند ممبران پر مشتمل ہے اور جو غلامی کے مسئلہ پر غور وخوض کرنے کے لیے مقرر کی گئی ہے اس نے ۳۱ مارچ سے ۱۲ اپریل ۳۸ء تک برابر اپنے اجلاس کیے۔ ۱۹۳۰ء میں لیگ اسمبلی میں لارڈ سیسل نے برطانوی حکومت کی نمائندگی کرتے ہوئے فرمایا کہ "دنیا میں اب بھی کم از کم پانچ ملین یعنی پچاس لاکھ غلام موجود ہیں۔ یہ سب اس کے باوجود ہے کہ ۱۹۲۶ء میں جمعیت اقوام کی مجلس نے اعلان کیا تھا کہ دستخط کرنے والی حکومتیں جن کی تعداد ۲۸ تھی اپنے اپنے علاقوں میں غلاموں کی تجارت کو تشدد آمیز حکمت عملی سے کام لے کر بالکل ختم کر دیں گی۔ ان حکومتوں میں امریکہ کی ریاست ہائے متحدہ بھی شامل تھیں۔ اس مشورہ کمیٹی کے تقرر سے یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ غلام حاصل کرنے کے لیے جو باقاعدہ اور منظم حملے ہوتے تھے وہ رک گئے"۔

غلامی کا ذکر قرآن مجید میں

اُمم قدیمہ میں غلامی کا جو رواج پایا جاتا تھا اس کی تاریخ زیادہ طویل ہو گئی لیکن ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ اس کے بغیر آپ غلاموں کی نسبت اسلامی مراعات و تعلیمات کی اہمیت کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اب جبکہ آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ کہ غلامی دنیا کی ہر قوم میں پائی جاتی تھی اور کس کس شکل و صورت کے ساتھ کہاں کہاں غلاموں کے حقوق کیا تھے۔ ان کے ساتھ معاملہ کیا کیا جاتا تھا' اور پھر یہ بھی دیکھ لیا کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کی وجہ سے جب ان قوموں نے غلاموں کے متعلق اصلاحی کوششیں شروع کیں جو اس سلسلے میں کہاں تک جا سکیں اور یہ اصلاحات کتنے دنوں میں ظہور پذیر ہوئیں' تو اب وقت آ گیا ہے کہ کتاب کے اصل موضوع بحث سے متعلق کچھ کہا جائے۔

کیا غلام بنانے کا ذکر قرآن میں ہے؟

اسلام کا سب سے بڑا مستند اور جامع دستور العمل قرآن مجید ہے۔ اس لیے ہم کو سب سے پہلے اسی میں تلاش کرنا چاہیے کہ "استرقاق" یعنی غلام بنانے کے جواز کا کہیں ذکر موجود ہے یا نہیں۔ غور کرنے اور جستجوئے عمیق سے کام لینے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تمام قرآن میں کہیں غلام بنانے کا ذکر نہیں ہے۔ متعدد مواقع پر باندیوں اور غلاموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور ان کے آزاد کرنے کا حکم بھی کئی ایک جگہ پر ہے غلام ان لوگوں کو بنایا جاتا ہے جو جنگ میں گرفتار ہوں۔ قرآن مجید میں "اسیران حرب" کا ذکر بھی کئی مقام پر آیا ہے اور ان کی نسبت بعض احکامات بھی بتائے گئے ہیں لیکن ان سب میں کہیں کسی موقع پر کسی عنوان کے اور کسی ادائے بیان کے ساتھ غلام بنانے کا ذکر صراحتاً نہیں ہے۔

جنگ کے اکثر و بیشتر احکامات سورۂ انفال میں مذکور ہیں لیکن گرفتاران جنگ کی نسبت ایک موقع پر صرف یہ ارشاد ہوتا ہے:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ. (سورہ انفال)

ترجمہ: نبی کو نہیں چاہیے کہ اپنے ہاں رکھے قیدیوں کو جب تک خوب خونریزی نہ کر لے[47]۔ (سورہ الانفال)

بدر کا واقعہ

عام ارباب تفسیر لکھتے ہیں کہ یہ آیت واقعۂ بدر سے متعلق ہے اور اس کی شان نزول یہ ہے کہ بدر میں جو کافر مسلمانوں کے ہاتھ آئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نسبت اپنے اصحاب سے مشورہ کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ان سب کو قتل کر دینا چاہیے کیونکہ یہ سب اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ ان کو معاف کر دینا چاہیے کہ آپ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) بڑے مہربان اور کریم النفس ہیں۔ کسی نے فرط غیظ و غضب سے صلاح دی کہ ان کو جلا ڈالنا چاہیے لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کے مشورے پر ہی عمل فرمایا اور اسیران بدر میں سے بعض کو معاوضہ لے کر اور بعض کو بغیر معاوضے کے ہی رہا کر دیا۔ آپ نے اس وقت اسیران جنگ سے جو معاملہ کیا ہر چند کہ وہ آپ کی طبعی نرمی و رافت، اور ذاتی حلم و عفو پر مبنی تھا لیکن عام ملکی اور سیاسی حالات اس فیصلہ کا اقتضاء نہ کرتے تھے۔ اس لیے آیات بالا کے ذریعے یک گونہ عتاب کا اظہار فرمایا گیا[۳۸] جس کا منشاء یہ ہے کہ جب تک نبی کو زمین پر غلبہ حاصل نہ ہو جائے اس کو یہ مناسب نہیں کو وہ اپنے پاس قیدیوں کو زندہ رکھے۔

اس آیت سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ غلبہ حاصل ہونے تک مسلمانوں کو فدیہ لے کر یا بغیر فدیہ اسیران جنگ کو رہا کرنے کے قصہ میں نہیں پڑنا چاہیے۔ بلکہ قتل و قتال اور جنگ و جدل کو جاری برابر رکھنا چاہیے۔ اب رہا یہ سوال کہ اچھا اگر مسلمان معرکہ جنگ میں فتح یاب ہو جائیں تو اس وقت قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کریں؟ ظاہر ہے کہ یہ آیت اس سوال کے جواب سے بالکل خاموش ہے۔

اسی سورۃ میں ذرا اور آگے چل کر فرمایا گیا ہے:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَى إِنْ يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِمَّا أُخِذَ مِنْكُمْ.

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے قبضے میں جو قیدی ہیں ان سے کہہ دیجیے کہ اگر اللہ نے تم میں بھلائی معلوم کی تو وہ تم کو اس سے بہتر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے۔

یہ آیت بھی بدر کے اسیران جنگ کے متعلق ہے اور "مَا اُخِذَ مِنْکُمْ" سے مراد فدیہ ہے[۳۹]۔
اس آیت سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ جنگ کے گرفتار لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔

سورہ محمد کی آیت

البتہ سورۂ محمد میں ایک آیت ہے جس سے صاف طور پر اس سوال کا جواب دستیاب ہوتا ہے اور وہ یہ ہے:

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا.

سو جب تم مقابل ہو منکروں کے تو مارو گردنیں، یہاں تک کہ جب خوب قتل کر چکو تو مضبوط باندھ لو قید، پھر یا احسان کی جیو یا معاوضہ لیجیو جب تک کہ رکھ دے لڑائی اپنے ہتھیار[1]۔

اس آیت کا مطلب ظاہراً یہ ہے کہ اسیروں کے ساتھ صرف دو قسم کا ہی معاملہ ہو سکتا ہے۔ ان کو فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے یا اس کے بغیر ہی ان کو رہا کر دیا جائے۔

آیت من و فدا سے متعلق بحث

لیکن حیرت کا مقام یہ ہے کہ اس آیت کے متعلق مفسرین بہت مختلف ہیں۔ ایک گروہ تو اس بات کا قائل ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور سورہ براۃ کی وہ آیت جس میں مشرکین کے قتل عام کا حکم دیا گیا ہے، اس کے لیے ناسخ ہے[1]۔ سدی ابن جریج اور قتادہ ان سب کی رائے یہی ہے[2]۔

لیکن اکثر علماء کا خیال یہی ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ قطعی اور ثابت ہے اور اس میں جو حکم دیا گیا ہے وہ اس موقع کے لیے ہے جبکہ مسلمانوں کو فتح تام حاصل ہو جائے اور اپنے دشمنوں کی جانب سے بالکل محفوظ اور مامون ہو جائیں۔ چنانچہ آیت کا ابتدائی حصہ "حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ" اس پر دلالت کر رہا ہے۔ رہی سورۂ برأت کی وہ آیت جس میں مشرکوں کے متعلق حکم دیا گیا ہے کہ جہاں کہیں ملیں قتل کر دیے جائیں اس وقت کے لیے ہے جبکہ جنگ ہو رہی ہو اور مسلمانوں کی طرف سے اطمینان کلی حاصل نہ ہوا ہو۔

جنگ اور اس کے احکام کے سلسلہ کی جتنی آیات ہیں ان سب پر ایک مجموعی نظر ڈالنے سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی آیت کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہے بلکہ دوران جنگ میں اور اس کے بعد مختلف قسم کے حالات پیش آتے ہیں اور سیاسی تدبر کا اقتضاء ہوتا ہے کہ ہر موقع پر وہی کاروائی کی جائے جو وہاں کے مناسب اور لائق ہو۔ جو مفسرین من و فدا کی آیت کو منسوخ قرار دیتے ہیں انہوں

نے در حقیقت تصویر کے صرف ایک ہی رخ کو دیکھا ہے اور ان کا خیال ہے کہ یہ آیت جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض قیدیوں کو معاوضہ لے کر اور بعض کو بغیر معاوضہ ہی رہا کر دیا تھا لیکن حق یہی ہے کہ اس آیت کے منسوخ ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے اسیران جنگ سے متعلق سورہ محمد میں صراحۃً اور سورہ انفال میں اشارۃً جو حکم بیان کیا گیا ہے اس کو پیش نظر رکھو اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد صحابہؓ کے تعامل پر غور کرو تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے پر بالکل منطبق ہیں اور ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت میں امام کو اختیار دیا گیا ہے کہ حسب مصلحت وموقعہ قیدیوں کے ساتھ جو معاملہ مناسب ہو وہ اختیار کرے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں ثمامہ بن آثال کا واقعہ نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

فکان فی ذلک تقویۃ لقول الجمہور ان الامر فی اسری الکفرۃ من الرجال الی الامام

ثمامہ کے واقعہ سے جمہور کے اس قول کو قوت پہنچتی ہے کہ کفار کے مرد قیدیوں سے متعلق امام کو اختیار ہے۔

یفعل ماھوالا حظ للاسلام والمسلمین [۲۳]

کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے جو معاملہ زیادہ بہتر کرے۔

پھر سورہ انفال کی آیات مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ الآیۃ کی تفسیر کے ماتحت اسیران جنگ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف معاملوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

فدلّ کلّ ذلک علی ترجیح قول الجمہور انّ ذلک راجعٌ الی رای الامام ومحصل الاقوالھم تخییر الامام بعد الاسربین ضرب الجزیتہ لمن شرع اخذھامنہ او القتل او الاسترقاق او المن بلاعوض اور بعوض [۲۴]

پس یہ سب قول جمہور کے قابل ترجیح ہونے پر دلالت کرتا ہے کہ قیدیوں کے ساتھ معاملہ کرنا امام کی رائے پر محمول ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ گرفتار کرنے کے بعد امام کو اختیار ہے کہ ان لوگوں پر جزیہ مقرر کرے جن سے جزیہ کا لینا مشروع ہے یا قتل کرے یا غلام بنائے اور یا عوض لے کر یا بغیر معاوضہ ہی ان کی جان بخشی کر دے

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ نے اپنے نبی اور مومن کو اختیار دیا ہے کہ وہ چاہیں تو جنگ کے گرفتار شدہ لوگوں کو قتل کر دیں۔ چاہیں تو غلام بنالیں اور اگر مناسب ہو تو ان کو فدیہ لے کر آزاد کریں [۲۵]۔

عام کتابوں میں لکھتے ہیں کہ حنفیہ آیت من وفداء کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں لیکن اجلہ احناف کی تصنیفات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی طرف یہ قول منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ علامہ محمود آلوسی صاحب روح المعانی جو پکے حنفی ہیں فرماتے ہیں:

''قیدیوں کی نسبت اختلاف ہے اکثر علماء کا خیال ہے کہ امام کو اختیار ہے اگر چاہے تو قتل کر دے، بشرطیکہ اسلام نہ لائے ہوں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ بن ابی معیط، طعیمہ بن عدی اور نضر بن حارث (جس کے متعلق اس کی بہن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے چند دلدوز اشعار پڑھے تھے اور ان میں ایک شعر یہ تھا:

ما کان ضرک لو مننت وربما

من الفتی وھو المغیظ المحنق

ان تینوں کو قتل کیا تھا کیونکہ اس صورت میں ان کے شر وفساد کا قلع قمع کر دیتا ہے۔ اور اگر منشاء ہو تو ان کا غلام بنا لے اور اگر مناسب ہو تو ذمی کر لے۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ نے اہل سواد کے ساتھ کیا تھا[46]۔

بدائع الصنائع میں صاف طور پر مذکور ہے۔

واما الرقاب فالامام فیھا بین خیارات ثلاث[47]۔

رہے اسیران جنگ تو امام کو ان کے ساتھ تین طرح کا معاملہ کرنے کا اختیار ہے۔

یہ کہنا آیت من وفدا منسوخ ہے اور اس بنا پر سورۂ براُت کی آیت کے بحکم اسیران جنگ کے لیے صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ اسلام لائیں یا قتل کر دیے جائے، قرآن مجید کی دو مختلف آیتوں میں تطبیق پیدا نہ کر سکنے پر مبنی ہے، ورنہ اگر ذرا تعامل سے کام لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ان آیات میں باہمی کوئی تعارض ہے ہی نہیں بلکہ دونوں کا مصداق الگ الگ ہے۔

علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں:

''سورۂ براۃ میں جو کچھ ہے وہ ان لوگوں کے متعلق ہے جو گرفتار نہ ہوئے ہوں کیونکہ گرفتار شدہ لوگوں کو غلام بنانا بھی جائز ہے، اور سورہ براۃ کی اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بجز قتل کرنے کے کوئی اور چارہ ہی نہیں ہے اور رہا استرقاق کے جواز کا حکم تو وہ بھی علی الاطلاق نہیں کیونکہ معلوم ہے کہ مشرکین عرب کا استرقاق جائز نہیں[48]۔

اسی آیت کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک اور مقولہ ہے کہ جب مسلمان بہت ہو گئے اور ان کی طاقت بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے قیدیوں کے متعلق یہ حکم نازل کیا کہ "فَاِمَّا مَنًّا بَعۡدُ وَاِمَّا فِدَآءً" حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کو صاحب معالم التنزیل نے "اصح" اور صاحب خازن نے "وھو الصحیح" کہا ہے۔

سورہ انفال کی آیت "حَتّٰی یُثۡخِنَ فِی الۡاَرۡضِ" کے ختم پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ۔

قاضی بیضاوی "حکیم" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یعلم ما یلیق بکل حال ویخصصہ بھا کما امر بالاثخان ومنع عن الافتداء حین کانت الشوکۃ للمشرکین وخیر بینہ وبین المن لما تحولت الحال وصارت الغلبۃ للمومنین۔ (تفسیر بیضاوی ص ۱۸۶ مطبوعہ مصر)

اللہ تعالیٰ اس چیز کو جانتا ہے جو کسی حال کے لائق ہوتی ہے اور اس چیز کو اس حال کے ساتھ مختص کر دیتا ہے، جیسا کہ جب مشرکوں کو شوکت حاصل تھی تو اس نے زمین پر غلبہ پانے کا حکم دیا اور فدیہ قبول کرنے سے منع کیا پھر جب حال بدل گیا اور غلبہ مومنین کو حاصل ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے قتل اور جان بخشی دونوں کے درمیان اختیار دیا۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک ولد الزنا کو آزاد کیا اور فرمایا کہ خدا نے تو ہم کو ان لوگوں پر بھی احسان کرنے کا حکم فرمایا ہے جو ان سے زیادہ شرانگیز اور فسادی ہیں اور پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: فَاِمَّا مَنًّا بَعۡدُ وَاِمَّا فِدَآءً [۲۹]۔

اسی طرح کا ایک اور واقع ابن جریر اور ابن مردویہ نے بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ فلاں قیدی کو قتل کر دو۔ آپ نے فرمایا "اللہ نے ہم کو اس کی اجازت نہیں دی ہے۔ اسیران جنگ کے متعلق ہم کو صرف یہ بتایا گیا ہے کہ ان کو چاہیں تو بطریق احسان چھوڑ دیں اور یا فدیہ لے کر انہیں رہا کر دیں" اس کے بعد آپ نے وہی آیت من وفداء تلاوت کی۔

فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شہر میں داخل ہوئے تو فوج میں اعلان عام کرا دیا:

لا تجھزن علی جریح ولا یتبعن مدبر ولا یقتلن اسیر ومن اغلق بابہ فھو امن۔

کسی زخمی پر حملہ نہ کرو، کسی بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے، کسی اسیر کو قتل نہ کیا جائے اور جس نے اپنا دروازہ بند کر لیا وہ مامون ہے۔

اب بتاؤ اگر بد قسمت قیدی کے لیے من وفداء کی صورت اور اس کے لیے اسلام یا قتل کے سوا کوئی اور راہ ہے ہی نہیں تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان اور حضرت ابن عمرؓ کے اس فعل کی کیا توجیہ کی جائے گی۔ حافظ ابو بکر جصاص الحنفی نے ان مختلف آیات کی تطبیق کرتے ہوئے لکھا ہے:

اما قوله فاذا لقيتم الذين كفروا فضرب الرقاب وقوله ما كان لنبي ان يكون له اسرىٰ حتىٰ يُثْخِنَ في الارضِ وقوله، فامّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ خَلْفَهُمْ فانه، جائزان يكون حكمًا ثابتًا غير منسوخٍ وذلك لان الله تعالىٰ امر نبيه صلى الله عليه وسلم بالاثخان بالقتل وحظر عليه الاسر الاّ بعد اذلال المشركين وقمعهم واكان ذلك في قلة عدد المسلمين وكثرة عدد عدوهم من المشركين فمتىٰ اُثخِنَ المشركون واذلوا بالقتل والتشريد جاز الاستبقاءِ فالواجب ان يكون هذا حكمًا ثابتًا اِذاوُجد مثل الحال التي كان عليها المسلمون في اول الاسلام۔

اللہ تعالیٰ کا قول کہ جب تم کفار سے لڑو تو ان کی گردنیں مارو اور اس کا کہ نبی کو نہ چاہیے کہ اپنے پاس قیدی رکھے یہاں تک کہ وہ زمین پر غلبہ حاصل کرلے اور اس کا قول کہ اگر کبھی تو پائے ان کو لڑائی میں تو ان کو ایسی سزا دے کہ ان کے پچھلے بھاگ جائیں ان کو دیکھ کر تو جائز ہے کہ یہ حکم ثابت اور غیر منسوخ ہو اور وہ اس طرح پر کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا ہے کہ خوب زمین پر غلبہ حاصل کرو اور مشرکین کو ذلیل کرو اور یہ حکم مسلمانوں کی قلت اور مشرکوں کے ساز و سامان اور ان کے آدمیوں کی کثرت کے وقت تھا پھر جب مشرکین مغلوب ہو گئے اور قتل و قتال سے ذلیل ہو گئے تو اب ان کا زندہ چھوڑ دینا جائز ہو گیا۔ پس واجب ہے کہ یہ حکم ثابت ہو جبکہ مسلمانوں کے لیے وہی حال پایا جائے جو اول اسلام میں تھا۔ (احکام القرآن جلد ۳ ص ۳۸۱)

الغرض سورۃ انفال، سورۃ براءۃ اور سورۃ محمد ان تینوں سورتوں کی آیات ایک دوسرے سے متعارض نہیں ہیں کہ کسی ایک کو دوسرے کے لیے ناسخ کہا جائے بلکہ ان میں سے ہر ایک کا محمل جدا جدا ہے اور ان میں جنگ سے قبل اور جنگ کے درمیان اور جنگ کے اختتام کے مختلف احوال و قواعد بیان کیے گئے ہیں۔ ان سب کو کسی ایک ہی وقت کے احکام سمجھنا اور پھر خواہ مخواہ تعارض مان

کر نسخ کا قائل ہونا قرآن مجید کے تنوع احکام کے خلاف ہے۔ جو اس جیسی ہمہ گیر کتاب الٰہی کے لیے از حد ضروری ہے۔

سورہ انفال کی آیت کا منشاء یہ ہے کہ جب تک مسلمانوں کو جنگ میں مکمل غلبہ حاصل نہ ہو جائے ان کو کسی منفعت دنیوی کے خیال سے قتل وقتال سے باز نہ رہنا چاہیے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمان کو امن کے وقت پیکر امن وامان ہونا چاہیے لیکن اگر مغرور سرکش دشمنوں کے ساتھ جنگ ناگزیر ہو جائے تو پھر اس کو اس وقت تک دم نہ لینا چاہیے جب تک شر وفساد کا استیصال کلی نہ ہو جائے اور جب تک کفر وباطل کی طاغوتی قوتیں مکمل طور پر شکست خوردہ وہزیمت یافتہ نہ ہو جائیں۔

اس کے بعد دوسری حالت ہے اختتام جنگ کی یعنی جنگ ختم ہو گئی، مسلمانوں نے معرکہ حرب کو فتح کر لیا۔ شرک ذلیل اور ایمان واسلام سربلند وسرفراز ہو گیا، جن کے مقدر میں مسلمانوں کی شمشیر کفر شکن کے ہاتھوں لقمہ اجل بننا تھا وہ سب کے سب قتل کر دیے گئے اب جو لوگ مسلمانوں کے ہاتھ قید ہوئے ہیں، سوال ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے تو سورہ محمد کی آیت فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً اس کا جواب دیتی ہے اور بتاتی ہے کہ اسیران حرب کے ساتھ اس قسم کے معاملات کیے جاسکتے ہیں۔

اب رہی سورہ براۃ کی آیت:

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ

پھر جب گزر جائیں مہینے پناہ کے تو مارو مشرکوں کو جہاں پاؤ اور پکڑو اور گھیرو اور بیٹھو ہر جگہ ان کی تاک میں۔

تو اگر چہ ارباب تفسیر کے ارشاد کے مطابق یہ سلسلہ قتال کی آخری آیت ہے لیکن پھر بھی اس کو کسی دوسری آیت کے ساتھ تعارض نہیں ہے۔ بلکہ اس کا محمل ان سب سے جدا اور الگ ہے۔ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ مشاعر حرام کو مشرکین کے وجود نامسعود سے بالکل پاک وصاف ہونا چاہیے۔ وہ اگر یہاں رہنا چاہتے ہیں تو مسلمان ہو کر رہیں۔ جیسا کہ آیت کے اس ٹکڑے سے ثابت ہوتا ہے:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ

اگر یہ توبہ کر لیں، نماز قائم کرنے لگیں اور زکوۃ ادا کرنی شروع کر دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔

رمز شناسان بلاغت جانتے ہیں کہ فخلوا سبیلھم اور آیت کا آخری ٹکڑا یعنی اِنَّ اللّٰہَ غَفُورٌ رَّحِیْمٌ اس بات پر صاف دلالت کر رہا ہے کہ یہ آیت کسی جنگ کے متعلق نہیں ہے بلکہ بحالت امن مشرکین سے کسی شے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اور فرمایا جاتا ہے کہ اگر مشرکین تمہارے اس مطالبہ کو پورا کر دیں تو خیر فخلو اسبیلھم ان کو ان کے حال پر رہنے دو یعنی مکہ میں انہیں قیام کی اجازت دے دو ورنہ بزور شمشیر ان سے اپنا مطالبہ پورا کراؤ اور چونکہ آیت کا مقصد مکہ معظمہ سے ان مشرکین کا اخراج ہے اس لیے بتاکید فرمایا کہ دیکھو ان میں کوئی فرد کہیں ڈھکا چھپا نہ رہ جائے۔ ان کی خوب جستجو کرو۔ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ان کی تاک ہر جگہ میں بیٹھو۔ غرض کہ اس آیت کا منشا مشرکین سے اپنا ایک مخصوص مطالبہ منوانا ہے اور بس۔ نہ تو یہ آیت تمام مشرکین کے لیے ہے اور نہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مشرکین کے لیے صرف دو راہیں ہیں۔ اسلام قبول کریں یا قتل ہونا گوارا کریں۔

اس آیت کا سباق یعنی اس سے قبل کی آیات دیکھیے تو معاملہ بالکل واضح ہو جاتا ہے اور یہ سب آیتیں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ۹ھ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے چند اشخاص کو اس لیے منیٰ بھیجا کہ وہ وہاں یوم النحر میں اس بات کا اعلان کر دیں:

لا یحج بعد العام مشرکٌ ولا یطوف بالبیت عریانٌ.

اس سال کے بعد نہ تو کوئی مشرک حج کرے اور نہ کوئی برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرے

ان حضرات کی روانگی کے بعد ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پیچھے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور حکم دیا کہ سورہ براۃ کا اعلان کر دیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہم لوگوں کے ساتھ سورہ براۃ کا اعلان عام کیا اور فرمایا کہ آئندہ سال کوئی مشرک حج نہ کرے اور کعبہ کا طواف بحالت برہنگی نہ کیا جائے"[۵۲]۔

محدثین اس میں مختلف ہیں کہ کل سورہ براۃ کا اعلان کیا گیا تھا کہ کسی جز کا۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

وانما امر بعلیغه منها اوائلها فقط[۵۳]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ براۃ کی صرف پہلی آیتوں کی تبلیغ کا حکم فرمایا تھا۔

اگر اوائل سورت کی تبلیغ ہی کا حکم دیا گیا تھا تب بھی اب یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ آیۃ فاذا انسلخ الا شھر الحرام الآیہ، انہی آیات کے سلسلہ میں ہے جن کی تبلیغ کا حضور صلی اللہ علیہ

وسلم نے امر فرمایا تھا اوران سے الگ کوئی حکم عام نہیں ہے۔ امام احمد اور نسائی نے جو روایت محرز بن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کی ہے اس میں ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ بالکل صاف لفظوں میں فرماتے ہیں:

فکنا ننادی ان لا یدخل الجنۃ الا نفس مسلمۃ ولا یطوف بالبیت عریان ومن کان بینہ وبین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عھد واَجَلُہٗ اربعۃ اشھر واذا مضت فان اللہ بریء من المشرکین ورسولہ ولا یحج بعد العام مشرک[54]

ہم اس بات کا اعلان کرتے پھرتے تھے کہ جنت میں سوائے نفس مسلمہ کے کوئی اور داخل نہ ہوگا اور کعبہ کا طواف کوئی برہنہ ہوکر نہ کرے اور جن لوگوں میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں معاہدہ ہو چکا ہے اس کی کل مدت چار ماہ ہے جب یہ گزر جائیں گے تو اللہ اور اس کا رسول اہل شرک سے بری ہیں اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کر سکے گا۔

اب اس روایت کی روشنی میں اس آیت کو پڑھیے تو صاف عیاں ہوتا ہے کہ اس آیت کا تعلق عام جدال وقتال سے ہے ہی نہیں۔ بلکہ اس کی غرض مکہ کی مشرکین سے تطہیر ہے۔

اس کے برخلاف اگر اس حکم کو عام مانا جائے اور جیسا کہ بعض علماء فرماتے ہیں یہ کہا جائے کہ مشرکین کے لیے بجز اسلام یا قتل کے کوئی اور چارہ ہی نہیں ہے اور اس نے صلح وملاطفت کی تمام آیتوں کو منسوخ کر دیا ہے تو غور کیجیے کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد صحابہ کرام کا تعامل یہی تھا کہ مشرک جہاں کہیں ملا قتل کر دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک آیت ''من وفدا کیا' ذیل کی تمام آیات بھی یک قلم منسوخ ہو گئی ہوتیں۔

۱: وَاِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا.

اگر وہ صلح پر آمادہ ہوں تو آپ بھی صلح کر لیں۔

۲: لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ.

آپ ان کے اجارہ دار نہیں ہیں۔

۳: وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ.

آپ لوگوں پر زبردستی کرنے والے نہیں ہیں۔

۴: فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ.

آپ ان کو معاف کر دیجیے اور چشم پوشی کیجیے۔

ابن بریدہ اپنے والد ماجد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی ایک دستہ فوج کو مشرکین سے جنگ کرنے کے لیے بھیجتے تھے تو اس کو یہ ہدایت فرماتے تھے کہ ''جب تم مشرکین

سے ملو تو ان کو اسلام کی دعوت دو۔ اگر وہ انکار کریں تو کہو کہ جزیہ ادا کرنے پر رضامند ہو جاؤ۔ وہ اس کو مان لیں تو ان سے جزیہ لو اور اپنے ہاتھوں کو ان سے باز رکھو[55] کہا جا سکتا ہے کہ مشرکین کا لفظ عام ہے۔ پھر اس میں تخصیص کی دلیل کیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ فَإِذَا انسَلَخَ میں فا تفریع کے لیے ہے اس بناء پر یہ آیت ماقبل کی آیت سے بے تعلق نہیں ہو سکتی اور آیت ماقبل میں مشرکین کی صفت الَّذِينَ عَاهَدتُّم لائی گئی ہے یعنی وہ مشرک جن سے مسلمانوں نے معاہدہ کیا تھا۔ پس معلوم ہوا کہ آیت زیر بحث میں مشرکین کا لفظ ہے اس سے مراد نہ عرب وعجم کے تمام مشرک ہیں اور نہ فقط عرب کے تمام، بلکہ صرف وہی لوگ مراد ہیں جن سے مسلمانوں کا معاہدہ ہوا تھا یعنی مشرکین مکہ۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ سورۃ براۃ میں جو حکم ہے وہ اس حکم سے قطعاً متصادم نہیں جو سورۂ محمد میں اسیران جنگ کی نسبت ارشاد فرمایا گیا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تمام قرآن مجید میں اسیروں کے ساتھ معاملہ کرنے کی ہدایت جس آیت میں ہے وہ صرف سورۂ محمد کی آیت ''من وفدا'' ہے اور وہ ثابت غیر منسوخ ہے۔

اسلام میں غلامی

اسلام کے بعض نادان دوستوں نے یہ دیکھ کر کہ قرآن مجید میں باندی غلام بنانے کا ذکر کہیں صراحۃً نہیں ہے اور اما کلمہ حصر کی وجہ سے اسیران جنگ کے معاملہ کو صرف من وفداء کی دو صورتوں میں محدود کر دیا گیا ہے، دعویٰ کیا کہ اسلام میں باندی غلام بنانا جائز ہی نہیں ہے۔ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ اسلام کے مسائل وشرائع کے حسن وقبح کو غیر مسلم اقوام کے معیار تہذیب وتمدن پر پرکھتے ہیں۔ ان کی آنکھوں پر تقلید فرنگ کی ایک ایسی عینک لگی ہوئی ہے جس کے رنگین شیشوں میں انہیں اسلامی مسائل کی اصل حقیقت نظر نہیں آتی تو وہ کوشش کرتے ہیں کہ غیر واقعی چیز کو واقعی کر کے دکھائیں۔ حالانکہ انہیں سمجھنا چاہیے کہ اسلام کے حقائق ازلی اور ابدی ہیں۔ زمان ومکان کے اثرات اور کسی ملک کی تہذیب وتمدن کے تغیرات سے بلند وبالا۔ ابھی کچھ مدت کی بات ہے کہ یورپ طلاق کا مذاق اڑاتا تھا اور تعدد ازدواج کے جواز پر طعن دیتا تھا۔ لیکن زمانے نے دیکھ لیا کہ اب اسی یورپ نے طلاق کو قانونی حیثیت دی ہے۔ اسلام نے بیوہ عورتوں کے نکاح کو نہ صرف جائز کہا بلکہ اس کو مستحسن اور کار ثواب قرار دیا۔ ہندوؤں نے اس پر اپنے مذہبی عقائد کی بنا پر لعن وطعن کیا اور مسلمانوں کو برا بھلا کہا لیکن دنیا جانتی ہے کہ اب وہی ہندو عقد بیوگان کا مسودۂ قانون بعض

ریاستوں میں پاس کرا چکے ہیں اور اس کو سماجی اصلاح کا ایک اہم جزو قرار دے رہے ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے متعدد واقعات ہیں جو اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ اسلامی مسائل کو کبھی غیر مسلم قوم، خواہ وہ دنیوی نقطۂ نظر سے کتنی ہی ترقی یافتہ ہو اس کی تہذیب وتمدن کی کسوٹی پر نہ پرکھنا اور ردو قبول کے لیے اس کو معیار نہ بنانا چاہیے، بلکہ تمام خارجی تاثرات سے خالی ہو کر یہ معلوم کرنا چاہیے کہ درحقیقت یہ اسلام کی تعلیم ہے بھی یا نہیں۔

یہی غلامی کا مسئلہ لیجیے، صدیاں گزر گئیں، اس اثنا میں بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں اور مٹ گئیں۔ بڑے بڑے فلاسفر پیدا ہوئے اور فنا ہو گئے لیکن غلام بنانے کے مسئلہ پر کبھی کسی نے توجہ نہیں کی اور جواز استرقاق کی بنا پر کسی نے اسلام کو ملعون نہیں کیا۔ انیسویں صدی کے عیسائی مصنفین نے اس پر زبان ملامت کھولی تو اس وضع وقماش کے بعض بزرگ اٹھے اور انھوں نے سیلاب مخالفت کے ڈر سے اپنی عمارت کو مضبوط بنانے میں قوت صرف کرنے کے بجائے سرے سے اصل عمارت پر ہی کدال چلانی شروع کر دی کہ نہ اصل عمارت ہوگی اور نہ سیل مخالفت کی کوئی موج اس کو نقصان پہنچا سکے گی۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ قرآن مجید میں غلام بنانے کے جواز کا ذکر کہیں نہیں ہے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ کہیں "استرقاق" کی ممانعت بھی نہیں کی گئی ہے یعنی قرآن اس معاملہ میں ساکت ہے۔ باندی غلام بنانے کے متعلق نفیاً یا اثباتاً اس میں کوئی صراحت نہیں۔ اس کے بعد احادیث نبویہ اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کیجیے تو ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں باندی یا غلام بنانا جائز ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اسیران جنگ مردوں کو غلام اور عورتوں کو باندی قرار دیا ہے۔ تاریخ وحدیث میں باندی غلام کا ذکر اس کثرت سے آیا ہے کہ اس سے انکار بہت مشکل ہے جن طریقوں سے یہ روایتیں ہم تک پہنچی ہیں اگر ان کو ناقابل پذیرائی قرار دے دیا جائے تو پھر ان روایتوں کے قبول کرنے کے لیے یہ طریقے کیونکر کافی ہوں گے جن کو ہم قبول کیے بغیر رہ نہیں سکتے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً میں جو لفظ اِمّا آیا ہے کلمہ حصر ہے اور وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسیران جنگ کے ساتھ صرف دو ہی قسم کا معاملہ ہو سکتا ہے، فدیہ لے کر چھوڑ دیے جائیں یا بغیر فدیہ ہی ان کو رہا کر دیا جائے۔ ان دو کے علاوہ استرقاق یا قتل

ان میں سے کسی طرح کا اسیر کے ساتھ معاملہ کرنا قرآن مجید کے حکم کے خلاف ہے اور کلمہ حصر انما کے مدلول کو فوت کر دیتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق جب کوئی حکم دیا جاتا ہے تو اس کی حیثیتیں دو ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ حکم عام ہے، بہت ساری اشیاء کو شامل ہے اور چونکہ وہ چیز ان اشیاء میں سے ایک ہے اس لیے وہ حکم اس کو بھی شامل ہوگا۔ دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ حکم عام نہ ہو بلکہ خاص ہو اور صرف اسی چیز کے ساتھ خاص ہو۔ حکم کی دو قسمیں عام اور خاص معلوم کرنے کے بعد اب یہ سمجھئے کہ جب کبھی متعدد اشیاء کو سامنے رکھ کر کوئی ایک حکم بیان کرنا منظور ہو تو ایسے موقع پر مقتضاء بلاغت یہ ہے کہ صرف حکم عام بیان کیا جائے اور مختلف چیزوں کے لیے الگ الگ جو خاص خاص احکام ہیں ان کو بیان نہ کیا جائے۔ اس طرح کے مواقع پر صرف حکم عام بیان ہوتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بعض اشیاء کے لیے کوئی خاص حکم الگ نہیں ہے بلکہ بر بنا عرف یا کسی اور جگہ پر ذکر آ جانے کے باعث، یا ذہن سامع پر اعتماد کے سبب یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ حکم عام ہونے کے باوجود سامع خود بخود بعض اشیاء کو مستثنیٰ قرار دے لے گا۔

مثلاً یوں سمجھئے کہ کسی ملک میں غنیم سے مقابلہ کی تیاریاں بہت زور شور سے ہو رہی ہیں۔ ایک ایک باشندۂ ملک سے عہد و پیماں لیا جا رہا ہے کہ وہ دشمن کے بالمقابل بڑی بہادری اور دلیری کے ساتھ لڑے گا۔ اس موقع پر لشکریوں سے جو قسم لی جاتی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

"ہم خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتے ہیں کہ کل صبح ہم سب یا تو میدان جنگ کو فتح کر لیں گے ورنہ وہیں خود کشی کر کے جان دے دیں گے"۔

اب ظاہر ہے کہ یہاں جو حکم بیان کیا جا رہا ہے وہ عام ہے لیکن اس کے باوجود بعض خاص افراد ہیں جو خود بخود اس سے مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً ایک لشکری ہے جس کو یہ حلف شجاعت اٹھانے کے بعد یک لخت ہیضہ کی بڑی سخت شکایت ہو جاتی ہے، تو کیا یہ کہا جائے گا کہ اس مریض کو چونکہ حکم عام سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا تھا اس لیے یہ مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا؟۔

قرآن مجید میں خود اس طرح کی متعدد مثالیں موجود ہیں ایک موقع پر ارشاد ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔

اور محمد صرف اللہ کے رسول ہیں اور ان سے پہلے بہتیرے پیغمبر گذر چکے ہیں۔

غور کیجیے یہاں کلمہ نفی "ما" اور کلمہ استثناء "الا" دونوں مل کر حصر کا فائدہ دے رہے ہیں لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد صرف اللہ کے رسول ہی ہیں اور اس کے سوا کچھ اور نہیں؟ پھر آگے چل

کہ رسول کی صفت قد خلت من قبلہ الرسول لائی گئی ہے۔ الرسل پر الف لام استغراق کا ہے لیکن کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اس میں داخل ہیں؟ اور داخل نہ ہونے کی صورت میں سوچئے اگر قد خلت من قبلہ الرسل کے ساتھ فوراً ہی الا عیسیٰ کا استثناء آ جاتا تو اس سے بلاغت کو کتنا عظیم نقصان پہنچتا؟

پس آیت زیر بحث کو بھی اسی پر قیاس کر لیجیے۔ اسیران جنگ کے لیے جو احکام ہیں وہ دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو ہر ایک قیدی کے ساتھ برتے جا سکتے ہیں اور ایک وہ جو خاص خاص افراد کے لیے مخصوص ہوں۔ پہلی قسم کا حکم من وفداء ہے اور دوسری قسم کا حکم استرقاق وقتل ہے اور چونکہ یہاں اسیران جنگ کے لیے ایک عام حکم بیان کرنا تھا اس لیے صرف فاما منا بعد و اما فداءً پر اکتفاء کیا گیا لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ اسیران جنگ کے لیے صرف یہی حکم ہے اور بس، قرآنی بلاغت سے اور تاریخ وسیر سے آشنا نہ ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ ارباب تفسیر میں سے کسی نے بھی اسیران جنگ کے حکم کو ان دونوں میں محصور نہیں مانا۔ بلکہ جیسے پہلے بیان ہو چکا ہے اسیران جنگ کے معاملہ کو امام کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے وہ جیسا مناسب سمجھے کرے۔ احسان کرے، فدیہ لے، قتل کر دے یا غلام بنا لے۔ صرف ایک ابوعبید ہیں جنہوں نے غلام بنانے کے جواز میں شک کیا ہے[56]۔

امام رازیؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

ھذا ارشادٌ فذکر الامر العامَّ الجائز فی سائر الاجناس والاسترقاق غیر جائزٍ فی اسر العرب فان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان معھم فلم یذکر الاسترقاق واما القتل فان الظاھر فی المثخن الا زمان ولان القتل ذکرہ، بقولہ فضرب الرقاب فلم یبق الا الامران[57]۔

یہ ارشاد کا موقع ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے امر عام کو ذکر کیا ہے جو تمام اجناس میں شامل ہے۔ بخلاف غلام بنانے کے وہ عرب کے گرفتاران جنگ کے لیے درست نہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان موجود تھے۔ اس لیے غلام بنانے کا ذکر نہیں کیا۔ اب رہا قتل تو اس لیے کہ جو مغلوب ہو گیا بالکل اپاہج اور مفلوج ہو جائے گا اور دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "فضرب الرقاب" فرما کر قتل کا ذکر کر دیا ہے۔ پس اب صرف دو امر باقی رہے۔ (یعنی من وفداء)

علامہ رشید رضا "الوحی المحمدی" میں لکھتے ہیں:

ولمّا کنّا مخیرین فیھم بین اطلاقھم بغیر مقابل والفداء بھم جاز ان یُعَدّ ھذا صلاً شرعیًا لابطال استئناف الاسترقاق فی الاسلام فانّ۔

اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ قیدیوں کو بغیر کسی معاوضہ کے رہا کردیں یا فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔ اس آیت کو نئے غلام بنانے کی ممانعت میں اصل قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان دو صورتوں میں اختیار دینے کا مطلب یہ ہے کہ تیسرا امر یعنی:

ظاهرُ التخيير بين هذين الامرين ان الامر الثالث الذى هو الاسترقاق غير جائز لو لم يعارضه انه هو الاصل المتبع عند جميع الامم فمن اكبر المفاسد و الضرر ان يسترقوا اسرانا و نطلق اسراهم و نحن ارحم بهم و اعدل ولكن الاية ليست نصًّا فى الحصر و لا صريحة فى النهى عن الاصل فكانت دلالتها على تحريم الاسترقاق مطلقاً غير قطعية فبقى حكمه محل اجتهاد اولى الامر اذا وجدوا المصلحة فى ابقائه ابقوه و اذا وجدوا المصلحة فى ترجيح المَنِّ عليهم بالحرية و هو ابطالٌ اختيارىٌ له، و الفداءِ بهم عملوا به.

غلام بنانا جائز نہیں ہے اگر اس سے یہ بات متعارض نہ ہوتی کہ تمام قوموں میں غلام بنانے کا رواج جو جڑ پکڑے ہوئے ہے پس یہ امر سب سے بڑا مفسدہ اور نقصان کا باعث ہے کہ غیر قومیں تو ہمارے قیدیوں کو غلام بنالیں اور ہم ان کے قیدیوں کو رہا کردیں، حالانکہ قیدیوں کے حق میں ہم سب سے زیادہ مہربان اور عادل ہیں پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ آیت میں نہ تو حصر کی تصریح ہے، (اور نہ غلام بنانے کی نفی صراحۃً ہے اس لیے یہ آیت غلامی کی ممانعت پر قطعی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ معاملہ ارباب حکومت کے اجتہاد سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اگر مناسب سمجھیں کہ اسیران جنگ کو بغیر معاوضہ ہی رہا کردیں تو ایسا کریں اور اگر فدیہ لے کر آزاد کرنا مناسب ہو تو ایسا کریں۔

علامہ رشید رضا کا مطلب یہ ہے کہ اگر جواز استرقاق کے لیے دوسرے دواعی نہ ہوتے تو بلاشبہ قرآن مجید کی آیت فاما منا بعد و اما فداءً غلامی کے ختم و استیصال کے لیے ایک اصل کا کام دیتی لیکن معاملہ یہ ہے کہ ایک طرف تو استرقاق سے متعلق نفیاً یا اثباتاً اس آیت میں کچھ نہیں فرمایا گیا اور دوسری طرف ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اسیران جنگ کو غلام بنایا اور پھر اس عہد کے عام ملکی احوال کا بھی یہی تقاضا تھا کہ غلام بنانا ناجائز نہیں ہونا چاہیے ان وجوہ کی بنا پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسلام میں غلام بنانے کی اجازت نہیں ہے اور آیت بالا نے غلامی کے جواز کا بالکل خاتمہ کردیا۔

اسلام نے غلامی کا خاتمہ کیوں نہیں کیا؟

لیکن اسلامی تعلیمات وتصریحات کو عدل وانصاف کے معیار تنقید پر جانچا جائے تو بے شبہ یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام نے غلام بنانے کی صرف اجازت دی ہے حکم نہیں دیا اور اس نے بعض ناگزیر اور وقتی حالات کے پیش نظر اگرچہ اس کو مباح کیا ہے لیکن اس کو بہ نظر پسندیدگی نہیں دیکھا اور یہی وجہ ہے کہ چونکہ استرقاق صرف ایک ہنگامی اور وقتی چیز ہے، معاشرت، اجتماعی زندگی اور تمدن کا کوئی مستقل عنصر نہیں ہے۔ اس لیے قرآن مجید میں کسی جگہ اس کا ذکر نہیں فرمایا گیا۔ قتل جو سزاؤں میں سب سے زیادہ سخت اور آخری سزا ہے قرآن مجید نے بصیغہ امر متعدد جگہ اس کا ذکر کیا لیکن استرقاق کے جواز سے متعلق کہیں ایک حرف بھی نہیں فرمایا گیا۔

اسلام نے غلامی میں ممکن سے ممکن اصلاح کی اور اس کو ہمسری و برابری کے درجہ تک پہنچا دیا لیکن سوال یہ ہے کہ اسلام نے اس رسم بد کا قطعی طور پر خاتمہ کیوں نہیں کیا؟ اس کی چند وجوہ ہیں:

پہلی وجہ

۱۔ اسلام جب دنیا میں آیا، تو صدیوں پہلے ہر جگہ غلام بنانے اور رکھنے کا رواج تھا۔ خود عرب اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ اہل عرب کثرت سے غلام اور باندیاں رکھتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ بسا اوقات ان کی لڑائیاں اسی لیے ہوتی تھیں کہ اسیران جنگ ہاتھ آئیں اور غلام بنائے جائیں۔

عمرو بن کلثوم ایک جگہ کہتا ہے:

فابوا بالنهاب بالسبايا
وابنا بالملوك مصفدينا

وہ لوٹے ہوئے مال اور لونڈی غلام کو لے کر واپس ہوئے اور ہم بادشاہوں کو لے کر لوٹے جو بندھے ہوئے تھے

زہیر بن ابی سلمٰی آل ربیعہ پر اپنی فتح کے واقعات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

وسبينا من تغلب كل بيضا
ء رقود الضحى برود الرضاب

ہم نے تغلب کی گوری گوری لڑکیوں کو باندیاں بنا لیا جو دن چڑھے تک سوتی رہتی ہیں اور جن کا لعاب دہن شیریں اور خنک ہے

حارث بن حلزہ، نعمان بن منذر کے ایک حملہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

ثم ملنا علی تمیم فاحرمنا
وفیھا بنات حر اماء

پھر ہم بنو تمیم پر مائل ہوئے اور ماہ حرام میں ان کو جا پکڑ لیا اور ان کی بیٹیوں کو باندیاں بنالیا۔

اکثم بن صیفی کہا کرتا تھا:

اھنأ الظفر کثرۃ الاسری وخیر الغنیمۃ المالُ.

بہترین اور عمدہ کامیابی وہ ہے جس میں قیدی زیادہ ہاتھ آئیں اور غنیمت کا اچھا مال، اونٹ وغیرہ ہیں۔

پھر اس زمانے کے اقتصادی حالات بھی رواج غلامی کی بقا کا تقاضا کرتے تھے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے کے لیے وسائل آمدورفت بہت ناکافی اور محدود تھے۔ عرب کوئی زراعتی ملک نہ تھا جس میں کثیر التعداد کسانوں اور مزدوروں کی خوراک کا سامان باآسانی پہنچ سکتا۔ صنعت وحرفت کے اعتبار سے بھی اس کو نمایاں امتیاز ومقام حاصل نہ تھا۔ وہاں بیش از بیش دستکاری کے کارخانے نہ تھے جن میں غریب لوگ کھپ سکیں اور اس طرح اپنے بال بچوں کے لیے روزی کا کوئی بندوبست کرسکیں۔ ان حالات میں سوسائٹی کے نظم واجتماع کو باقی رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ لوگ جو سرمایہ دار ہیں غریبوں کو اپنی سرپرستی میں لیں۔ اقتصادی حالات سے تنگ آکر بعض مائیں اپنے بچوں کو امیروں کے ہاتھ فروخت کردیا کرتی تھیں اور خریدنے والے ان کو غلام یا باندی بنالیتے تھے۔ فلسفہ اجتماع کے ماہرین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انسانی معاشرت پر کبھی ایسا دور آتا ہے جبکہ غلامی کا رواج نقصان رساں ثابت ہونے کی بجائے تہذیب وتمدن کی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ [۵۸]

غلامی سوسائٹی کے جسم صحیح کے لیے ایک جرعہ تلخ سے کم نہیں۔ لیکن جس طرح انفرادی بیماری مریض کو داروئے ناخوشگوار کے پینے پر مجبور کرتی ہے ٹھیک اسی طرح انسانی جماعتوں اور سوسائٹیوں کا حال ہے کوئی انسانی جماعت تہذیب وتمدن کے اعتبار سے ترقی یافتہ ہو۔ وسائل وذرائع معاش اس کے ہاں بافراط تمام ہوں۔ ایجادات واختراعات کا بازار گرم ہو تو اس میں غلامی کا رواج پایا جانا نہ صرف ناجائز بلکہ انتہائی شرمناک اور ذلت انگیز ہے لیکن اس کے برخلاف اگر ایسا نہ ہو تو بسا اوقات ناگزیر ہوتا ہے کہ غلامی کا رواج برتا اور جاری کیا جائے۔

بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ظہور اسلام کے وقت عرب میں باندی غلام کا عام رواج تھا۔ اور یہ رواج ان کی معاشرت کا جز اہم بنا ہوا تھا۔ پس یہ ظاہر ہے کہ جب تک اہل عرب کی طرز معیشت، عام معاشرت اور ان کے تہذیب و تمدن میں نمایاں انقلاب نہ پیدا کر دیا جاتا اس رسم بد کا اختتام نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر اس عہد کے موجود حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یک لخت اس رسم کا استیصال فرما دیتے تو اقتصادی اور معاشرتی دونوں اعتبار سے عرب کو نقصان عظیم پہنچتا اور بہت ممکن ہے کہ اس سے ملک میں ایک عام بے چینی پیدا ہو جاتی۔ سید امیر علی لکھتے ہیں:

"جن لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ان میں رواج غلامی پورے طور پر سرایت کیے ہوئے تھا۔ اس کے انسداد کی صورت یہی تھی کہ مسلسل طور پر انسانی اور عقلمندانہ قوانین کی اشاعت کی جاتی۔ اگر یکا یک ان کا انسداد کر دیا جاتا تو اخلاقی اور اقتصادی اعتبار سے ایسا ہونا ناممکن تھا[59]"

پھر یہی جلیل القدر مصنف آگے چل کر یوں رقمطراز ہے:

"نامحدود قواعد مثبت اور منفی، غلاموں کی بتدریج آزادی اور ان کی مرفہ الحالی کے لیے وضع کیے گئے۔ اگر اس کے خلاف کوئی اور پالیسی اختیار کی جاتی تو اسلامی جماعت اور سوسائٹی کو اس سے نقصان پہنچتا جو کہ اس وقت اپنی ابتدائی حالت میں تھی"

مذہب و اخلاق کے انسائیکلو پیڈیا کا مقالہ نگار اس سوال کے جواب میں کہ جنوبی امریکہ میں غلامی کا خاتمہ یک لخت کیوں نہ کر دیا گیا۔ لکھتا ہے:

"یقیناً وہ لوگ جو غلام رکھتے تھے ان کے پاس بھی اپنے اس فعل کے لیے چند وجوہ تھے، وہ خود اس رواج کے وجود میں لانے کے ذمہ دار نہیں تھے۔ بلکہ یہ تو پہلے سے چلا آ رہا تھا۔ اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ اگر غلامی کا خاتمہ اچانک کر دیا جاتا تو سیاہ فام غلاموں کا حشر کیا ہوتا۔ اگر ان کو وہی حقوق دیے جاتے جو سفید فام لوگوں کے تھے تو جنوبی علاقہ کے لوگ اس کے نتائج کے تصور سے خوفزدہ ہوتے تھے اور اگر ان لوگوں کو وہ حقوق نہ دیے جاتے تو یہ اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی غرض ہر اعتبار سے مشکلات پیدا کر دیتے غلامی جنوبی امریکہ کی سوسائٹی کا اہم جز بنی ہوئی تھی اور اس لیے اس کو بدلنا بہت مشکل تھا"۔

مقالہ نگار موصوف نے جنوبی امریکہ سے یک لخت غلامی کا خاتمہ نہ کرنے کی جو اخیر وجہ لکھی ہے، وہی بعینہ اس کی وجہ ہے کہ اسلام نے اچانک عرب سے غلامی کا رواج مسدود نہیں کیا۔

ولایت متحدہ امریکہ نے غلام آزاد کیے تو ان میں سے بعض دور دراز ملکوں میں طلب رزق کے لیے نکل گئے لیکن جب ان کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو اپنے آقاؤں کے پاس آ کر درخواست کی کہ ہم کو پھر غلامی میں لے لیا جائے۔ یہی حال مصری سوڈان میں ہوا۔ انگریز حاکموں نے اس کا تجربہ کرنا چاہا کہ اگر غلام آزاد کردیے جائیں تو ان کے لیے ایسے وسائل معاش مہیا ہوں جن سے وہ اپنی ضروریات کی تکمیل کرسکیں۔ لیکن انگریز حکام کا یہ تجربہ ناکامیاب رہا اور ان کو مجبوراً یہ حکم دینا پڑا کہ وہ پھر اپنے اپنے آقاؤں کی غلامی میں واپس چلے جائیں بشرطیکہ وہ فروخت نہ کیے جائیں اور ان کی کوئی مارکیٹ نہ قائم ہو[60]۔

برطانوی علاقوں میں ۱۸۳۳ء میں غلامی کے استیصال کلی کا بل منظور ہوا تو جو غلاموں کے مالک تھے ان کو بیس ملین اسٹرلنگ معاوضہ دیا گیا[61]۔

اس زمانہ میں غلاموں اور باندیوں کی کثرت، حکومت اسلام کی غربت و بے تمولی ان دونوں کو پیش نظر رکھو اور بتاؤ کہ کیا اسلامی حکومت اپنے اس ابتدائی دور میں بے شمار غلاموں کو آزاد کرا کے ان کے آقاؤں اور مالکوں کو معاوضہ دے سکتی تھی۔ پھر آزاد ہونے کے بعد جن غلاموں پر خود کسب معاش کا بار پڑتا کیا اسلامی حکومت ان سب بے روزگاروں کی کفالت اپنے ذمہ لے سکتی تھی۔

عیسائی خود کہتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے غلامی کا خاتمہ اس لیے نہیں کیا کہ یک لخت غلامی کا خاتمہ کردینا یا اس کے لیے کوشش کرنا سوسائٹی کے نظام معاشرت کو سخت صدمہ پہنچاتا[62]۔ تو کیا جو چیز حضرت مسیح علیہ السلام کے لیے اس باب میں عذر ہوسکتی ہے پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نہیں ہوسکتی تھی؟

مئی ۱۸۲۳ء میں فوویل بکسٹن (Fowell Buxton) نے دارالعوام میں غلامی پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ غلامی برطانوی دستور اساسی اور عیسائی مذہب دونوں کے اصول کے خلاف ہے۔ اس بناء پر برطانوی نوآبادیات سے اس کا خاتمہ تاریخی طور پر کردینا چاہیے۔

اس تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ خود برطانوی مدبرین بھی سمجھتے تھے کہ یک لخت غلامی کے رواج کا اختتام پریشان کن نتائج کا موجب ہوگا۔

دوسرا سبب

اس عہد میں ہر جگہ غلام بنانے کا رواج تھا۔ پس اگر اسلام اس کو بحالت جنگ جائز نہ قرار دیتا تو اس سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچتا لڑائی میں جو مسلمان کافروں کے ہاتھ گرفتار

ہوتے، غلام بنا لیے جاتے اور اس کے برخلاف جو کافر مسلمانوں کے ہاں قید ہوتے سب کے سب منّا یا فداءً رہا کردیے جاتے تو ظاہر ہے اس طرح مسلمانوں کو قسم قسم کے مصائب برداشت کرنے پڑتے۔ ان کی طاقت وقوت کم ہوتی رہتی اور ان کے دشمنوں کی صولت وعظمت میں ترقی ہوتی۔

ہر شخص جانتا ہے کہ جنگ میں اپنی قوت کے توازن کو باقی رکھنے کے لیے ہر فریق کو انہی اصول وقواعد جنگ پر عامل ہونا پڑتا ہے جو دوسرے فریق کا معمول ہوتے ہیں۔ پس ایک ایسے زمانے میں جبکہ جنگ کے گرفتار شدہ لوگوں کو غلام بنا لینے کا رواج عام تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی ناگزیر تھا کہ استرقاق کو جائز رکھیں اور آپ اس کا خاتمہ اس وقت تک نہیں کر سکتے تھے جب تک کہ یا تو تمام اقوام عالم متفق ہو کر اس رسم بد کا خاتمہ کرنے پر آمادہ نہ ہو جاتیں اور یا مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے اتنی طاقت وقوت حاصل ہو جاتی کہ یہ خود اپنے اختیار سے اس رسم کا خاتمہ کر سکتے اور اس کے باوجود غیروں کی جانب سے انھیں نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہوتا۔ چنانچہ آئندہ چل کر معلوم ہوگا کہ حضرت عمرؓ نے اسلامی طاقت کے مضبوط ہو جانے پر ایسا ہی کیا۔ ڈاکٹر حسن ابراہیم نے اسی مفہوم کو ان مختصر لفظوں میں بیان کیا ہے:

> وانما ابقی علیه اولًا لحفظ التوازن بین الدولة الاسلامیه وبین اعدائها وثانیًا لحمایة الضعفاء من نساءٍ اکلتِ الحربُ رجالهن ولو ترکنَ وشانُهُنَّ لکنَّ عالةً علی المجتمع ومصدرًا للشرور [۲۳]
>
> اسلام نے غلامی کو باقی رکھا اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ حکومت اسلامیہ اور اس کے دشمنوں میں توازن باقی رہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس طرح ان کمزور عورتوں کی اعانت وحمایت ہو جاتی تھی جن کے مرد لڑائی میں قتل ہو چکے ہوں اگر ان عورتوں کو یونہی چھوڑ دیا جاتا تو انسانی جماعت پر یہ مصیبت ہو جاتیں اور طرح طرح کے مفاسد کا باعث بنتیں۔

تیسری وجہ

ڈاکٹر صاحب نے جو دوسری وجہ لکھی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جنگ میں مرد بے شمار تعداد میں قتل ہو جاتے ہیں اور اپنے پیچھے عورتوں اور بچوں کی کثیر جماعت چھوڑ

جاتے ہیں، تو اگر اس وقت ان پسماندگان کی رہائش و خورش اور اس سے بڑھ کر ان کی اخلاقی نگرانی اور دیکھ بھال کا کوئی انتظام نہ ہو تو اندیشہ ہے کہ وہ برے اعمال کا ارتکاب کرنے لگیں اور مفاسد و فتن کا باعث بن جائیں جیسا کہ جنگ عظیم از ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کے بعد انگلستان اور جرمنی میں ہوا۔

ان حالات میں بجز اس کے کہ کوئی راہ نہیں ہے کہ ان بچوں اور عورتوں کو ایک تعلق کے ساتھ مختلف افراد کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے۔ آپ اس تعلق کا نام غلامی رکھ دیجیے لیکن آگے چل کر آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ اسلام نے جس حقیقت کو غلامی کہا ہے وہ در اصل غلامی ہے یا بھائی بندی اور برادری ہے۔

پھر ان سب سے قطع نظر کر کے اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ وہ لوگ جو جنگ میں گرفتار ہوتے ہیں ان کے ساتھ عقل کئی طرح کا معاملہ ہو سکتا ہے۔ (۱) قتل کر دیے جائیں (۲) فدیہ لے کر یا بغیر فدیہ رہا کر دیے جائیں (۳) قید خانہ میں (State Prisoner) کی حیثیت سے رکھے جائیں۔ بعض اوقات حالات ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک صورت کو بھی اختیار نہیں کیا جا سکتا، ایک قیدی جو عمدہ دل و دماغ کا مالک ہے اس کو قتل کرنا سوسائٹی پر ظلم کرنا ہے علی الخصوص اس وقت جبکہ وہ مسلمانوں کی دشمنی میں زیادہ سرگرم اور پیش پیش نہ ہو۔ اسی طرح اس کو رہا کرنا بھی بعض مرتبہ سیاسی مصالح کے خلاف ہوتا ہے۔ اندیشہ ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے پاس جا کر کہیں پھر آپ کی مخالفت اور دشمنی میں سرگرم نہ ہو جائے۔

بالعموم جمہوری اور شخصی سلطنتیں ایسے اسیران جنگ کے ساتھ جن کو نہ قتل کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کو رہائی دی جا سکتی ہے، معاملہ یہ کرتی ہیں کسی جزیرہ میں یا الگ تھلگ مقام پر نظر بند کر دیتی ہیں اور یا کسی قید خانہ میں ان کو قید کر دیا جاتا ہے۔ اسلام نے اس طریقہ کے بالمقابل ایک طریقہ استرقاق کا تجویز کیا ہے۔ اب دونوں پر غور کیجیے تو بڑا فرق نظر آتا ہے۔ پہلی صورت میں خرابی یہ ہے کہ ان نظر بندوں کے اخراجات کا بار حکومت کے خزانہ پر پڑتا ہے جن کو وہ کبھی جدید ٹیکس لگا کر وصول کرتی ہیں۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ نظر بند ہونے یا قیدی ہونے کی صورت میں ان لوگوں کی ذہنی تربیت اور دماغی نشو و نما کا موقع نہیں ملتا اور یہ بے شبہ سوسائٹی کی بد نصیبی ہے کہ وہ چند بہترین دماغوں سے جو بحالت آزادی مفید خدمات انجام دے سکتے تھے ان کے قید و بند ہونے کے باعث محروم ہو جائے۔

اس کے برخلاف غلاموں کا حال ہے، ان کے اخراجات مختلف افراد پر تقسیم ہو جاتے ہیں۔ جن کو اپنے منافع خدمت وغیرہ کے پیش نظر بخوشی انگیز کر لیتے ہیں اور پھر ان کو دماغی تربیت اور ذہنی ارتقاء کے مواقع بکثرت ملتے ہیں بشرطیکہ سماجی نظام میں ان کے ساتھ وحشیانہ اور غیر انسانی

معاملہ روا نہ رکھا گیا ہو۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان غلاموں نے کیسے کیسے عظیم الشان سیاسی علمی اور ادبی کارنامے کیے ہیں۔ جن کا تذکرہ کتاب کے دوسرے حصہ میں ہوگا۔

الغرض یہ وجوہ واسباب تھے جن کی بنا پر اسلام نے یک قلم غلامی کی رسم قدیم کا خاتمہ نہیں کیا۔ بلکہ اس کی اصلاح اور تدریجی اختتام کے لیے وہی راہ اختیار کی جو اس نے اسی نوع کے دوسرے معاملات میں اختیار کی ہے۔

اسلام کا اصلاح معاملات میں ایک اہم اصول

بقول ایک انشا پرداز کے اسلام کا اصول ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ وقت کے اسپرٹ کی ساتھ جنگ نہیں کرتا۔ اگر کسی عمل انسانی کو دفع کرنا ہوتا ہے تو اس کے لیے یکا یک اعلان نہیں کرتا بلکہ تدریجی طور پر وہ ایسی تعلیمات وتلقینات ذہن نشین کرتا ہے کہ آہستہ آہستہ خود ہی وہ عمل فنا ہو جائے۔

نماز فرض ہوئی تو شروع شروع میں اس میں کلام کرنا جائز تھا۔ پھر جب مسلمان اس کے عادی ہو گئے اور ان کا استغراق فی العبادت بڑھ گیا تو اکل وشرب اور کلام وسلام سب نماز میں ممنوع قرار دیدیے گیے۔

عرب کے لوگ شراب کے بڑے شوقین تھے اس کا پینا ان کے نزدیک باعث فخر اور نہ پینا سرمایہ ننگ وعار تھا۔ اسلام نے اس کی ممانعت کرنی چاہی تو یک لخت اس کی حرمت کا اعلان نہیں کیا، بلکہ شروع شروع میں صرف اتنا کہا گیا کہ ''نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو'' اس طرح شراب نوشی میں کمی ہوئی۔ پھر جب نماز میں مخل ہونے کے باعث شراب کی طرف سے ان کے دلوں میں نفرت بیٹھ گئی تو صاف حکم نازل ہوا:

إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ.

اے ایمان والو یہ شراب اور جوا اور بت اور پانسے سب گندے کام ہیں شیطان کے عمل سے تم ان سے پرہیز کرو تا کہ تم فلاح پاؤ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تم میں شراب اور جوئے کے ذریعہ دشمنی اور بیر ڈالے اور تم کو اللہ کے ذکر اور نماز سے روکے تو کیا تم اس سے پرہیز کرو گے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تدریجی طور پر ان شراب کے متوالوں کے دلوں میں ام الخبائث کی جو نفرت جا گزین کر دی تھی اُس کا اثر یہ ہوا کہ اس آیت کو سنتے ہی حضرت عمرؓ بول اُٹھے:

اِنۡتَهَيۡنَا يَا رَبِّ.

(اے رب ہم رک گئے)

اسلام کا جو اصول اصلاح ہے وہ حضرت عائشہؓ کی حدیث ذیل سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے، آپ فرماتی ہیں:

انما نزل اوّل مانزل منه سورة من المُفَصّل فيها ذكر الجنة والنار حتیٰ اذا تاب الناس الى الاسلام نزل الحلال والحرامُ ولو نزل اوّل شيء لا تشربو االخمر لقا لو الاندع الخمر ابدًا[۱۳]۔

سب سے پہلے قرآن مجید کی وہ سورت مفصل کی نازل ہوئی جس میں دوزخ اور جنت کا ذکر تھا یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہو گئے تو حلال اور حرام نازل ہوا اور اگر پہلی مرتبہ ہی یہ حکم نازل ہوتا کہ شراب مت پیو، تو وہ کہتے ہم شراب پینا کبھی بھی نہیں چھوڑیں گے

مال غنیمت کی مثال

تدریجی عمل اصلاح کا ایک اور واضح اور کامیاب نمونہ مال غنیمت کا مسئلہ ہے۔ اسلام سے قبل دوسرے ادیان وملل میں مال غنیمت حلال نہ تھا لیکن اسلام کا ظہور اول اول جس قوم میں ہوا وہ اموال غنیمت کی بڑی دلدادہ تھی۔ ان کا حاصل کرنا ان کے لیے باعث صد فخر ومباہات تھا، ایک شاعر کہتا ہے:

عشية ولى جمعهم فتابعوا
فصار الينا نهبه، وعوانسه

اس رات ان کا گروہ بھاگا اور آگے پیچھے بھاگا چلا گیا پھر ان کا لٹا ہوا مال ومتاع اور ان کی دوشیزہ لڑکیاں ہمارے ساتھ آ گئیں۔

ایک شاعر اپنے شوق واشتیاق غنیمت کو یوں ظاہر کرتا ہے:

فلئن بقيت لارحلن بغزوة
تحوى الغنائم اويموت كريم

اگر میں زندہ رہا تو ایک ایسے غزوہ پر جاؤں گا جس میں اموال غنیمت خوب ہاتھ آئیں یا میں ایک شریف انسان کی سی موت مر جاؤں۔

مال غنیمت کی طلب کے شوق میں ان لوگوں کو اپنے بھائی بندوں اور اعزاء و اقربا کی بھی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ دشمن سے غنیمت نہیں ملتی تھی تو خود اپنے خویش و اقارب پر حملہ کر بیٹھتے تھے ایک شاعر حماسی کس فخر سے پکارتا ہے:

وکن اذا اغرن علی جناب
اغرن من الضباب علی حلول
واحیانا علی بکر اخینا
واعوزهن نهب حیث کانا
وضبة انه، من حان حانا
اذا مالم نجد الا اخانا

ہمارے گھوڑے جب قبیلہ جناب پر غارتگری کرتے ہیں اور وہاں ان کو لوٹ مار کا مال ہاتھ نہیں آتا تو وضباب اور ضبہ پر جبکہ وہ اپنے گھروں میں ہوتے ہیں غارتگری کرتے ہیں اور جس کی موت آ گئی ہے وہ تو مر ہی گیا اور کبھی ہم اپنے بھائی بکر پر بھی حملہ کر بیٹھتے ہیں جبکہ ہم اپنے بھائی کے سوا کبھی اور کو نہیں پاتے۔[۶۵]

مرد تو مرد عورتیں تک جو زم ولی اور رقت و تاثر میں ضرب المثل ہیں غنیمت حاصل کرنے کی اس درجہ گرویدہ اور شوقین تھیں کہ جنگ پر جاتے وقت مردوں کو قسم دے دیا کرتی تھیں کہ بغیر مال غنیمت کے واپس نہ آنا۔ سبعہ علقہ کا مشہور شاعر عمرو بن کلثوم کہتا ہے:

اخذن علی بعولتهن عهدا
اذالاقوا کتائب معلمینا
لیستلبن افراساً وبیضاً
واسری فی الحبال مقرنینا

ان عورتوں نے اپنے شوہروں سے عہد لیا ہے کہ جب نشان لگائے ہوئے لشکروں سے ملیں تو گھوڑے اور صیقل شدہ تلواریں لے کر لوٹیں اور رسی میں بندھے ہوئے قیدی بھی لیکر آئیں۔

ان اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے لوگ مال غنیمت اور باندی غلام حاصل کرنے کے کس قدر شوقین تھے۔ یہ شوق ان کی فطرت کا ضروری تقاضا بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ اسلام قبول

کر لینے کے بعد بھی بہت دنوں تک ان کا یہ جذبہ کم نہیں ہوا۔ جنگ احد میں مسلمانوں کو جو پسپائی ہوئی اسی شوق کی بدولت ہوئی غزوہ حنین میں بھی یہی ہوا کہ پہلے حملے سے دشمنوں کی طاقت ٹوٹنے لگی تو حدیث الاسلام اعراب غنیمت کی طرف مائل ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ بنی ہوازن کے تیر اندازوں نے اس زور سے حملہ کیا کہ لشکر اسلام میں ابتری پیدا ہو گئی۔

ان حالات میں یہ ناممکن تھا کہ غنیمت لینے سے بالکل روک دیا جاتا۔ اس لیے یہاں پر بھی وہی تدریجی عمل اصلاح کام میں لایا گیا پہلے پہل تو صرف اتنا ہوا کہ غزوۂ بدر میں بعض لوگوں نے جو مال حاصل کرنے کے لیے قیدیوں کو رہا کر دینے کا مشورہ دیا تھا ان پر عتاب نازل ہوا اور فرمایا گیا:

تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ.

تم دنیوی مال و متاع کا ارادہ کرتے ہو حالانکہ اللہ آخرت کا ارادہ کرتا ہے۔

اور پھر ارشاد ہوا:

وَلَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَا اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ.

اگر پہلے سے اللہ کا حکم نہ آ چکا ہوتا تو تم نے جو کچھ لیا ہے اس پر بڑا عذاب ہوتا۔

پھر مختلف طریقوں سے دنیوی مال و دولت کی بے ثباتی اور بے حقیقتی بیان کی گئی اور یہ امر ان کے ذہن نشین کرا دیا گیا کہ جہاد کی اصل غرض اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ مال و متاع کا حاصل کرنا نہیں۔ پھر بتایا گیا کہ اموال غنیمت میں صرف ان کا ہی نہیں بلکہ اللہ، رسول، اہل قرابت، یتیم، مسکین اور مسافروں سب کا حصہ ہے۔ اس کامیاب طریق اصلاح کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو غنیمت کا زیادہ شوق نہیں رہا اور ان کا جہاد خالصۃً لوجہ اللہ ہو گیا۔

ایک مرتبہ ایک بدوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ میں شریک ہوا، درمیان میں کچھ مال غنیمت آپ کو ملا تو آپ نے دوسرے مجاہدین کی طرح اس بدوی کا حصہ لگایا۔ بدوی کو اطلاع ہوئی تو اس نے حاضر ہو کر عرض کی کہ میں نے تو اس مال کے لیے آپ کی پیروی اختیار نہیں کی ہے (حلق کی طرف اشارہ کر کے کہا) میں تو چاہتا ہوں اس جگہ تیر کھاؤں اور شہید ہوں[۷۶]۔

اس تقریر سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہو گی کہ اسلام نے ملکی و اجتماعی احوال کی اصلاح میں بڑی حکمت عملی سے کام لیا ہے اور اس راہ میں جماعتی نفسیات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ خود قرآن مجید میں آپ کو حکم دیا گیا تھا:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ.

اور اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھے وعظ و نصیحت کے ساتھ بلاؤ۔

پس اسی قسم کے مسائل پر غلامی کو قیاس کر لیجیے۔ اول تو غلامی کا رواج عرب اور دوسرے ملکوں کی معاشرت و ذہنیت کا ایسا اہم جزو بنا ہوا تھا کہ اگر اس زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بالکل ختم کرنا بھی چاہتے تو نہ کر سکتے تھے اور پھر بعض وقتی، سیاسی دور اندیشی اور احتیاط و حزم کا اقتضاء نہ تھا کہ اس رواج کو یک قلم مٹا دیا جائے۔ ان وجوہ و اسباب کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رواج کے بالکل خاتمہ کا اعلان نہیں فرمایا لیکن اس میں چند در چند ایسی جامع اور اصولی اصلاحیں کی ہیں کہ غلامی صرف نام کی غلامی رہ گئی اور برادری و بھائی چارگی بن گئی۔

صرف اسیران جنگ غلام ہو سکتے ہیں

اس سلسلہ میں سب سے پہلے آپ نے یہ کیا کہ غلام اور باندی بنانے کے قدیم مختلف طریقوں کو مٹا کر آپ نے صرف ایک ہی طریقہ کو باقی رکھا۔ اسلام سے پہلے عام دستور تھا کہ فقر و فاقہ کے باعث یا قرض کے دباؤ میں لوگ اپنے بال بچوں کو یا خود اپنے آپ کو کسی شخص کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے اور وہ ان کو اپنا غلام بنا لیتا تھا۔ اس کے علاوہ جرم کی پاداش، یا قمار بازی میں شرط ہو جانے کی بناء پر بھی لوگوں کو غلام بنا لیتے تھے [۶۷]۔ یا یونہی چرا کر لے آتے اور زبردستی باندی غلام بنا لیتے [۶۸]۔ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ یہودیوں کے مذہب میں تو یہ نا جائز ہی نہ تھا اور عیسائیوں کے ہاں اگرچہ اس مضمون کی کوئی مذہبی روایت ہی نہ تھی۔ لیکن عملاً اچک کر غلام بنا لینے کا طریقہ عیسائیوں میں خوب رائج تھا۔

خود لارڈ کرومر جو عیسائیت کا مبلغ اعظم ہے کہتا ہے

> وہ امور جو عیسائیوں کے لیے بے حد شرمندگی کا باعث ہیں ان میں سے ایک یہ بات ہے کہ انہوں نے صرف غلام بنانے پر ہی کفایت نہیں کی بلکہ اس سے بھی زیادہ برے کام کا ارتکاب کیا۔ یعنی یہ لوگ انسانوں کو اچک کر لے جاتے اور بہ جبر غلام بنا لیتے تھے [۶۹]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلامی کی ان سب صورتوں کو سخت نا جائز اور موجب عذاب الٰہی قرار دیا اور صرف ایک صورت کو باقی رکھا یعنی وہ لوگ جو جنگ میں گرفتار کیے جائیں۔ امام کو اختیار ہے کہ اگر مقتضائے مصلحت و سیاست جانے تو ان کو باندی غلام بنا لے۔ پھر بھی یہ واضح رہنا

چاہیے کہ یہ صرف اجازت ہے حکم نہیں۔ اس کے علاوہ غلامی کی جتنی صورتیں ہیں سب قطعی حرام اور سراسر ناجائز و غیر مباح ہیں، آپ فرماتے ہیں:

قال اللہ تعالیٰ ثلاث ان خصمھم یوم القیامۃ ومن کنت خصمہ' خصمۃ رجل اعطی بی ثم غدر ورجل باع حرًّا فاکل ثمنہ ورجلٌ استاجر اجیرًا فاستوفٰی منہ ولم یعطہ اجرہ۔ (بخاری وغیرہ)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تین شخص وہ ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑوں گا اور جن سے میں جھگڑا کرونگا میں ان پر غالب آجاؤں گا ایک وہ شخص ہے جس نے میرے نام پر دیا اور پھر غدر کیا۔ دوسرا وہ شخص ہے جس نے کسی حر کو بیچ دیا اور اس کی قیمت کھا گیا۔ تیسرا وہ ہے جس نے اجرت پر کسی مزدور کو رکھا اور اس سے اپنا کام تو پورا لے لیا لیکن اس کی مزدوری اسے نہیں دی۔

ایک اور حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ تین شخص وہ ہیں جن کی نماز اللہ تعالیٰ نہیں قبول کرے گا، انہی تین میں ایک وہ شخص ہے جس نے کسی آزاد کو غلام بنالیا۔ حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں: "ورجل اعتبد محررًا" اعتبد کا مفہوم یہ ہے کہ اس کو زبردستی غلام بنالیا یا اس کو آزادی کا انکار کیا یا اس کو معلوم تھا کہ وہ آزاد ہے لیکن اس نے اس حقیقت کو ظاہر نہیں کیا اور روقت پر چپ رہا۔[1]

آزادی اصل ہے

عمرو بن العاص حضرت عمرؓ کی طرف سے مصر کے گورنر تھے وہاں انہوں نے قبطیوں پر تشدد کیا۔ کسی نے اس کی شکایت حضرت عمرؓ سے کردی تو آپ نے فوراً گورنر مصر کو تحریر فرمایا:

یا عمرو منذ کم تعبدتم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احرارًا۔[1]

اے عمرو تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنانا شروع کردیا حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے آزادی کو ہر انسان کا پیدائشی حق سمجھا ہے۔ اور اس کو اصل اور غلامی کو محض ایک امر عارض قرار دیا ہے۔ اسی بنا پر فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے اپنے متعلق غلامی کا اقرار کیا لیکن دوسرا کوئی شخص ہے جو اس سے انکار کرتا ہے۔ تو اگرچہ قاعدہ یہ ہے کہ المرء یوخذ باقرارہ (آدمی اپنے اقرار سے پکڑا جاتا ہے) لیکن اس معاملہ خاص میں خود مقر کا اپنے حق میں اعتراف بھی قبول نہ کیا جائیگا اور قول منکر کو ترجیح دی جائے گی۔

دو جزیے

اسی طرح فقہاء کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اگر کسی شخص کے قبضے میں کوئی لڑکا ہو اور وہ دعویٰ کرے کہ یہ میرا غلام ہے، تو بحکم البَیِّنَةُ لِلْمُدَّعِیْ وَالیَمِیْنُ عَلٰی مَنْ اَنْکَرَ مدعی سے گواہ طلب کیے جائینگے اور وہ ان کے پیش کرنے سے عاجز رہے گا تو غلام سے قسم لے کر اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جائیگا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں آزادی اصلی ہے اور غلامی عارضی ورنہ ایک مملوک مقبوض کے بالمقابل مالک سے گواہ طلب کرنے کے کیا معنیٰ؟

اس کے علاوہ فقہاء کا اس پر بھی اجماع ہے کے اگر دو شخصوں کو جن میں سے ایک مسلمان ہے اور دوسرا کافر۔ ایک بچہ کہیں پڑا ہوا مل گیا اور اس کے متعلق مسلمان نے دعویٰ کیا کہ میرا غلام ہے اور کافر نے کہا کہ میرا بیٹا ہے تو اس صورت میں کافر کا قول مانا جائیگا اور وہ بچہ اسی کو دے دیا جائیگا۔ فقہاء کا یہ حکم اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام کو آزادی اس قدر عزیز ہے کہ اس کے بالمقابل اس نے ایک مسلمان کی بھی پرواہ نہیں کی اور اس کا بھی خیال نہیں کیا کہ ممکن تھا وہ بچہ ایک مسلمان کے پاس رہتے رہتے خود بھی مسلمان ہو جاتا۔

جنگ کی شرعی حیثیت

اب ہم کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ جس جنگ میں گرفتار ہونے والے لوگ غلام بنائے جاسکتے ہیں اس کی شرعی حقیقت کیا ہے، کیا وہ باندی غلام حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ کیا اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ دوسری قوموں پر استعماری گرفت مضبوط کی جائے کیا اس سے غرض یہ ہے کہ دنیا میں فتنہ وفساد اور قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا جائے؟

اسلام نے صاف طور پر اعلان کر دیا ہے کہ جہاد کا مقصد کسی ملک کو حاصل کرنا یا کسی قوم کو خوانخواہ محکوم کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کی غرض وغایت یہ ہے کہ فتنہ کا سر قلم کر دیا جائے۔ اور مسلمانوں کے حقوق اس قدر محفوظ اور مستحکم ہو جائیں کہ کوئی طاقت ان کو ذلیل نہ کر سکے۔

ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ.

اور تم ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور تمام دین اللہ کے لیے ہی ہو جائے۔ پھر اگر وہ لوگ رک جائیں تو تم بھی رک جاؤ اللہ ان کے اعمال کو دیکھنے والا ہے۔

دوران جنگ میں اگر فریق مخالف آمادہ صلح ہو تو حکم ہے کہ مسلمانوں کو بھی صلح کر لینی چاہیے:

وَاِنْ جَنَحُوْ الِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ.

اگر وہ لوگ صلح پر آمادہ ہوں تو آپ بھی ہو جایئے اور اللہ پر توکل کیجیے۔

قانون جنگ کی اصل

قانون جنگ میں اصل ایک حدیث ہے جس کو سلمان بن بریدہ نے اپنے والد سے روایت کیا ہے۔ بخاری کے علاوہ ایک جماعت اس حدیث کی راوی ہے اور وہ یہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی شخص کو کسی لشکر یا ٹولی کا سردار بناتے تھے تو اس کو حکم فرماتے تھے کہ "اللہ سے ڈرتے رہنا۔ تمہارے ساتھ جو مسلمان ہیں ان سے اچھا برتاؤ کرنا"۔ پھر فرماتے "اللہ کے راستے میں اللہ کا نام لے کر جہاد کرو، جنہوں نے اللہ کے ساتھ کفر کیا ہے ان سے جنگ کرو، غزوہ کرو مگر خیانت نہ کرو، دھوکہ نہ دو، کسی کو مثلہ [1] نہ بناؤ، بچہ کو قتل نہ کرو جب تم اپنے دشمن مشرکوں سے ملو تو ان کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کو قبول کرنے کی دعوت دو۔ ان میں سے کسی ایک کو قبول کر لیں تو ان کی بات کا یقین کر لو اپنا ہاتھ ان سے روک لو، ان کو اسلام کی طرف بلاؤ۔ اگر وہ اس کو قبول کر لیں تو تم ان کی بات مان لو اور ان سے اپنے ہاتھوں کو روک لو۔ پھر تم ان سے کہو کہ وہ اپنے وطن سے دار مہاجرین کی طرف ہجرت کر جائیں۔ اگر وہ اس کو نہ مانیں تو تم ان کو بتا دو کہ ان کے ساتھ اعراب مسلمین کا سا برتاؤ کیا جائے گا اور ان کو فئے اور غنیمت میں حصہ نہیں ملے گا۔ اگر وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کریں تو ان سے کہو کہ جزیہ دیا کریں اگر وہ اس کو مان لیں تو خیر، ان کی بات قبول کر لو اور ان سے اپنے ہاتھوں کو روک لو۔ اگر وہ جزیہ ادا کرنے سے انکار کریں تو اللہ سے مدد مانگو اور ان سے جنگ کرو اور جب تم کسی قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے ہو اور وہ لوگ چاہیں کہ تم ان کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذمہ دے دو تو تم ان کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذمہ نہ دو بلکہ اپنا اور اپنے ساتھیوں کا ذمہ دے دو کیونکہ تم اپنا اور اپنے ساتھیوں کا ذمہ توڑو یہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ تم اللہ اور اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذمہ توڑو"

اس حدیث کی بنیاد پر اسلام کا جو عمومی قانون جنگ ہے اس کی چند جزئیات یہ ہیں۔

۱۔ آغاز جنگ سے قبل ضروری ہے کہ مسلمان اپنی دعوت عام ان لوگوں تک پہنچا دیں جن کو اب تک نہیں پہنچی ہے۔ اگر اس کے بغیر انہوں نے قتال شروع کر دیا تو جتنے لوگ قتل ہونگے ان کی دیتیں دینی ہونگی۔

۲۔ عورتوں اور بچوں اور گرجوں میں عبادت کرنے والوں اور صومعہ کے راہبوں کو اور سن رسیدہ لوگوں، اپاہجوں اور بیماروں کو اور ان لوگوں کو جنہوں نے جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا ہے قتل کرنا جائز نہیں۔

۳۔ غلاموں اور نوکروں اور تیمارداروں کا قتل کرنا منع ہے۔

۴۔ دھوکہ دہی اور مقتولین کو مثلہ بنانا ممنوع ہے۔ اسی طرح کسی زندہ یا مردہ کو جلانا، پھلوں کو خراب کرنا، کھیتوں کو برباد کردینا، گھروں کو آگ لگانا سامانوں کو نذر آتش کرنا، یا اس کے علاوہ اور نازیبا ہلاکت آفرین حرکات کا ارتکاب کرنا ممنوع ہے۔

۵۔ درختوں کا کاٹنا اور پانی میں زہر ملا دینا بھی ناجائز ہے [۳]۔

جہاد بے اجر

یہ بار بار فرمایا گیا ہے کہ جہاد کی اصل غرض فتنہ وفساد کا مٹانا ہونی چاہیے اس سے باندی غلاموں کا حاصل کرنا، یا مال غنیمت کے پانے کی توقع کرنا جہاد کے اجر وثواب سے محرومی کا باعث ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا "یارسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ! ایک شخص ہے جو اللہ کے راستے میں جہاد کرتا ہے اور ضمنی طور پر کسی دنیوی منفعت کا بھی خواستگار ہے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا اَجْرَ لَہٗ.

اس کے لیے کوئی اجر وثواب نہیں ہے۔

ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے اس بات کو بہت برا خیال کیا اور اس شخص سے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پھر دوبارہ حاضر ہو اور یہی سوال کر شاید کہ تو نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو سمجھا نہیں ہے، وہ شخص دوبارہ آیا اور یہی سوال کیا۔ آپ نے اس مرتبہ بھی جواب میں وہی فرمایا:

لَا اَجْرَ لَہٗ.

اس کے لیے کوئی اجر نہیں ہے۔

اس دفعہ پھر وہی صورت ہوئی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ تیسری مرتبہ اور جا شاید تو کلام نبوت کو سمجھ نہیں سکا ہے۔ وہ پھر آیا اور وہی سوال کیا۔ آپ نے اس دفعہ بھی وہی جواب دیا "اس کے لیے کوئی اجر نہیں ہے [۴]"۔

اب غور کیجیے کہ جہاد اسی وقت شروع ہوتا ہے جبکہ فتنہ کا زور و شور ہو۔ پھر مسلمان جہاد میں جاتے ہیں تو صرف اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے، کسی دنیوی منفعت کے حصول کے لیے نہیں۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ایک طرف تو بتایا جاتا ہے کہ باندی غلام صرف وہی زن و مرد ہو سکتے ہیں جو جنگ میں گرفتار کیے جائیں اور دوسری جانب یہ ہدایت ہے کہ جنگ میں شریک ہوں تو محض اللہ کے لیے۔ باندی غلام یا کسی اور منفعت دنیوی کی خاطر نہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اول تو جنگ میں لوگوں کو گرفتار کرنے کی سعی کم ہوگی اور تھوڑے بہت جو گرفتار ہو نگے بھی ان کو غلام بنانے کی خواہش نہ کریگا۔ کیونکہ ان کو ڈر یہ ہوگا کہ کہیں اس منفعت کا حصول ان کے اجر وثواب جہاد کے فقدان کا باعث نہ ثابت ہو۔ بنظر انصاف دیکھیے تو استرقاق کے باب میں یہی اصلاح کچھ کم نہیں ہے کہ اول تو غلام بنانے کی تمام راہوں کو مٹا کر اوران کو ممنوع و محظور قرار دے کر صرف ایک راہ کو باقی رکھا اور پھر اس کا بھی یہ حال ہے کہ بار بار مختلف پیرائے ہائے بیان کے ساتھ بتایا جاتا ہے کہ اس راہ پر چلنے کی غرض باندی غلام وغیرہ کا حاصل کرنا نہیں بلکہ محض خالصۃً لوجہ اللہ ہونا چاہیے[5]۔ پھر اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہے کہ اگر تمہارے دشمن آمادہ بہ صلح ہوں تو تم بھی ان سے صلح کر لو اور نتائج و عواقب کی پرواہ ذرا نہ کرو۔ اللہ پر توکل رکھو۔ ظاہر ہے مسلمانوں اور ان کے دشمنوں میں صلح ہو جائے گی تو پھر باندی غلام کیونکر مل سکیں گے؟ جیسا کہ عہد فارقی میں متعدد مرتبہ ہوا[6]۔

اسلام میں وحدت انسانی

غلاموں سے متعلق اسلام کی دوسری اہم اصلاح یہ ہے کہ اس نے غلامی کا تخیل بالکل ہی بدل دیا۔ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ یونان و روم کے فلاسفہ اور علماء بھی غلام کو ایک جسد باروح اور ایک آلۂ متحرک کہا کرتے تھے۔ اور جس طرح ہندو شودروں کو سمجھتے تھے کہ وہ برہمنوں کی خدمت کے لیے ہی پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ اقوام متمدنہ بھی یقین کرتی تھیں کہ غلام صرف آقاؤں کی خدمت کے لیے خلق ہوئے ہیں۔ اور ان کی حیثیت ایک ذاتی جاگیر (property) اور ایک پالتو جانور (chattel) سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن اسلام نے ایک غلام کو بالکل اس کے آقا کی طرح ایک صاحب حس و شعور انسان مانا ہے اور مختلف طریقوں سے اس قدیم ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا ہے جو غلاموں اور باندیوں سے متعلق ہر قوم و مذہب کے افراد میں پائی جاتی تھی۔

اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو عام انسانوں سے متعلق ہیں ان کے ماتحت غلام بھی داخل ہو جاتے ہیں اور دوسری تعلیمات وہ ہیں جو خاص غلاموں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم دونوں کو بالترتیب بیان کرتے ہیں۔

اسلام کا یہ طغرائے امتیاز ہے کہ اس نے رنگ و نسل اور قوم و وطن کے تمام امتیازات کو یک قلم اٹھا کر تمام انسانوں کو ایک برادری اور ایک جماعت سمجھا ہے ایک انسان کو کسی دوسرے انسان پر تفوق اور برتری اعمال صالحہ اور ایمان محکم کی وجہ سے تو ہو سکتی ہے لیکن امارت و ریاست، سفید فامی، کسی اچھے اور بڑے شہر سے نسبت ان میں سے کوئی ایک چیز بھی بزرگی اور شرافت کا دارومدار نہیں ہے۔ تمام انسانوں کو خطاب کر کے قرآن مجید صاف و صریح اعلان کرتا ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى.

اے لوگو ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے۔

پھر لوگوں میں جو قبائل کا اختلاف پایا جاتا ہے اس کے متعلق ارشاد ہے:

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ . (حجرات)

اور ہم نے تم کو جو مختلف قبیلوں اور گروہوں میں تقسیم کیا ہے تو اس لیے کہ ایک دوسرے سے متعارف ہو سکو ورنہ تحقیق اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم تو وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔

اسی آیت کی شرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح فرماتے ہیں:

لا فضل لِعَرَبِيٍّ علیٰ عجمی ولا لعجمی علیٰ عربیّ و لالاحمر علیٰ اسود ولا لاسود علیٰ احمر الا بالتقویٰ [۷]

نہ تو عربی کو عجمی پر فضیلت ہے اور نہ عجمی کو عربی پر اور نہ سفید فام کو سیاہ رنگ پر ترجیح ہے اور نہ سیاہ رنگ کو سفید فام پر۔ مگر ہاں فضیلت صرف تقویٰ اور طہارت کی وجہ سے ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں جو مشہور خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس میں آپ نے فرمایا:

انَّ اللّٰہ اذھب عنکم عیبۃ الجاھلیۃِ وفخرھا بالا باءِ انما ھو مومن تقیّ وفاجرٌ شَقِیّ الناسُ کُلُّھُمْ بنو ادم خلق من تراب [۸]

اللہ نے تم سے عہد جاہلیت کے غرور اور باپ دادوں پر فخر کرنے کو مٹا دیا۔ انسان اب یا تو پرہیزگار مومن ہے یا بد نصیب گنہگار ہے۔ تمام لوگ آدم کے بیٹے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں۔

وہ لوگ جو اپنی تونگری اور آقائی پر ناز کرتے ہیں اور اپنے سے کمزور اور ناتواں انسانوں کو ذلیل وحقیر سمجھنے کے عادی ہیں قرآن مجید ان کو متنبہ کرتا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ.

ہم نے انسان کو بالتحقیق محنت میں بنایا اور پیدا کیا ہے۔

یعنی انسان کو چاہیے کہ کسی وقت اس حقیقت سے غافل نہ رہے کہ علی قدر مراتب تھوڑی بہت تکلیف اور دکھ ہر ایک کو ہوتا ہے پھر اس کے بعد ارشاد ہے:

أَيَحْسَبُ أَنْ لَنْ يَقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ.

کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ کوئی اس پر قادر نہیں ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو اپنے آقائیت کے گھمنڈ میں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کو تو اپنے ماتحتوں اور غلاموں پر قدرت حاصل ہے لیکن خود اس پر کسی کو قدرت نہیں ہے۔

وحدت انسانی کی یہ عام تعلیم ہے جو آپ کو جا بجا ملے گی اور جس کا حاصل یہ ہے کہ انسان سب برابر ہیں۔ ان میں رنگ ونسل وحاکیت ومحکومیت اور آقائی وغلامی کا امتیاز کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بناء پر کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ غیر مساویانہ اور حقارت انگیز معاملہ کرے۔

غلاموں کا اسلامی تخیل

اس عام تعلیم کے علاوہ خاص غلاموں کے لیے الگ اور جداگانہ تعلیمات بھی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ غلام تمہارے بھائی ہیں ان کے ساتھ برادرانہ معاملہ کرو۔

معرور بن سوید سے روایت ہے کہ ہم مقام ربذہ میں حضرت ابوذر غفاری کے پاس حاضر ہوئے تو دیکھا کہ ان پر ایک چادر ہے اور اسی طرح کی ایک چادر ان کا غلام اوڑھے ہوئے ہے۔ ہم نے کہا کہ اگر آپ اپنے غلام والی چادر بھی خود ہی استعمال کر لیتے تو ایک پورا لباس (حلہ) ہو جاتا اور اس کو کوئی اور کپڑا پہنا دیتے۔ آپ نے فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے تھے:

اخوانكم جعلهم الله تحت ايديكم فمن كان اخوه تحت يديه فليطعم مما يا كل وليلبسه مما يلبس ولا يكلفه مايغلبه فان كلفه مايغلبه فليعنه[1]۔

تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں جن کو خداوند تعالیٰ نے تمہارے قبضہ میں کر دیا ہے۔ پس جس کا بھائی اس کے قبضہ میں ہو اسے چاہیے کہ جو خود کھائے وہ اسے کھلائے، جو وہ خود پہنے

وہ اس کو پہنائے اور اس کو ایسے کام کی زحمت نہ دے جو اس کے لیے ناقابل برداشت ہو اور اگر دے تو چاہیے کہ خود بھی اس کی امداد کرے۔

بعض روایتوں میں الفاظ یہ ہیں:

هُم اخوانكم وخَوَلكم.

یہ تمہارے بھائی بھی ہیں اور خادم بھی۔

قاضی بیضاوی نے وَقُل لِلمؤمناتِ إلىٰ قوله وماملكت ایمانهن کی تفسیر کے ماتحت لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہؓ کے پاس ایک غلام کو لے کر تشریف لائے جو آپ نے ان کو ہبہ کر دیا تھا اس وقت حضرت فاطمہؓ کے پاس اتنا چھوٹا کپڑا تھا کہ وہ اس سے سر ڈھانکتی تھیں تو دونوں پیر کھل جاتے تھے اور دونوں پیر چھپاتی تھیں تو سر کھلا رہتا تھا۔ یہ دیکھ کر آنحضرت نے فرمایا:

لیس علیک باسٌ انما هوابوک.

کوئی مضائقہ نہیں یہ شخص تو تمہارا باپ ہے۔

آپ نے دیکھا! اس غلام کو تعظیماً کس کا باپ کہا جا رہا ہے؟ سیدہ فاطمہ زہراءؓ کا جو عرب کی سب سے زیادہ شریف ونجیب خاتون ہیں اور سید العرب والعجم کی لاڈلی اور چہیتی بیٹی ہیں اور پھر اس غلام کو باپ کس نے کہا؟ خود اس ذات گرامی نے جو خاتون جنت کا پدر بزرگوار تھا اور جو ارشاد وہدایت کے موئے قلم سے تاریخ عالم کے نقش ونگار کو درست اور تہذیب واخلاق کے مٹے ہوئے نشانوں کو اجاگر کر رہا تھا۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ الف الف تحیۃ وسلام۔

غلام کو غلام مت کہو

غلام اپنے آقا کو رب کہے یا آقا اپنے غلام کو عبدی کہہ کر پکارے تو اس سے عجب وغرور کی بو آتی ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اسی لیے آپ فرماتے ہیں:

لايقولَنّ احدُ كم عبدي وامتي ولا يقولَنّ المملوك ربي وربتي. وَ ليقل المالك و فتاتيَ وليقل المملوك سيّدي وسيّدتي فانكم المملوكون والربّ اللّٰه عزّوجلّ [80]

تم میں سے کوئی "میرا غلام" یا "میری باندی" نہ کہے اور نہ غلام "میرا رب" (پروردگار)

کہے۔ مالک کو "میرے بچے" "میری بچی" کہنا چاہیے اور غلام کو چاہیے کہ "میرا سردار" یا سردارنی کہے۔ کیونکہ تم سب مملوک ہو اور رب تو سب کا اللہ تعالیٰ ہے۔[۸۱]

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو غلام تھے ایک حبشی تھا اور ایک قبطی۔ ایک مرتبہ دونوں میں گالی گلوچ ہوگئی۔ ان میں سے ایک نے دوسرے کو "یا حبشی" کہہ کر پکارا اور دوسرے نے اس کے جواب میں "یا قبطی" کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم دونوں ایسا نہ کہو، تم آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہو":

رواه الطبرانی فی الصغیر والاوسط ورجاله ثقات. (مجمع الزوائد طبع الفوائد ج۱۲ ص ۴۹۵)

اسلام میں غلاموں کے لیے جو الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں ان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلام کا تخیل غلام کے متعلق یہ ہے کہ وہ حق ولایت تو رکھتا نہیں اور اس کے علاوہ جتنے حقوق انسانی ہیں ان سب کا وہ حق دار ہوتا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن قیم فرماتے ہیں:

فَإِنَّ السَّيِّدَ حَقُّهُ فِي مَالِيَّةِ الْعَبْدِ لَا فِي إِنْسَانِيَّتِهِ.

سید کو غلام کی صرف مالیت میں حق ہے اس کی انسانیت میں نہیں۔ (اعلام الموقعین ج۱ ص ۲۵۱)

غلام کے لیے الفاظ مستعملہ

غلام کیلئے جو الفاظ بزبان اسلام بولے جاتے ہیں یہ ہیں:

مولیٰ: علامہ ابن اثیر نے نہایہ میں اس لفظ کے اتنے معنی بتائے ہیں۔

رب، مالک، سردار، انعام کرنے والا، آزاد کرنے والا، مدد کرنے والا، محبت کرنے والا، تابعدار پردیسی، چچازاد بھائی، حلیف، ہم معاملہ، داماد، آزاد کیا ہوا غلام۔ وہ جس پر انعام کیا گیا ہو۔ (ج ۴ ص ۲۴۶)

فتیٰ: اصلی معنی نوجوان ہیں، غلام اور آزاد دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اس لفظ میں یک گونہ نرمی اور محبت پائی جاتی ہے۔

خادم: خدمت کرنے والا۔ سنن ابوداؤد باب فی حق المملوک کے ماتحت جو احادیث درج ہیں ان میں سے اکثر میں غلام کے لیے خادم کا لفظ بولا گیا ہے جس سے اس کی معنوی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔ خدمت جس طرح غلام اپنے آقا کی کرتا ہے شاگرد استاد کی، بیٹا باپ کی، اور مرید اپنے مرشد کی کرتا ہے۔

عَبۡدٌ: صرف یہ ایک لفظ ایسا ہے جو "حر" کے بالمقابل بولا جاتا ہے لیکن اول تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لفظ سے غلام کو پکارنے اور بلانے سے ہی منع کر دیا ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ عبد کو اللہ کی طرف مضاف کر کے احرار پر بھی بولتے ہیں۔

جاریۃ: اصل معنی نوجوان لڑکی ہیں۔ باندیوں کے لیے یہ لفظ کثرت سے بولا جاتا ہے۔ لیکن شریف اور نوجوان لڑکیوں پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔

فتاۃ: اس کا حال بالکل "فتیٰ" کا سا ہے۔

اَمَۃٌ: باندی۔ یہ عبد کا مونث ہے اور اسلام میں اپنی باندی کو امتی کہہ کر بلانے سے منع کیا گیا ہے۔

یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے غلاموں اور باندیوں کے لیے جو الفاظ بولنے پسند کیے ہیں ان میں سے کسی سے غلام کی نسبی حقارت مترشح نہیں ہوتی اور یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غلام سب مسلمانوں سے الگ کوئی نیچ ذات ہے۔ اس کے برخلاف ہندوؤں میں شودر ایک الگ نیچ ذات ہے جس کا اطلاق کسی غیر شودر پر اس کی توہین کا سبب ہے۔ انگریزی میں غلام کو (slave) کہتے ہیں جس سے ایک بالکل الگ ذلیل طبقہ کا تصور پیدا ہوتا ہے۔[۸۲]

اسلام کی اس پیدا کی ہوئی ذہنیت کا ہی نتیجہ تھا کہ حضرت عمرؓ ایسا جلیل القدر خلیفہ بلال حبشی کو "مولانا" (ہمارے آقا) کہہ کر پکارتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ "ہمارے آقا (حضرت ابوبکر) نے ہمارے آقا (بلال) کو آزاد کر دیا۔ سلمانؓ ایک فارسی الاصل غلام تھے۔ غزوہ خندق میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس دس گز کی حدود مقرر کر دیں تو سلمانؓ کے متعلق انصار و مہاجرین دونوں میں اختلاف پیدا ہوا، انصار کہتے تھے کہ سلمان ہمارے ساتھ رہیں گے اور مہاجر کہتے تھے کہ انہیں ہم اپنے ساتھ رکھیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا، سلمان تو ہمارے خاندان کا ایک فرد ہے۔

اب اس کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رکھیے کہ یہ تعلیم مساوات اور غلاموں سے برابری کا معاملہ کرنے کی تلقین اس زمانہ میں فرمائی جا رہی ہے جبکہ عرب اور اس کے باہر غلاموں کے ساتھ نہایت ذلت انگیز اور محقرانہ معاملہ کیا جاتا تھا۔ ذیل میں ایک واقع درج کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ عین ظہور اسلام کے زمانہ میں غلاموں کی حیثیت کیا تھی۔

۶۱۱ء میں ہرقل کی تخت نشینی کے تھوڑے عرصہ بعد جب اس کی بیوی یوڈ کسیا کا انتقال ہوا اور اس کا جنازہ قبرستان کی طرف لے جایا گیا تو اتفاقاً ایک باندی نے جنازہ کے ساتھ چلتے چلتے زمین پر تھوک دیا۔ اس قصور میں وہ فوراً گرفتار کر لی گئی اور اس کے قتل کا حکم صادر ہو گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل

اوپر گزر چکا ہے کہ عرب کے لوگ جنگ میں غلام اور باندی حاصل کرنے کے کتنے شوقین تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طرز عمل سے ان کے اس شوق کو بہت کم کیا کالعدم کر دیا۔ غزوات پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ نے اکثر و بیشتر مواقع پر اسیران جنگ کے ساتھ مَنّ و فِدا کا معاملہ کیا۔

غزوۂ بدر

غزوات نبوت میں غزوۂ بدر کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس میں متعدد جلیل القدر صحابہ شہید ہو گئے تھے۔ جن کا آپ کو بڑا رنج و ملال تھا لیکن اس کے باوجود جو کفار میدان جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے آپ نے ان سے بہت رفق ولین اور لطف و مدارات کا معاملہ کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے اصحاب میں تقسیم کر دیا تھا، ابوعزیز بن عمیر جو اس جنگ میں مشرکین کا علمبردار تھا، کہتا ہے کہ میں انصار کے ایک گروہ میں تھا۔ یہ لوگ بدر سے مجھ کو ساتھ لائے تھے انصار جب اپنا شام کا اور صبح کا کھانا لاتے تھے تو خود کھجور پر گزارہ کرتے تھے اور مجھے روٹی کھلاتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے[۸۳]۔

نضر بن الحارث العبدی اور عقبہ بن ابی معیط اسلام کی دشمنی میں سب سے پیش پیش تھے اور ان کا وجود ملک کے امن و امان کے لیے سخت خطرہ کا باعث تھا۔ اس بناء پر آپ نے ان کو تو قتل کرا دیا اور ان کے علاوہ جتنے قیدی تھے ان میں سے بعض کو معاوضہ لے کر اور بعض کو بغیر معاوضہ ہی رہا کر دیا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن قیدیوں کی بلا معاوضہ رہائی کا حکم دیا تھا ان میں ابوغرۃ عمرو الجمحی بھی تھا جو عرب کا مشہور شاعر بھی تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں انتہا درجہ کی گستاخانہ نظمیں لکھ لکھ کر آپ کو اذیت پہنچاتا تھا۔

غزوۂ حنین

غزوۂ حنین میں چھ ہزار قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ آپ نے ان سب کو مقام جعرانہ میں بڑی حفاظت کے ساتھ رکھ دیا اور اس بات کا انتظار کرتے رہے کہ ان کے اعزاء و اقرباء ان

کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے آپ کے پاس آئیں ابھی آپ نے کوئی قطعی حکم نہیں فرمایا تھا کہ قبیلۂ ہوازن کے چودہ آدمی زہیر بن صرد کی زیر سرکردگی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قیدیوں کو آزاد کر دینے کی درخواست کی۔ اسی وفد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی چچا ابو برقان بھی تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد کی درخواست پر فرمایا کہ مجھ کو صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے لیکن میں تمام مسلمانوں سے ان کے لیے سفارش کرتا ہوں مہاجرین وانصار بولے" ہمارا حصہ بھی حاضر ہے"۔ اس طرح چھ ہزار قیدی یک لخت و یک قلم آزاد تھے۔(سیرۃ النبی ج ا ص ۴۹۵)

غزوۂ بنی المصطلق

اس غزوہ میں چھ سو قیدی گرفتار ہو کر آئے۔ ان میں عرب کے ایک سردار حارث کی بیٹی حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں جو ثابت بن قیس کے حصہ میں آئی تھیں انھوں نے ثابت سے کہا کہ مکاتبت کر لو۔ یعنی مجھ سے کچھ روپیہ لے کر مجھ کو آزاد کر دو۔ ثابت نے اسے منظور کر لیا لیکن حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے پاس روپیہ نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں تمہاری طرف سے زر مکاتبت ادا کر کے تم کو اپنی زوجیت میں لے لوں تو اس میں تمہاری کیا رائے ہے؟ جویریہ نے اس کو پسند کیا اور آپ نے ان سے نکاح کر لیا۔ اس نکاح کا اثر یہ ہوا کہ تمام اسیران جنگ دفعتہً آزاد کر دیے گئے مسلمانوں نے کہا کہ جس خاندان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کی ہو وہ غلام نہیں بن سکتا[84]۔

فتح مکہ

فتح مکہ کی جنگ میں بھی یہی ہوا۔ فتح کے بعد جب قریش کے بڑے بڑے سردار جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن رہے تھے اور جنہوں نے ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا تھا دوسرے کفار نابکار کے ساتھ گرفتار ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو معاف کر دیا اور کسی کو غلام یا باندی نہیں بنایا۔ وحشی بن حرب جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا، عتبہ کی بیٹی ہندہ جو فرط غضب و جوش انتقام سے بے قابو ہو کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ نکال کر چبا گئی تھی، ابو جہل کا بیٹا عکرمہ۔ جو خود بھی بڑا دشمن اسلام تھا۔ ان کے علاوہ عبداللہ بن ابی سرح، سارہ اور کعب بن زہیر جو اسلام دشمنی میں سرخیل اہل کفر و شرک تھے یہ سب رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت جان بخشی سے شاد کام ہوئے۔

غزوۂ طائف

۸ھ میں آپ نے اپنی فوج کے ساتھ طائف کا محاصرہ کیا اور مشرکین کے جتنے غلام آپ کے پاس آئے آپ نے سب کو آزاد کر دیا۔

حضرت ابن عباسؓ کے الفاظ یہ ہیں:

اعتق صلی اللہ علیہ وسلم یوم الطائف کلّ من خرج الیہ من رقیق المشرکین.

طائف کے دن مشرکوں کے جتنے غلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے آپ نے سب کو آزاد کر دیا۔

اور صرف ان کے آزاد کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان آزاد شدہ غلاموں سے ایک ایک کو ایک ایک مسلمان کے سپرد کیا کہ وہ اس کے اخراجات کا متحمل ہو۔ ودفع کلّ رجل منھم الیٰ رجل من المسلمین یمونہ چنانچہ ابوبکرہ عمرو بن سعیدؓ کو ازرق خالدؓ بن سعید کو وردان ابانؓ بن سعید کو یحنال عثمانؓ بن عفان کو یسار سعدؓ بن عبادہ کو اور ابراہیم اسیدؓ بن حضر کو سپرد کر دیے گئے۔ اور ان کے متعلق مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ انہیں قرآن مجید پڑھائیں اور سنن کی تعلیم دیں۔

پھر جب ثقیف کے لوگ مسلمان ہو گئے تو ان کے زعماء نے چاہا کہ ان آزاد کردہ غلاموں کو ان کی غلامی میں واپس دے دیا جائے لیکن حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اُولٰئک عُتَقَاءُ اللّٰہِ لا سبیل الیھم [۵۵]

یہ اللہ کے آزاد کردہ ہیں اب ان پر کوئی زور نہیں چل سکتا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ مکہ کے چالیس آدمیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ (رضی اللہ عنہم) پر فجر کی نماز کے وقت حملہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو گرفتار کر لیا اور پھر آزاد کر دیا [۵۶]۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجد کی طرف ایک لشکر روانہ کیا۔ یہ واپس آیا تو قبیلہ بنو حنیفہ کا ایک شخص جس کا نام ثمامہ بن اثال تھا۔ اپنے ساتھ گرفتار کر کے لایا۔ ثمامہ اہل یمامہ کا سردار تھا۔ صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے اس کو ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو ثمامہ کو دیکھ کر فرمانے لگے۔ ثمامہ بول تیرے پاس کیا ہے؟ اس نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو اختیار ہے: اگر آپ قتل کریں گے

تو ایک ایسے شخص کو قتل کریں گے جو واجب الدم ہے، اگر آپ احسان کرینگے تو ایسے شخص کے ساتھ احسان کرینگے جو آپ کا شکر گزار رہے گا۔ اس کے علاوہ اگر آپ مال چاہتے ہیں تو کہیے جتنا مال آپ طلب کریں گے دے دیا جائے گا۔ آپ نے حکم دیا، "ثمامہ کو رہا کر دیا جائے"۔ آزاد ہونے کے بعد یہ مسجد کے قریب ایک نخلستان تھا، وہاں آیا غسل کیا اور مسجد میں داخل ہو کر کلمہ توحید پڑھا اور مشرف با اسلام ہوا[87]۔

صلح حدیبیہ میں ستر قیدی ہاتھ آئے۔ آپ نے ان کو بغیر کسی معاوضہ اور شرط کے آزاد کر دیا[88]۔

۰۶ھ میں آپ نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی زیر سرکردگی میں چالیس آدمیوں کی ایک جماعت جموم کی طرف روانہ کی جس نے قبیلہ مزنیہ کی ایک عورت حلیمہ اور اس کے شوہر کو گرفتار کر کے آپ کی خدمت میں حاضر کیا۔ آپ نے میاں بیوی دونوں کو آزاد کر دیا[89]۔

اسی سنہ کے ماہ جمادی الاخریٰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید رضی اللہ عنہ بن حارثہ کی زیر قیادت ایک اور لشکر حسمٰی کی طرف روانہ کیا اور اس نے بھی متعدد لوگوں کو گرفتار کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو ان لوگوں کے مال واپس کرا دیے اور قیدیوں کو رہائی کا حکم دے دیا[90]۔

سلمہ بن اکوع کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ کو چند آدمیوں کے ساتھ بنو فزارہ کے مقابلہ میں بھیجا۔ قتل و قتال میں مسلمانوں نے بنو فزارہ کی ایک عورت اور اس کے ساتھ اس کی ایک بیٹی کو جو عرب کی حسین لڑکیوں میں سے تھی گرفتار کیا۔ ابو بکر نے وہ لڑکی سلمہ بن اکوع کو دیدی۔ سلمہ اس کو لیے ہوئے مدینہ آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! سلمہ یہ لڑکی تو مجھے دے دے۔ سلمہ اس وقت تو خاموش ہو گئے لیکن دوسرے دن حاضر ہو کر وہ جاریہ آپ کو ہبہ کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مسلمان قیدیوں کا فدیہ بنا کر مکہ بھیج دیا اور اس طرح وہ آزاد ہو گئی[91]۔

اس طرح کے واقعات کثیر ہیں ان سب کا ذکر باعث طوالت ہوگا۔ حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام غزوات و سریات پر نظر ڈالنے سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے اکثر و بیشتر مواقع پر مختلف عنوانات سے اسیران جنگ کو غلام نہیں بنایا اور ان کو رہا کر دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض موقعوں پر استرقاق بھی عمل میں آیا ہے لیکن اس کی وجہ وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ یعنی اس عہد کا عام دستور اور رسم استرقاق کو یک قلم مٹا دینے پر لوگوں کا رضامند نہ ہونا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرز عمل

حضرت عمرؓ جو شریعت کے رمز داں تھے اس نکتہ کو سمجھتے تھے، چنانچہ آپ نے اپنے عہد میں اس رواج میں زبردست اصلاح کی۔ مولانا شبلی الفاروق میں لکھتے ہیں کہ

"حضرت عمرؓ نے اگرچہ غلامی کو معدوم نہیں کیا اور شاید اگر کرنا بھی چاہتے تو نہیں کر سکتے تھے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے مختلف طریقوں سے اس رواج کو کم کر دیا اور جس قدر قائم رکھا اس خوبی سے رکھا کہ غلامی غلامی نہیں بلکہ برادری اور ہمسری رہ گئی"۔

عرب سے غلامی کا خاتمہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عنان خلافت ہاتھ میں لیتے ہی حکم دیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں قبائل مرتدہ کے جو لوگ لونڈی غلام بنائے گئے تھے سب آزاد کر دیئے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ اصول قائم کر دیا کہ اہل عرب کبھی غلام نہیں بنائے جا سکتے[۹۲]۔

عہد جاہلیت کے غلاموں کی آزادی

اس کے علاوہ وہ لوگ جو عہد جاہلیت میں گرفتار کر کے غلام بنا لیے گئے تھے اور انہوں نے زمانہ اسلام کو پایا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی کہ وہ اپنی قیمت اپنے مولیٰ کو ادا کر دیں اور آزاد ہو جائیں۔ یعنی آقا خواہ راضی ہو یا نہ ہو بہرحال غلام مکاتب سمجھا جائے گا اور بدل کتابت ادا کر کے آزاد ہو جائیگا[۹۳]۔

ذمی غلام نہیں ہو سکتا

امام بخاری نے ایک باب کا ترجمہ باندھا ہے:

لَا يُسْتَرَقُّ اهل الذمة.

ترجمہ: یعنی ذمی لوگوں کو غلام نہیں بنایا جا سکتا۔

اس ترجمہ کے ماتحت ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "میں ذمی کے متعلق اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ کو یاد دلاتا ہوں" حافظ ابن حجر نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اگر ذمی عہد شکنی کریں اور ان سے جنگ ہو تب بھی ان کو غلام نہیں بنایا جا سکتا[۹۴]۔

ام ولد کی بیع

حضرت عمرؓ کے عہد سے پہلے ام ولد کی یعنی وہ باندی جس کے بطن سے اس کے آقا کا بچہ پیدا ہوا ہو بیع وشراء ہوتی تھی لیکن آپ نے اپنے عہد خلافت میں اس کو بالکل بند کر دیا۔ جابرؓ بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس حکم کے بعد ہم سب نے امہات الاولاد کی بیع وشراء سے توبہ کر لی[95]۔ اس کی تفصیلی بحث آگے آئے گی۔

عبد سے مکاتبت کرنا واجب ہے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غلامی کا خاتمہ کرنے کے لیے دوسری تدبیر یہ کی کہ قرآن مجید میں غلاموں کے متعلق جو حکم دیا گیا ہے کہ فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا۔ غلاموں سے مکاتبت کر لو اگر تم ان میں بھلائی جانتے ہو تو حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ کاتبوہم میں صیغہ امر وجوب کے لیے ہے۔

جنگ کی فتوحات کے وقت حضرت عمرؓ کا عام طرز عمل

پھر سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد میمنت مہد میں عراق وشام کے اور مصر کے بڑے بڑے علاقے فتح ہوئے اور ان جنگوں میں جو لوگ گرفتار کیے گئے ان کی تعداد لاکھوں سے متجاوز تھی لیکن ایک دو جگہوں کے علاوہ کہیں پتہ نہیں چلتا کہ آپ نے اسیران جنگ کو غلام بنایا ہو۔ شام کے شہروں میں سے بصریٰ، فحل، حمص، دمشق، عسقلان، انطاکیہ اور طبریہ فتح ہوئے جہاں عیسائی رہتے تھے اور مسلمانوں سے بڑے زور شور سے لڑے تھے لیکن ان میں غلامی کا بہت کم پتہ چلتا ہے۔ اکثر مقامات پر یہی ہوا ہے کہ دشمنوں نے مسلمانوں کو غالب ہوتے ہوئے دیکھا تو فوراً صلح کر لی اور مسلمانوں نے ان کو جان و مال کی امان دے دی۔

شام کے علاقوں میں غالباً صرف قیساریہ ایک شہر ہے جہاں واقدی کی روایت کے مطابق چار ہزار آدمی غلام بنائے گئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا تو آپ نے انہیں انصار کے یتیم بچوں پر تقسیم کر دیا اور بعض کو مسلمانوں کی مختلف خدمات مثلاً کتابت وغیرہ پر مقرر کر دیا[96]۔

صامغان، دراباز جند یسا پور اور شہر زور میں جو معاہدہ ہوا تھا اس میں صاف نظر الفاظ یہ تھے:

لا يقتلوا ولا يسبوا ولا يمنعوا طريقا يسلكونه. (فتوح البلدان ص ۳۲۹)

ان کو نہ قتل کیا جائیگا نہ وہ باندی غلام بنائے جائینگے اور نہ اس راہ سے روکے جائیں گے جس پر وہ چل رہے ہوں۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبداللہ کی روایت ہے کہ مصر کا معاملہ لوگوں پر مشتبہ ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ بزور شمشیر فتح ہوا تھا اور کسی کا خیال ہے کہ صلحاً فتح کیا گیا تھا۔ اصل یہ ہے کہ اہل مصر نے مسلمانوں کو غالب آتے ہوئے دیکھا تو مصالحت کی درخواست کی چنانچہ عمرو بن العاص نے جو صلح نامہ تحریر فرمایا اس کے الفاظ یہ تھے:

لا تباع نسائهم ابنائهم ولا يسبوا وان تصر اموالهم و كنوز هم في ايديهم عليٰ۔

ان کی عورتوں کو اور بیٹوں کو نہ بیچا جائے گا اور نہ ان کو باندی غلام بنایا جائیگا اور ان کے اموال اور خزانے ان کے قبضہ میں ہی چھوڑ دیے جائینگے۔

سکندریہ کی جنگ بڑی سخت تھی، مسلمانوں نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی قیادت میں تین ماہ تک محاصرہ کرنے کے بعد اس کو فتح کیا تھا۔ لیکن یہاں جو لوگ گرفتار ہوئے ان میں سے کسی کو غلام بنایا گیا اور نہ قتل کیا گیا، ذمی بنا کر چھوڑ دیے گئے۔ (فتوح البلدان ص ۲۲۲)

مصر کے بعض دیہات کے آدمی جو مسلمانوں سے لڑے تھے غلام بنا کر مدینے بھیجے گئے تو حضرت عمرؓ نے ان کو واپس کر دیا اور انہیں ذمی بنا لیا۔ بلاذری کی عبارت یہ ہے:

وقع سبائهم بالمدينة فردهم عمر ابن الخطاب وصيرهم وجماعة القبط اهل ذمة۔

ان کے قیدی مدینہ میں آئے تو حضرت عمر بن الخطاب نے ان کو لوٹا دیا اور انکی قبطیوں کو ذمی کرلیا۔ (فتوح البلدان۔ ص ۲۲۳)

عراق و شام کے بعض علاقے بزور شمشیر فتح ہوئے تو اسلامی فوج نے اصرار کیا کہ باشندوں کو غلام بنا لیا جائے اور زمین کو تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اس پارٹی کے لیڈر تھے لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، طلحہ رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور انصار کے تمام اکابر اس پالیسی کے خلاف تھے۔ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سخت مخالف تھے۔ آپؓ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا "میری رائے یہ ہے کہ زمین کو اس کے غیر مسلم باشندوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دوں۔ ان کی زمین پر خراج اور ان کی گردنوں پر جزیہ مقرر کر دوں اور اس طرح یہ

زمین مسلمانوں کے سپاہیوں بال بچوں اور آئندہ نسلوں کیلئے فے کے حکم میں ہو جائے۔ اب کیا آپ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ان غلاموں کو لوگوں کی ذاتی ملک بنا دیا جائے۔ کیا آپ کے نزدیک شام، الجزیرہ، کوفہ، بصرہ اور مصر جیسے بڑے بڑے صوبوں کو تقسیم کر دینا ضروری ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو بڑے لوگوں کے وظائف اور غرباء کے روز ینے کہاں سے آئیں گے [۹۸]؟

مہلب بن ابی صفرہ کہتے ہیں کہ ہم نے مناذر [۹۹] کا محاصرہ کیا اور وہاں کے لوگوں کو گرفتار کر کے لونڈی غلام بنا لیا۔ حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے لکھا:

ان مناذ کقریة من قری السواد فردوا علیھم ما اصبتم [۱۰۰]۔

تحقیق مناذر ارض سواد کے ایک گاؤں کی طرح ہے اس لیے تم نے جو کچھ لیا ہے اسے واپس کر دو۔

پھر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ مناذر کے لوگ مجوسی یعنی آتش پرست تھے لیکن اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے ان کے ساتھ اہل کتاب کا سا معاملہ کیا اور ان کو ذمی بنا کر رکھا۔ مناذر کے گورنر کے نام حضرت عمرؓ نے جو فرمان ارسال کیا تھا اس میں یہ صاف لکھا ہوا تھا:

خذ ممن قبلک من المجوس الجزیة فان رسول اللہ صلی علیه وسلم اخذ الجزیة من مجوس ہجر۔ (کتاب الخراج مطبوعه مصر ص ۱۲۹)

تمہاری طرف جو مجوسی ہیں ان سے جزیہ لو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد حضرت عمرؓ کے طرز عمل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غلام بنانے کی رسم کو کبھی بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا، اس کو رفع کرنے کے لیے تدریجی عمل اصلاح کے مطابق جو تدبیر ہو سکتی تھی اس سے دریغ نہیں کیا گیا۔

وسائل حریت و آزادی

اب دیکھو کہ جو لوگ اباحت استرقاق سے فائدہ اٹھا کر باندی یا غلام رکھتے ہیں اور اس سے احتراز نہیں کرتے ان کو کس کس طرح ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ باندیوں اور غلاموں کو آزاد کردیں۔

افضل قربات

اس سلسلہ میں ایک عام اور مشہور حدیث ہے کہ:

من اعتق نسمۃً اعتق اللّٰہ لکل عضوٍ منھا عضوًا من النار. (متفق علیہ من حدیث ابی ہریرہ)

جو شخص کسی ایک نفس کو آزاد کریگا۔ اللہ تعالیٰ اس کے ہر ہر عضو کو عبد معتق کے ہر ہر عضو کے بدلے میں دوزخ سے آزاد کریگا۔

بعض روایتوں میں اس کے ساتھ حتیٰ فرجہٗ بفرجہٖ کے لفظوں کا بھی اضافہ ہے اور اسی بنا پر فقہاء نے کہا ہے کہ مرد کو غلام اور عورت کو باندی آزاد کرنی چاہیے۔ لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ فقہاء کا یہ ارشاد محض حدیث کے ظاہری الفاظ کی رعایت پر مبنی ہے۔ ورنہ مقصد یہ نہیں ہے کہ مرد باندی کو اور عورت غلام کو آزاد کرینگے تو انہیں کم ثواب ملے گا۔ علامہ حسین آفندی نے اپنی کتاب رسالہ حمیدیہ میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد قوسین میں لکھا ہے:

کذلک فی عقود الجواھر المنیفۃ عن حمادٍ عن ابراھیم قال وھذا احکمُ حکم المرفوع انتھٰی

ایسے ہی عقود الجواہر المنیفہ میں حماد سے اور انہوں نے ابراہیم سے روایت کی ہے اور فرمایا ہے کہ اس کا حکم حدیث مرفوع کا سا ہے۔

قرآن مجید کی سورۂ بقرہ میں جہاں ایمان اور اعمال صالحہ کو بیان کیا گیا ہے غلام کے آزاد کرنے کو نماز، روزہ سے مقدم رکھا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ.

لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے کہ جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور پیغمبروں پر اور مال کی محبت کے باوجود اس کو خرچ کرے رشتہ داروں پر اور یتیموں پر محتاجوں اور مسافروں پر اور مانگنے والوں پر اور نیز خرچ کرے گردنیں چھڑانے پر اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے۔

فِي الرِّقَابِ کا مطلب یہ ہے کہ جہاں اور بڑے بڑے عمل ہیں ان میں ایک بڑا عمل نیک یہ بھی ہے کہ مال غلاموں کو آزادی دلانے میں خرچ کیا جائے۔ خواہ اس کی صورت یہ ہو کہ (یعنی وہ غلام جس سے اس کے آقا نے کچھ روپیہ ادا کرنے کے بعد آزاد کر دینے کا وعدہ کیا ہے) کو بدل کتابت ادا کرنے میں مدد دی جائے۔ یا کوئی شخص اسیر ہے اس کا زرفدیہ ادا کرکے اسے آزاد کرا لیا جائے اور ایک تیسری صورت یہ ہے کہ غلام اس نیت سے خریدے جائیں کہ ان کو آزاد کر دیا جائیگا[102]۔

پھر سورہ بلد میں یوں ارشاد ہے:

وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ.

اور تم کو کس نے بتایا ہے کہ گھاٹی کیا ہے؟ چھڑانا گردن کا یا بھوک کے دن میں کسی بھوکے کو کھانا کھلانا۔

حضرت براءؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت والا مرتبت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ مجھ کو کوئی ایسا عمل بتا دیجیے جو جنت میں داخل کر دے۔ آپ نے فرمایا:

اَعْتِقِ النسمةَ وفُكَّ الرقبةَ.

تو غلام کو آزاد کر اور گردن چھڑا۔

اعرابی نے پوچھا: کیا "عتقِ نسمة" اور "فکِّ رقبة" دونوں ایک نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا نہیں عتقِ نسمة تو یہ ہے کہ تم خود کوئی غلام آزاد کرو اور فکِّ رقبہ یہ ہے کہ کسی غلام کی گلو خلاصی میں اس کی مدد کرو[103]۔

ان آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی بناء پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ غلام کو آزاد کرنا تمام صدقات ومبرات سے افضل ہے [1] علامہ عبدالوہاب شعرانی اس مسئلہ کو لکھ کر فرماتے ہیں کہ یہ وہ مسئلہ ہے جس کو میں نے مسائل متفق علیہا میں سے پایا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید کی سورۂ بقرہ میں غلام کے آزاد کرنے کا ذکر نماز روزہ سے اور سورۂ بلد میں مساکین کو کھانا کھلانے سے مقدم لایا گیا ہے۔ محض تقدیم فی الذکر فضیلت کی دلیل نہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وجوہ فضیلت میں سے ضرور ہے [2]۔

ان ترغیبات عتق پر سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود عامل تھے۔ اور آپ کے بعد صحابہ میں جو جتنا متمول ہوتا تھا اسی قدر غلام زیادہ آزاد کرتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موالی

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے موالی میں زید بن حارثہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ترین غلام تھے۔ یہاں تک کے لوگ ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لے پالک بیٹا بھی کہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کیا اور اپنی چچازاد بہن زینب سے ان کا نکاح کر دیا۔

ثوبان

آپ نے ان کو بھی آزاد کر دیا تھا لیکن خانۂ رسالت کی جاروب کشی ان کے جسم میں اس درجہ سرایت کر گئی تھی کہ آزاد ہونے کے بعد بھی اس در کو نہ چھوڑا۔

ابو رافع

ان کے نام میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں اسلم اور بعض کا خیال ہے کہ ان کا نام ابراہیم تھا۔ عباس بن عبدالمطلب کے غلام تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں آزادی عطا فرما دی۔

سلمان فارسیؓ

کنیت ابو عبداللہ تھی۔ اصبہان کے قریہ رامہرمز میں رہتے تھے قبیلۂ کلب کے بعض لوگوں نے ان کو گرفتار کر لیا جن سے وادی القریٰ کے قرب وجوار میں ایک یہودی نے ان کو خرید لیا۔

سلمانؓ نے اس سے مکاتبت کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض دوسرے بزرگوں نے ان کی اعانت کی اور یہ آزاد ہو گئے۔

ابو کبشہ

ابو کبشہ کنیت اور نام سلیم تھا مکہ کے موالی میں سے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا۔

ابو ضمیرہ

ایران کے بادشاہ گشتاسپ کی اولاد میں سے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی خرید کر آزاد کر دیا۔

یسار

یونانی تھا، کسی غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مل گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی آزاد کر دیا۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم طائف کا محاصرہ کیے ہوتے تھے، چار غلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو آزاد کر دیا۔ ان میں ایک غلام کا نام ابو بکرہ تھا۔ لوگوں نے کہا بھی کہ یہ غلام غلامی کی مصیبت سے تنگ آ کر بھاگ آئے ہیں لیکن آپ نے ان کی بات نہ مانی اور ان چاروں غلاموں کو آزادی دے دی۔

رویفع

مرینہ کے لوگوں میں تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی خرید کر آزاد کر دیا تھا[106]۔

ریحانہ کا واقعہ

تاریخ سے صرف دو باندیوں کے متعلق پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے تسری کی تھی۔ ایک ماریہ قبطیہ ہیں جن کو مقوقس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بطور ہدیہ بھیجا تھا۔ آپ کے صاحبزادہ ابراہیم انہی سے پیدا ہوئے تھے۔

دوسری جاریہ کا نام ریحانہ بنت زید بن خناقہ ہے لیکن ان کے متعلق بڑا اختلاف ہے عام تاریخوں میں تو یہی مذکور ہے کہ غزوۂ بنو قریظہ میں جو عورتیں گرفتار ہو کر آئیں تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے لیے منتخب فرما لیا اور چاہا کہ آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیں لیکن ریحانہ نے کہا کہ میرے اور آپ کے دونوں کے لیے آسانی اسی میں ہے کہ میں آپ کی ملک یمین رہوں لیکن مشہور "مورخ عمادالدین ابن کثیر" نے اپنی تاریخ البدایۃ والنہایۃ میں متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ریحانہ نے پہلے پہل تو یہودی مذہب پر ہی قائم رہنے کا ارادہ کیا اور ممکن ہے کہ اسی بناء پر انہوں نے آنحضرت سے نکاح نہ کرنا چاہا ہو لیکن کچھ عرصہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے اور اسلامی تعلیمات کو دیکھنے اور سمجھنے کے باعث انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ چنانچہ ان کے ساتھ بالکل ازواج مطہرات کا سا برتاؤ ہوتا تھا۔ ابن کثیر نے خود ریحانہ کے الفاظ نقل کیے ہیں:

وکان یُقَسِّمُ لی کما یقسم لنسائِہ وضرب عَلَیَّ الحجاب.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو ازواج مطہرات کی طرح حصہ دیتے تھے اور مجھ سے پردہ بھی کراتے تھے

اور صرف یہی نہیں بلکہ آپ نے ان کا مہر بھی وہی مقرر کیا جو اور ازواج مقدسات کا تھا یعنی بارہ اوقیہ [۱۰۷]۔ صاحب زرقانی نے ابن سعد کی جو روایت نقل کی ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ریحانہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا تھا [۱۰۸]۔

رہا روایتوں کا اختلاف، تو چونکہ اصل واقع میں دونوں چیزیں موجود ہیں۔ یعنی شروع شروع میں ریحانہ رضی اللہ عنہا نے واقعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کرنے پر رضامندی کا اظہار نہیں کیا اور آخیر میں راضی ہو گئیں، اس بناء پر دونوں روایتوں میں بڑی آسانی کے ساتھ تطبیق دی جا سکتی ہے۔ اس سے قطع نظر درایت اور قیاس بھی واقعہ نکاح کی تائید کرتے ہیں۔ جیسا کہ روایتوں سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ریحانہ رضی اللہ عنہا سے محبت تھی اور وہ جنگ بنو قریظہ میں گرفتار ہو کر آئیں تھیں۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا اور صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی اسی طرح کے واقعات پیش آئے تھے۔ ان روایات کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عادت مبارکہ کے مطابق ریحانہ رضی اللہ عنہم پر اسلام پیش کیا ہو گا، ریحانہ

رضی اللہ عنہا کو اپنے پہلے متوفی شوہر سے محبت تھی اس لیے انہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن چندروز کی معیت کے بعد جب آفتاب رسالت کی پاکیزہ شعاعوں نے یاس وناامیدی کی ظلمتوں کو مٹا کر ولولہ امید کی روشنی سے معمور کر دیا، تو وہ بخوشی اسلام لے آئیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آزاد کر کے اپنے حرم ازواج میں قبول فرمالیا۔

ہمارے خیال میں صحیح یہی ہے۔ جن راویوں نے نکاح نہ ہونے کی روایت بیان کی ہے ان کو صرف ابتدائی واقعات کا ہی علم ہو سکا۔ اس کے برعکس نکاح کی جو روایتیں ہیں وہ خود جناب ریحانہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہیں۔ اب صرف ایک حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا رہ جاتی ہیں جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسری کی تھی۔

یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جنگ میں عرب کی خوبصورت اور امیروں کی بیٹیاں گرفتار ہو کر آتی تھیں اور اگر آپ چاہتے تو ان سب کے ساتھ تسری کر سکتے تھے لیکن آپ نے اس کو گوارا نہیں کیا یا تو ان کو بالکل ہی آزاد کر دیا یا ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیے۔ جیسا کہ حضرت جویریہؓ اور صفیہؓ کے واقعات میں ہوا۔ ریحانہ رضی اللہ عنہا کے متعلق آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے نکاح کرنا چاہتے تھے لیکن وہ خود اس کے لیے رضامند نہیں ہوئیں تو آپ نے بھی اس پر کچھ زیادہ اصرار نہیں کیا مگر بعد میں وہ خود راضی ہو گئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کر لیا۔ رہیں حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا تو ظاہر ہے کہ ان کو نہ آپ نے کسی جنگ میں گرفتار کیا تھا اور نہ آپ نے خود ان کو کسی سے خریدا تھا، بلکہ مقوقس نے انہیں بطور ہدیہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا تھا۔

غرض یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استرقاق اور تسری کو صرف اباحت وقتی کی حد تک باقی رکھا ہے۔ ورنہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کلیۃً اس سے اجتناب فرماتے تو استرقاق قطعی طور پر حرام ہو جاتا جو کہ اس وقت ملک کی معاشرت اور وہاں کے سیاسی واقتصادی احوال کے پیش نظر قرین مصلحت نہ تھا، جیسا کے احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز تراویح بہت مرغوب تھی لیکن اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر مداومت محض اس خیال سے نہیں کی کہ کہیں وہ امت پر فرض نہ ہو جائے۔

صحابہ (رضی اللہ عنہم) کا عمل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے اتباع میں صحابہ کرام بھی اپنی اپنی حیثیت اور مقدرت کے مطابق غلام خرید خرید کر آزاد کرتے تھے اور اس کو بہت زیادہ کار ثواب جانتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ مالدار تھے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام اور باندی محض آزاد کرنے کے لیے کثرت سے خریدیں۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

بلال بن رباح رضی اللہ عنہ

امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ اسلام لائے تو امیہ ان پر طرح طرح کے مظالم کرنے لگا۔ یہاں تک کے انہیں جلتی ریت پر لٹا دیتا اور سینہ پر ایک بھاری پتھر رکھ دیتا تھا لیکن شبستان نبوت کی شمع جاں فروز کا یہ پروانہ ان سختیوں سے کیا ڈرتا وہ اس وقت بھی اَحَدٌ اَحَدٌ پکارتا رہتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ حالت دیکھی تو بلبلا اٹھے اور اپنے کافر غلام کے بدلے میں بلال رضی اللہ عنہ کو لے کر آزاد کر دیا۔

عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ

طفیل بن عبداللہ ازدی کے غلام تھے۔ اسلام قبول کرنے کے باعث ان پر بڑے بڑے سنگین مظالم ہوتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوری قیمت ادا کر کے ان کو خرید لیا اور آزاد کر دیا۔ حضرت عامر رضی اللہ عنہ پر اس احسان کا یہ اثر ہوا کہ آزادی کے بعد بھی مدت العمر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا دامن نہیں چھوڑا اور آپ کی بکریاں چراتے رہے۔

ابوفکیھہ رضی اللہ عنہ

بلال کی طرح یہ بھی امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ امیہ ان کے پاؤں میں رسی باندھ کر کھینچتا ہوا جلتی بھمل پر لے گیا۔ پڑے جھلس رہے تھے کہ جعل نامی ایک شخص ادھر آ نکلا امیہ نے اس کی طرف اشارہ کر کے ابوفکیھہ سے پوچھا "تمہارا خدا یہ ہے کہ نہیں؟" ابوفکیھہ بولے کہ میرا اور اس کا تینوں کا خدا ایک ہے اور وہ واحد لاشریک لہ ہے۔ امیہ نے یہ سنتے ہی نہایت سختی سے ان کا گلا گھونٹا۔ امیہ کا بھائی ابی کھڑا دور سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا اور کہتا جاتا تھا۔ "ہاں اور زور سے جب

تک کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خود آ کر اسے اپنے جادو سے نہ چھڑائیں نہ چھوڑنا" امیہ نے اپنے بھائی کے بڑھاوے سن کر اس زور سے گلا گھونٹا کہ دونوں کو ان کے مرنے کا یقین ہو گیا اور وہ مردہ جان کر انہیں تنہا چھوڑ چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو ان میں جان باقی تھی۔ ارادہ کیا کہ تازہ دم ہو کر پھر زدوکوب کریں، اتفاقاً حضرت ابوبکرؓ کا ادھر سے گزر ہوا۔ ابو فکیهه کی اس مظلومیت کو دیکھ کر دل پسیج اٹھا۔ فوراً ان ظالموں سے خرید اور آزاد کر دیا۔

زنیرہ رضی اللہ عنہا

اس کی نسبت بعضوں کا خیال ہے کہ بنی عدی کی اور بعض کہتے ہیں بنی مخزوم کی لونڈی تھی۔ ابوجہل اس پر سخت سے سخت مظالم کرتا تھا، یہاں تک کہ اس کی دونوں آنکھیں جاتی رہیں۔ ابوجہل یہ دیکھ کر بولا "اب تو تجھ پر لات وعزیٰ کی مار پڑی!" زنیرہ نے کہا کہ لات وعزیٰ کو تو اپنے پوجنے والوں کی بھی خبر نہیں ہے، یہ سب تقدیر سماوی ہے اور خدا کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ پھر مجھے دوبارہ آنکھیں عطا فرما دے، خدا کی شان ایسا ہی ہوا صبح کو اٹھی تو دونوں آنکھیں روشن تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کو بھی خرید کر لوجہ اللہ آزاد کر دیا۔

لبینہ رضی اللہ عنہا

یہ بنی مول بن صہیب یعنی حضرت عمرؓ کے گھرانے کی جاریہ تھی۔ حضرت عمرؓ کے مسلمان ہونے سے قبل مشرف باسلام ہو چکی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس پر جبر وتشدد کرتے اور جب مارتے مارتے بے دم کر دیتے تو چھوڑ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ جب تک عاجز نہ کر لونگا نہ چھوڑوں گا۔ وہ جواب دیتی اگر تم اسلام نہ لائے تو خدا تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرے گا۔ حضرت ابوبکرؓ کو اس کی مظلومیت پر رحم آیا اور مول لے کر آزاد کر دیا۔

نہدیہ رضی اللہ عنہا

بنو عبدالدار کی ایک عورت کے قبضہ میں تھی، وہ اس پر سختیاں کرتی اور کہتی تھی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یاروں میں سے کسی نے تجھے خرید لیا تو خیر، ورنہ میں تجھ کو ہرگز نجات نہ دونگی۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ سنا تو اس کو خرید کر آزاد کر دیا۔

ام عبیس

بنی زہرہ کی لونڈی تھی۔ اسود بن عبد یغوث اس پر طرح طرح کے ظلم کرتا تھا۔ صدیق اکبر نے اس کو بھی خرید کر کے آزاد کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی عادت تھی کہ ہمیشہ ضعیف و کمزور غلاموں کو خرید خرید کر آزاد کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے والد ابو قحافہ نے کہا کہ آپ کو غلام آزاد کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو بجائے اپاہج اور کمزور غلاموں کے خوب مضبوط و توانا غلام کیوں آزاد نہیں کرتے جو جنگ یا کسی اور اعانت کے موقع پر کام آئیں۔ آپ نے جواب دیا کہ میں جن غلاموں کو آزاد کرتا ہوں اگرچہ وہ دنیا میں کمزور و ناتوان ہیں لیکن یہی لوگ میرے لیے قیامت میں طاقت و قوت کا باعث ہوں گے۔ (ثانی اثنین)

حضرت عثمانؓ

حضرت ابوبکرؓ کی طرح حضرت عثمان ذوالنورینؓ بھی بااقتدار صحابہ میں سے تھے۔ چنانچہ آپؓ بھی کثرت سے غلام آزاد کیا کرتے تھے۔ آپ کے حالات میں لکھا ہے کہ ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کرنا آپؓ کا عام معمول تھا[۱۰۹] اور بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ آپؓ نے فرمایا تھا کہ جو غلام خشوع و خضوع سے نماز ادا کریگا میں اس کو آزاد کردونگا۔ آپؓ اس عہد پر سختی سے پابند تھے[۱۱۰]۔

ہشام اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حکیم بن حزام نے عہد جاہلیت میں سو غلاموں کو آزاد کیا اور سو اونٹ بھر کر خیرات کی تھی۔ پھر اسلام لانے کے بعد بھی انہوں نے سو غلام آزاد کیے اور سو اونٹ بھر کر خیرات کیے۔ ایک مرتبہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں جن چیزوں کو عہد جاہلیت میں اجر و ثواب کے لیے کرتا تھا ان کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا ارشاد ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَسْلَمْتَ عَلٰی مَاسَلَفَ لَکَ مِنْ خَیْرٍ. (بخاری باب عتق المشرک)

جو چیزیں تم سے بھلائی کی گزر چکی ہیں تم ان پر اسلام لائے ہو۔

ایک مرتبہ امام زین العابدینؒ نے یہ حدیث سنی کہ جو شخص کسی غلام کو آزاد کریگا اس کا ہر ہر عضو اس غلام کے ہر ہر عضو کے بدلے بخش دیا جائے گا۔ آپ نے اسی وقت اپنے غلام مطرف کو جسے دس ہزار درہم میں خریدا تھا بلا کر آزاد کر دیا[۱۱۱]۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا معمول تھا کہ انہیں کوئی بات زیادہ پسند ہوتی تھی تو وہ اس کی خوشی میں صدقات وخیرات کرتے تھے۔ آپ کے غلاموں کو اس کا علم ہوگیا۔ اب ان لوگوں نے یہ کرنا شروع کیا کہ ان میں سے کوئی ایک مسجد میں جا کر بیٹھ جاتا اور خوب عبادت کرتا۔ حضرت ابن عمرؓ اسے اس حالت میں دیکھتے تو بڑے خوش ہوتے اور اسے آزاد کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے اصحاب نے عرض کیا "یہ غلام تو آپ کو دھوکہ دینے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

من خدعنا باللہ انخدعنا لہ [۱۱۱]۔

غلاموں کو آزاد کرنے کا مزید شوق دلانے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ جتنا زیادہ قیمتی اور پسندیدہ غلام آزاد کیا جائیگا، اتنا ہی ثواب زیادہ ہوگا۔ حضرت ابوذرؓ نے پوچھا:

اَیُّ الرقاب افضلُ.

کیسے غلام کو آزاد کرنا زیادہ ثواب کا باعث ہے۔

فرمایا:

اغلاھا ثمنًا وَانفَسِھا عِندَاَھلِھَا.

یعنی وہ جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو مالک کو زیادہ پسند ہو [۱۱۲]۔

مسلم وغیر مسلم کا عدم امتیاز

غلام کے آزاد کرنے کا جو ثواب بیان کیا گیا ہے اس میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ صرف ثواب میں کمی بیشی کا فرق ہے۔ ترغیب عتق کی احادیث نقل کرنے کے بعد قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں:

ولا خلاف ان مُعتِق الرقبۃ الکافِر مُثاب علی العتقِ [۱۱۳]۔

اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ کافر غلام آزاد کرنے والے کو بھی آزاد کرنے کا ثواب دیا جائے گا۔

اور امام مالک نے اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ میں فرمایا ہے:

ولا باس اَنْ یُعتَق النصرانی والیھودیّ والمجوسی تطوعًا.

اور اس میں کچھ حرج نہیں ہے کہ نصرانی، یہودی یا کسی مجوسی کو اجر وثواب کے لیے آزاد کیا جائے۔

گناہوں کے کفارہ میں غلام آزاد کرنا

غلام کو آزاد کرنے کی ان ترغیبات کے بعد دیکھیے کہ متعدد گناہوں کے کفارہ میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ وہ لوگ جو برضا ورغبت غلام آزاد نہیں کرتے، اس دباؤ میں آ کر غلام آزاد کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ ان گناہوں میں بعض تو وہ ہیں جن کے کفارہ میں غلام آزاد کرنا مستحب اور اولیٰ ہی ہے اور بعض وہ ہیں جن کے کفارہ میں غلام آزاد کرنا نہ صرف مستحب بلکہ واجب اور ضروری ہے۔

قتل خطا

اگر کوئی کسی مسلمان کو خطا قتل کر دے تو اس پر ایک غلام آزاد کرنا ضروری ہے، قرآن مجید میں ہے:

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا.

اور اگر کسی نے مسلمان کو خطاء قتل کر دے تو اس پر واجب ہے کہ ایک مومن غلام کو آزاد کرے، اور مقتول کے ورثہ کو دیت دے مگر اس وقت جبکہ وہ معاف کر دیں۔

پھر مسلمان ہی کی تخصیص نہیں بلکہ کسی ذمی یا معاہد کو اگر خطاءً قتل کر دیا گیا ہے تو اس کا کفارہ بھی یہی ہے چنانچہ اس آیت کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے:

فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ.

اور اگر وہ کسی ایسی قوم سے ہو جو تمہاری دشمن ہے مگر ہو مومن تو اس کے قتل پر بھی ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا واجب ہے اور اگر وہ ایسی قوم سے ہو جس میں اور تم میں کوئی معاہدہ ہو تو مقتول کے ورثاء کو دیت ادا کرنی ضروری ہوگی اور ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہوگا۔

کفارۂ ظہار

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات مثلاً ماں، بہن میں سے کسی ایک کے ساتھ تشبیہ دے کر اپنے اوپر حرام کر لے تو اس کو شریعت اسلام کی اصطلاح میں ظہار کہتے ہیں اور اس کا حکم یہ ہے کہ ظہار

کرنے والا شوہر اگر اپنے قول کو واپس لینا چاہے تو جب تک کفارۂ ظہار ادا نہیں کرے گا اس کی بیوی اس کے لیے حلال نہیں ہوگی اور کفارہ میں تین چیزیں ہیں۔ایک غلام آزاد کرے، ساٹھ دن تک برابر روزے رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ان تینوں میں غلام کو آزاد کرنے کو مقدم رکھا گیا ہے۔یعنی جو شخص ایک غلام آزاد کر سکتا ہے اس کے لیے جائز نہیں کہ کفارۂ ظہار کسی اور صورت سے ادا کرے۔قرآن مجید میں ہے:

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ط ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ.

اور جو لوگ ماں کہہ بیٹھیں اپنی عورت کو پھر قول کو واپس لینا چاہیں تو ان کو چاہیے کہ ایک دوسرے کو چھونے سے قبل ایک غلام کو آزاد کریں اس سے تم کو نصیحت ہوگی اور اللہ تعالیٰ ان چیزوں کی خبر رکھتا ہے جن پر تم عمل کرتے ہو۔

یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ آیت ظہار میں "رقبہ" کا لفظ مطلق آیا ہے۔مومنہ کی قید سے مقید نہیں ہے۔اس بناء پر علماء احناف نے کہا ہے کہ اگر کسی غیر مسلم غلام کو بھی آزاد کر دیا گیا تو ظہار کا کفارہ ادا ہو جائیگا اور بیوی شوہر کے لیے حلال ہو جائے گی۔

کفارۂ یمین

اگر کوئی شخص کسی بات کی قسم کھالے اور پھر اس کو توڑنا چاہے یا جان بوجھ کر توڑ دے تو اس قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا اور وہ یہ ہے کہ متوسط درجہ کا کھانا دس مسکینوں کو کھلائے۔یا ان کو کپڑے بنا کر دے اور یا ایک غلام آزاد کرے۔قرآن مجید میں ارشاد ہے:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ.

تمہاری جو قسمیں لغو ہیں اللہ ان پر تم سے مواخذہ نہیں کریگا مگر ہاں ان قسموں پر مواخذہ ہوگا جو تم نے آئندہ کے لیے منعقد کی ہیں ان کا کفارہ دس مسکینوں کو متوسط درجہ کا کھانا کھلانا، یا ان کو کپڑے بنانا یا ایک غلام کو آزاد کرنا ہے

کفارہ افساد صوم

کوئی شخص قصداً عمداً روزہ فاسد کردے تو اس کا کفارہ بھی کفارۂ ظہار کی طرح یہی ہے کہ غلام آزاد کردے۔ اس کی مقدرت نہ ہو تو ساٹھ دن کے روزے رکھے اور مسلسل رکھے اور اگر اس کی طاقت نہ ہو تو اس کو چاہیے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رمضان میں روزہ قصداً افطار کر لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے متعلق مدرجہ بالا احکام فرمائے۔

معمولی گناہوں کا کفارہ

ان گناہوں کے علاوہ بعض معمولی معمولی گناہوں کے ارتکاب پر بھی غلام کو بطور کفارہ آزاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے:

من لطم علو کہ او ضربہ فکفارتہ ان یعتقہ [115]

جس کسی شخص نے اپنے غلام کے طمانچہ مارا یا اس کو زدوکوب کیا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اس کو آزاد کردے

ابن المنکدر رکہتے ہیں ''ایک شخص اپنے غلام کو مار رہا تھا، غلام کہتا جاتا تھا کہ خدا کے لیے رحم کر، خدا کے لیے رحم کر لیکن اس نے پھر بھی معاف نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام کی چیخ و پکار سنی تو آپ اس کی طرف تشریف لائے مارنے والے نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی ہاتھ روک لیا۔ آپ نے فرمایا ''غلام نے تجھ کو خدا کی دہائی دی تو نے پھر بھی نہ مانا لیکن تو نے جب مجھ کو آتے دیکھا تو اپنا ہاتھ روک لیا۔ اس شخص نے کہا یا رسول اللہ یہ غلام خدا کیلئے آزاد ہے'' ارشاد ہوا اگر تو ایسا نہ کرتا تو دوزخ کی آگ تجھے بھسم کر دیتی۔

سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت غلام آزاد کرنا

سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت جس طرح نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے غلاموں کو آزاد کرنے کے متعلق بھی ارشاد فرمایا گیا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالعتاقۃ فی کسوف الشمس [۱۱۶]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ سورج گرہن کے وقت غلام آزاد کیا جائے۔

اسی طرح کی ایک اور حدیث حضرت اسماءؓ سے روایت ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

کنا نؤمر عند الخسوف بالعتاقۃ۔

ہم کو حکم دیا جاتا تھا کہ چاند گرہن کے وقت غلام آزاد کریں [۱۱۷]۔

ہزل و جد کی مساوات

پھر یہ دیکھو کہ غلام کو آزاد ہونے کے لیے اس کی بھی ضرورت نہیں کہ آزاد کرنے کے الفاظ عمداً و قصداً کہے جائیں۔ بلکہ اگر مذاق میں بھی یہ الفاظ کہہ دیے گئے ہیں تو غلام آزاد ہو جائیگا۔

حدیث میں ہے:

ثلاثۃ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ الطلاق والعتاق والنکاح۔

تین چیزیں ایسی ہیں جن میں مذاق بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ سنجیدگی دونوں برابر ہیں طلاق دینا آزاد کرنا اور نکاح کرنا۔

کسی کی طرف سے غلام آزاد کرنا

سعد بن عبادہؓ جو قبیلہ خزرج کے سردار تھے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ میری ماں عمر بنت مسعود کا انتقال ہو گیا ہے اور میں اس وقت غزوۂ احد و دومۃ الجندل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک تھا۔ اب میں اس کی طرف سے کوئی غلام آزاد کر دوں تو اس کو اس کا اجر ملے گا یا نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں [۱۱۸]۔

حضرت عائشہؓ کے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کی وفات ہوئی تو بہن کو بے حد صدمہ ہوا کہ بھائی کی طرف سے بہتیرے غلام (رقابا کثیرۃ) آزاد کیے۔ واثلہ بن الاسقع سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ تبوک میں شریک تھے۔ ہم نے آپس میں ذکر کیا کہ ہمارا فلاں دوست مر گیا۔ آنحضرت نے فرمایا: "اس کی طرف سے غلام آزاد کر دو۔ اللہ تعالیٰ غلام کے ہر عضو کے بدلہ میں اس کا ہر عضو بخش دے گا" [۱۱۹]۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو الہیثم الانصاری کو ایک غلام عنایت فرمایا اور ہدایت کی کہ "اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا" ان کی بیوی نے کہا "تم سے یہ نہ ہو سکے گا بہتر یہ ہے کہ اس کو آزاد کر دو" چنانچہ انہوں نے آزاد کر دیا [۱۲۰]۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو ایک غلام عنایت فرمایا اور ہدایت کی کہ اس کے ساتھ نیکی کا معاملہ کرنا۔ انہوں نے نیکی کا برتاؤ یہ کیا کہ اسے یہ آزادی کر دیا[141]۔

حضرت ابو ہریرہؓ اسلام قبول کرنے کی غرض سے آئے تو ان کے ہمراہ ان کا غلام بھی تھا۔ اتفاق سے راستہ میں وہ کہیں رہ گیا مگر جب ابو ہریرہؓ خدمت نبوی میں حاضر تھے تو وہ غلام بھی آ موجود ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ابو ہریرہ! لو یہ تمہارا غلام ہے"۔ وہ بولے "آپ گواہ رہیے کہ یہ آزاد ہے[142]۔

الغرض روایات و آثار کا استقصاء کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمات اسلام کی اصل اسپرٹ سے متاثر ہو کر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کس قدر کثرت سے غلام اور باندیاں آزاد کرتے تھے۔ نواب صدیق حسن خان نے بلوغ المرام کی شرح میں نجم الوہاج سے ایک فہرست نقل کی ہے جس کی رو سے صحابہ کرام کے آزاد کردہ غلاموں کی موجودہ تعداد انتالیس ہزار دو سو انسٹھ تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ ان صحابہ کے نام اور ان کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد حسب ذیل ہے:

حضرت عائشہؓ	۶۹
حضرت حکیم بن حزامؓ	۱۰۰
حضرت عثمانؓ	۲۰
حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ	۳۰۰۰۰
حضرت عباسؓ	۷۰
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	۱۰۰۰
حضرت ذوالکلاع حمیریؓ	۸۰۰۰ (صرف ایک دن میں)

اس کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد تریسٹھ لکھی ہے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد اگرچہ ٹھیک نہیں بتائی لیکن لکھا ہے کہ انہوں نے بکثرت غلام آزاد کیے[143]۔

ہمارا خیال ہے کہ صاحب نجم الوہاج کی بیان کی ہوئی یہ تعداد اصل تعداد سے کم ہے کیونکہ اس فہرست میں ان کثیر التعداد صحابہ کرامؓ کے نام نہیں ہیں جن کے غلام آزاد کرنے کے جزئی واقعات روایات و آثار کے وسیع ذخیرہ میں بکثرت دستیاب ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابوذرؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت ابن عباسؓ وغیرہم۔

غلاموں کے لیے آزاد ہونے کی مختلف تدبیریں

یہاں تک غلام کو آزاد کرنے کی جو ترغیبات بیان کی گئی ہیں ان سے واضح ہوگا کہ اسلام نے کس کس طرح اپنے پیرووں کو غلام باندی کے آزاد کرنے پر اکسایا اور ابھارا ہے لیکن اگر اس کے باوجود آقا اس کار ثواب پر آمادہ نہ ہوں تو اسلام نے خود غلاموں کو ایسے مواقع عنایت کیے ہیں جن سے کام لے کر وہ آزاد ہو سکتے ہیں۔

مکاتبت

جس طرح شریعت اسلام میں عورتوں کے لیے خلع کا حق رکھا گیا ہے کہ اگر وہ اپنے شوہروں کے ساتھ رہنا پسند نہ کریں اور شوہر انہیں طلاق دینے پر رضامند نہ ہوں تو وہ حق خلع سے کام لے کر اپنے تئیں اس قید و بند سے آزاد کرا سکتی ہیں۔ اسی طرح غلاموں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ اگر وہ غلام رہنا گوارا نہیں کرتے تو انہیں حق ہے کہ اپنے آقا سے مکاتبت کرلیں مکاتبت کی صورت بالکل خلع کی سی ہے۔ یعنی یہ کہ غلام خود یا اس کا آقا اس سے کہے کہ وہ اتنا روپیہ کما کر آقا کو ادا کردے اور اس کے بدلے میں وہ اس کو آزاد کردے گا۔ قرآن مجید میں اس کا بیان اس طرح کیا گیا ہے:

وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا وَّآتُوهُم مِّن مَّالِ اللّٰهِ الَّذِي آتٰكُمْ.

اور وہ تمہارے باندی غلام جو تم سے مکاتبت کرنا چاہتے ہیں تو تم اگر ان میں بھلائی دیکھتے ہو تو ان سے مکاتبت کرلو اور ان کو اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو دیا ہے۔

"خیر" سے مراد کمانے کی قدرت اور روپیہ پیدا کر سکنے کی اہلیت ہے اگر تم ان غلاموں میں کسب مال کی استعداد و صلاحیت پاتے ہو تو ان کی خواہش کے مطابق ان سے مکاتبت کرلو۔ یہاں یہ بات فراموش نہ ہونی چاہیے "کاتبو" صیغہ امر ہے اور امر جن معانی کے لیے آتا ہے ان میں سے کسی ایک معنی کو متعین کر لینے کے لیے کوئی قرینہ بھی نہیں ہے۔ اس لیے قاعدہ کے مطابق یہ صیغہ امر وجوب کے لیے ہوگا تو اب معنی یہ ہوگئے کہ اگر غلام تم سے مکاتبت کی خواہش کرتا ہے اور تم جانتے ہو کہ کسب مال کی صلاحیت و استعداد سے بھی محروم نہیں ہے تو اس وقت تم پر واجب ہے کہ غلام سے مکاتبت کرلو اور اس کی درخواست کو مسترد نہ کرو، پھر آگے دیکھیے ارشاد ہوتا ہے کہ:

واٰتوھم من مال اللہ الذی اٰتٰکم۔

اور ان غلاموں کو اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو دیا ہے۔

اس سے اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ بدل کتابت ادا کرنے میں تمام مسلمانوں کو غلام کی امداد و اعانت کرنی چاہیے۔ یہاں تک کہ خود مالک کو بھی بدل کتابت کو کم کر کے یا کسی اور طرح اس کار خیر و ثواب میں شرکت کرنی چاہیے۔ یہاں بھی "اٰتوا" صیغہ امر ہے۔ اس سے وجوب نہیں تو کم از کم اس حکم کی اہمیت تو ثابت ہوتی ہے۔

اور مسائل کی طرح یہ آیت بھی اختلاف آرا سے نہ بچی۔ بعض علماء نے تو "فکاتبوھم" اور "واٰتوھم" ان دونوں صیغہ ہائے امر کو مجرد من القرائن دیکھ کر فرمایا کہ دونوں جگہ امر وجوب کے لیے ہے لیکن اکثر علماء کا خیال ہے کہ صیغہ اول استحباب کے لیے ہے اور دوسرا صیغہ وجوب کے لیے ہے۔ صحیح بخاری میں اس آیت کے ذکر کے بعد ہے کہ روح ابن جریج سے روایت کرتی ہیں کہ انہوں نے عطاء سے پوچھا کہ اگر مجھ کو معلوم ہو جائے کہ غلام کے پاس مال ہے تو کیا میرے لیے ضروری ہے کہ میں غلام سے مکاتبت کر لوں۔ عطاء نے فرمایا "میں تو اس کو واجب ہی سمجھتا ہوں" عمرو بن دینار فرماتے ہیں کہ میں نے عطاء سے دریافت کیا کہ آپ خود یہ رائے رکھتے ہیں یا کسی سے اسے نقل کرتے ہیں فرمایا "میں کسی سے نقل نہیں کرتا بلکہ خود میری اپنی یہ رائے ہے" پھر انہوں نے موسیٰ بن انس ؓ کی روایت سے بتایا کہ سیرین (محمد بن سیرینؒ مشہور تابعی کے والد ماجد) نے انس رضی اللہ عنہ سے مکاتبت کی درخواست کی اور یہ بہت مالدار تھی انس رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا۔ سیرین سیدھے حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پورا ماجرا کہہ سنایا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ سیرین سے مکاتبت کر لو۔ انہوں نے نہ مانا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا۔ آپ نے انس رضی اللہ عنہ کو درے مارے اور یہ آیت پڑھی " فکاتبوھم ان علمتم فیھم خیرا" اب انس رضی اللہ عنہ راضی ہو گئے اور انہوں نے مکاتبت کر لی۔

مکاتبت کی امداد تمام مسلمانوں پر واجب ہے

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے عبد مکاتب کی امداد میں تمام مسلمان کو شریک ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے جہاں اور مصارف بیان کیے گئے ہیں انہی میں بڑی اہمیت کے ساتھ مکاتب کی امداد کرنے کو بھی بتایا گیا ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ.

صدقات صرف فقیروں، مسکینوں، زکوٰۃ وصول کرنے والوں اور ان لوگوں کے لیے ہیں جن کے تالیف قلب کی ضرورت ہے اور غلاموں کی گردنوں کو خلاصی دینے کے لیے ہیں۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ.

پس نہیں گھسا وہ شدائد میں اور تم کیا سمجھے کہ وہ شدائد کیا ہیں؟ وہ اہم باتیں غلام کی گلو خلاصی کرانی یا کسی فقر زدہ یتیم کو بھوک کے دن کھانا کھلانا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور آیت میں جہاں عزیز و قریب، دور کے اور پاس کے پڑوسی اور مسافروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا امر فرمایا گیا ہے، ساتھ ہی غلاموں و ر باندیوں کو آزاد ہونے میں مدد دینے کی بھی ترغیب دی گئی ہے۔

پھر بدل کتابت ادا کرنے کے بعد اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ آقا اپنی زبان سے آزاد کرنے کے کلمات ادا ہی کرے۔ بلکہ اس رقم کے ادا ہوتے ہی وہ آزاد ہو جائیگا۔ جیسا کہ فقہاء کی کتابوں میں بالعموم مذکور ہے۔ اس کے علاوہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر آقا نے غلام کے بدل کتابت ادا کرنے سے پہلے کسی ایسے گناہ کا ارتکاب کیا جس کے کفارہ میں غلام آزاد کرنا ضروری ہے تو اس کی پاداش میں یہ عبد مکاتب بھی آزاد ہو سکتا ہے۔ امام مالکؒ، ثوریؒ اور امام شافعیؒ کا مذہب یہی ہے۔ یہی حال اس باندی یا غلام کا ہے جس کو اس کے آقا نے مدبر کر دیا ہو۔ یعنی اس کی آزادی کو اپنی موت پر معلق کر دیا ہو۔[۱۲۲]

اب غور کرو جس طرح قرآن مجید میں غلام کو مکاتب بننے کا حق دیا گیا ہے اور پھر اس پر آقاؤں کو غلام کی پیشکش کے قبول کرنے کا اور عام مسلمانوں کو اموال زکوٰۃ سے بدل کتابت کی ادائیگی میں امداد کرنے کا حکم جو فرمایا گیا ہے اگر پیروان اسلام اس پر ٹھیک ٹھیک عمل کرتے تو کیا کہیں ایک جگہ بھی غلامی کا وجود باقی رہ سکتا تھا۔ پول انگلینڈ کا متعصب مصنف ہے لیکن اس کے باوجود اس کو بھی یہ کہے بغیر چارہ نہ رہا۔

''اگر غلاموں کے تمام مالک ان ترغیبات پر عمل کرتے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کو آزاد کرنے کے متعلق بیان کی ہیں تو کوئی شبہ نہیں کہ تھوڑے دنوں میں ہی غلامی کا خاتمہ ہو جاتا[125]''

مدبر

بعض لوگ ہوتے ہیں کہ اپنی خانگی یا معاشی ضرورتوں کے باعث غلام کو آزاد نہیں کرنا چاہتے تو ایسے لوگوں کے لیے اسلام نے یہ سہولت رکھی ہے کہ غلام کی آزادی کے لیے تدبیر کی راہ پیدا کر دی ہے۔ اس ترکیب سے ان کی اپنی ضرورتوں میں کوئی حرج بھی واقع نہ ہوگا اور غلام کو آزاد کرنے کے تھوڑے بہت ثواب سے بھی محروم نہیں رہیں گے۔

تدبیر کا حکم

کتابت کی طرح تدبیر سے بھی شرط کے تحقیق کے بعد غلام لازماً آزاد ہو جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ غلام سے آقا کہے کہ ''تو میری موت کے بعد آزاد ہے'' یا اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے کوئی اور جملہ بولے۔ وہ غلام جس سے یہ کہا جاتا ہے مدبر ہو جاتا ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ آقا کے مرتے ہی غلام آزاد ہو جائیگا۔ بظاہر دیکھا جائے تو تدبیر بھی ایک طرح کی وصیت ہے لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ وصیت کو واپس لے لینا اور اس سے رجوع کر لینا جائز ہے لیکن تدبیر کو واپس نہیں لیا جا سکتا۔ چنانچہ غلام کو مدبر کرنے کے بعد آقا اس کو نہ اپنی زندگی میں فروخت کر سکتا ہے اور نہ کسی کو بطور ہبہ و بخشش دے سکتا ہے۔

اگر کسی شخص نے اپنے غلام کو خطاب کر کے کہا کہ ''تو میری موت کے بعد آزاد ہے'' اور پھر اس نے کہا کہ میری نیت میں تو اس جملہ سے غلام کو مدبر کرنا نہ تھا تو اس صورت میں بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس نے نیت خواہ کچھ ہی کی ہو الفاظ تدبیر کے معنی کو ضرور حامل ہیں اور غلام کی آزادی میں بیش از بیش سہولتیں پیدا کرنا اسلام کے مقاصد مہمہ میں سے بھی ہے۔ اس لیے اس شخص کی نیت کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا اور غلام مدبر ہو جائیگا۔ بعض علماء نے صرف لفظوں کی معنوی حیثیت کو ملحوظ رکھا ہے اور کہا ہے کہ جب الفاظ تدبیر کے علاوہ کسی دوسرے معنی کا بھی احتمال رکھتے ہیں تو قائل کی تصدیق کی جائیگی اور اس کی نیت کی مطابق اس پر حکم لگایا جائے گا۔

مدبر کے متعلق ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنے غلام کے ایک حصہ کو مدبر کر دیا ہے تو صرف وہی حصہ نہیں بلکہ پورا غلام مدبر ہو جائیگا کیونکہ طلاق اور نکاح کی طرح حق بھی تجزی کو قبول نہیں کرتا ہے۔

ام ولد

اصطلاح شرع میں ام ولد اس جاریہ کو کہتے ہیں جس کے بطن سے اس کے مولی کے لیے بچہ پیدا ہوا ہو۔ اس کا حکم بھی مدبر کی طرح یہ ہے کہ آقا کے مرتے ہی آزاد ہو جائیگی۔ اور جس طرح مدبر کی بیع ناجائز تھی ام ولد کو بیچنا بھی ناجائز ہے اور نہ ان کو بطور ہبہ کسی کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے۔ امام مالکؒ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے:

أَيُّمَا وَلِيدَةٍ وَلَدَتْ مِنْ سَيِّدِهَا فَإِنَّهُ لَا يبيعها وَلَا يَهَبُهَا وَلَا يورثها وهو يستمتع منها فاذا مات فهي حُرَّةٌ.

جس باندی کے اس کے آقا سے بچہ پیدا ہو جائے تو وہ نہ اس کو بیچ سکتا ہے نہ ہبہ کر سکتا ہے اور نہ وراثت میں کسی کو دے سکتا ہے البتہ وہ خود اس سے تمتع کر سکتا ہے اس کے مرنے پر باندی آزاد ہو جائے گی۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ:

اَعْتَقَهَا وَلَدُهَا.

اس باندی کو تو اس کے بچے نے آزاد کر دیا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد میمنت مہد سے قبل ام ولد کی بیع و شراء ہوتی تھی لیکن آپ نے اپنے عہد خلافت میں اس کو قطعاً مسدود کر دیا۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں امہات الاولاد کی بیع کر دیتے تھے لیکن جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو آپ نے سختی کے ساتھ اس کی ممانعت کر دی اور پھر ہم سب نے اس سے توبہ کر لی [۱۲۶]۔

لیکن اصل یہ ہے کہ ام ولد کی بیع و شراء خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں بھی جائز نہیں تھی اور اگر تھی تو شروع شروع میں ہوگی۔ آخر عمر میں آپ نے اس کی ممانعت کر دی تھی۔ حضرت ابن عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

انّه نهیٰ عن بیع امهات الاولاد وقال لایُبَعْن ولا یُوهَبْن ولا یُوْرَثْن یستمتع بها السیّد مادام حیًا واذا مات فهی حرّة[127]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امہات الاولاد کی بیع سے منع فرمایا اور فرمایا کہ ان کو بیچا نہ جائے نہ ان کو ہبہ میں دیا جائے اور نہ ان کو وراثت میں منتقل کیا جائے۔ آقا جب تک زندہ ہے ام ولد سے تمتع کرتا ہے اور جب مر جائے تو وہ آزاد ہے۔

اسی روایت کو دار قطنی نے ایک اور طریقہ سے یعنی عن ابن عمر عن عمر روایت کیا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور روایت ہے جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ خطاب بن صالح اپنی ماں سے روایت کرتے ہیں کہ ان سے سلامہ بنت معقل نے کہا کہ میں حباب بن عمرو کی باندی تھی اور اس سے میرا ایک لڑکا بھی تھا۔ ایک مرتبہ اس کی بیوی نے کہا کہ "حباب پر جو قرض تھا اب تو اس کے بدلے میں بیچی جائے گی" سلامہ کہتی ہے کہ میں یہ سن کر فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ کو پورا واقعہ سنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ حباب بن عمرو کے ترکہ کا مالک کون ہے؟ لوگوں نے کہا اس کا بھائی ابوالیسیر کعب بن عمرو ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلا کر فرمایا "تم اس کو نہ بیچو اور آزاد کر دو اور جب تم کبھی کسی غلام کے متعلق سنو کہ وہ میرے پاس آ گیا ہے تو تم میرے پاس آؤ میں تم کو عوض دوں گا۔ چنانچہ لوگوں نے یہی کیا[128]۔

ان دونوں روایتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ام ولد کی بیع و شراء خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ممنوع تھی۔ امام احمد اور ابن ماجہ نے ایک روایت بیان کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

ایما امراۃ ولدت من سیّدها فهی معتقة عن دبر منه او قال من بعده.

جس باندی کے اس کے سردار سے بچہ پیدا ہو وہ اس کے مرتے ہی آزاد ہو جائے گی راوی کو شبہ ہے کہ آپ نے عن دبر منہ فرمایا یا من بعدہ۔

یہ حدیث بھی اس پر صاف دلالت کرتی ہے کہ ام ولد کا حکم بالکل مدبر کا سا ہے یعنی جس طرح اس کی خرید و فروخت نہیں ہو سکتی، اس کی بیع و شراء بھی جائز نہیں۔

اب رہی حضرت جابرؓ کی روایت تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت کا مفہوم صرف اسی قدر ہے کہ بعض صحابہ (رضی اللہ عنہم) امہات الاولاد کی بیع کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس

وقت دنیا میں تشریف رکھتے تھے۔ اس سے ہرگز یہ کہیں معلوم نہیں ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کے ایک دو واقعات کا علم ہوا تھا اور اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع نہیں فرمایا۔ چنانچہ امام بیہقی فرماتے ہیں:

وَلَيْسَ فِي شَيْءٍ مِنَ الطُّرُقِ أَنَّ النبي صلى الله عليه وسلم اطّلع علىٰ ذٰلك يعني بيع امهات الاولاد واقرهم عليه [1]

کسی طریقہ سے بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان واقعات یعنی امہات الاولاد کی بیع کا علم ہوا ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس پر باقی رکھا ہو۔

یہی حضرت ابو بکرؓ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ان کا زمانۂ خلافت صرف دو برس چند ماہ تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لیجانے کے بعد عرب کی اندرونی حالت اس درجہ پر آشوب ہو گئی تھی کہ حضرت ابو بکرؓ کی تمام توجہ اسی پر مرکوز ہو گئی اور آپ کو اس کی قطعاً فرصت ہی نہیں ہوئی کہ ام ولد کی بیع ایسے جزئی امور کی طرف توجہ کرتے۔ پھر جب حضرت عمرؓ کا مبارک زمانۂ خلافت آیا تو آپ نے جہاں اور بہتیری ایسی چیزوں کے متعلق اپنا قطعی حکم صادر فرمایا جن کا معاملہ کسی قدر مبہم تھا۔ ام ولد کی بیع کی نسبت بھی ایسا فیصلہ صادر فرما دیا لیکن اس کا یہ منشاء ہرگز نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اجتہاد سے کوئی ایسا حکم دیا تھا کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی حکم نبوت کی توضیح و تشریح تو کر سکتے تھے اس کی مخالفت کس طرح کر سکتے تھے۔

فقہاء میں ام ولد کی بیع سے متعلق شدید اختلاف ہے۔ یہاں تک کہ علامہ ابن کثیر نے مستقل اس پر ایک کتاب ہی تصنیف کر دی ہے لیکن عام رجحان عدم جواز کی طرف ہی معلوم ہوتا ہے۔ بقول حافظ ابن قیم کے اگر ان روایات کو صحیح مان لیا جائے جو ام ولد کی آزادی کا حکم لگاتی ہیں (اور ان کو کم و بیش تمام علماء صحیح تسلیم کرتے ہیں) تو پھر یہ مسئلہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ ام ولد کی بیع جائز ہے یا نہیں۔

ام ولد ہونے کے لیے بچہ کا صحیح و سالم ہونا شرط نہیں

پھر ام ولد ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ بچہ صحیح و سالم اور تندرست ہی پیدا ہو۔ بلکہ اگر بچہ مردہ پیدا ہوا ہے یا اسقاط ہو گیا ہے تب بھی باندی ام ولد ہو جائیگی۔ کنز العمال باب الاستیلاد میں ہے:

أُمُّ الْوَلَدِ حُرَّةٌ وَإِنْ كَانَ سِقْطًا.

ام ولد آزاد ہے اگرچہ بچہ ساقط ہو گیا ہو۔

باندی سے عزل کی مذمت

اب ایک طرف یہ حکم دیکھیے کہ باندی کے بطن سے بچہ پیدا ہوتے ہی اس کی ماں ام ولد بن جاتی ہے جس کا حکم آپ کو معلوم ہو گیا اور دوسری طرف اس کو پیش نظر رکھیے کہ باندی سے عزل کرنے کی مذمت کی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سخت ممانعت فرمائی ہے۔ ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انصار میں سے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ باندیاں ہمارے ہاتھ لگتی ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ ان کو بیچ کر قیمتیں وصول کریں تو عزل کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا واقعی تم لوگ ایسے کرتے ہو؟ نہیں ایسا ہرگز مت کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس نفس کے لیے پیدا ہونا مقدر کر دیا ہے وہ ضرور پیدا ہوگا[130]۔

ان دونوں باتوں پر ادنیٰ توجہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے باندی کو شہوت رانی کا ذریعہ قرار نہیں دیا اور تدریجی طور پر اس کو آزادی سے کس قدر قریب کرنا چاہا ہے۔

اولی قربیٰ کی غلامی

اولی قربیٰ میں سے اگر کوئی شخص کسی کا مالک ہو جائے تو وہ فوراً آزاد ہو جائے گا حضرت سمرۃ بن جندب سے مرفوعاً منقول ہے:

مَنْ مَلَكَ ذَا رَحِمٍ مَحْرَمٍ فَهُوَ حُرٌّ.

جو شخص کسی ذو رحم محرم کا مالک ہو جائے تو وہ آزاد ہو جائیگا۔

آزادی میں مزید سہولتیں

شریعت اسلام نے آزادی کو اصل سمجھا ہے اور یہ تسلیم کیا ہے کہ ہر انسان خواہ وہ کسی بڑے خاندان سے ہو یا چھوٹے گھرانے سے مسلم ہو یا غیر مسلم، کالے رنگ کا ہو یا گورا خوبصورت ہو یا بد صورت، سب انسانی اعتبار سے بالکل ایک ہیں۔ شرف و تفوق کی حیثیت سے ان میں کوئی فرق

نہیں ہے۔اس کے برعکس غلامی کو محض ایک عارضی چیز سمجھا ہے اور مختلف طریقوں سے کوشش کی ہے کہ یہ ننگ وعار کا داغ انسانیت کے دامن سے ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جائے۔آزادی حاصل کرنے کے لیے جتنے طریقے ہو سکتے تھے ان سب کو اختیار کر لیا گیا ہے۔مکاتبت، تدبیر، ام ولد ہو کر آزاد ہو جانا۔کسی ذی رحم محرم کا مملوک ہوتے ہی آزاد ہو جانا، اسی کوشش کی جدا جدا کڑیاں ہیں۔ان کے علاوہ فقہ میں بعض ایسی جزئیات ملتی ہیں جن سے اس منشاء کی تائید ہوتی ہے۔مثلاً۔

۱۔ آئمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کسی شخص کے قبضہ میں ایک عاقل بالغ نوجوان لڑکا ہو اور وہ دعویٰ کرے کہ یہ لڑکا میرا غلام ہے اور وہ لڑکا اس کی تکذیب کرے، تو اب اس صورت میں لڑکے سے قسم لی جائیگی اور اگر اس نے قسم کھالی تو آزاد ہو جائیگا۔نزاعی معاملات میں اسلام کی اصل یہ ہے کہ مدعی سے بینہ طلب کیا جاتا ہے اور وہ اس سے عاجز ہوتا ہے تو منکر سے قسم لے کر اس کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے، حدیث میں ہے:

البينة على المدعي واليمين على من انكر۔

بینہ (گواہ پیش کرنا) مدعی کے ذمہ ہے اور قسم ان لوگوں پر واجب ہے جو انکار کر دیں۔

لیکن آپ نے دیکھا کہ اس مسئلہ میں مدعی سے کوئی بینہ طلب نہیں کیا جاتا۔بلکہ محض مدعیٰ علیہ یعنی لڑکے سے قسم لے کر اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام غلامی کے رواج کی حوصلہ افزائی کرتا ہے یا آہستہ آہستہ اور بہانے بہانے سے اسے معدوم کر دینا چاہتا ہے۔

۲۔ فقہا کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اگر دو شخصوں کو جن میں سے ایک مسلمان ہو اور دوسرا کافر، ایک لاوارث بچہ کہیں پڑا ہوا ملے اور مسلمان اس کی نسبت دعویٰ کرے کہ وہ اس کا غلام ہے اور کافر کہے اس کا بیٹا ہے، تو اس صورت میں فیصلہ کافر کے حق میں ہوگا نہ کہ مسلمان کے حق میں اور وجہ یہ ہے کہ اگر وہ بچہ مسلمان کو دیا جائے تو غلام ہوگا۔حالانکہ انسان کے لئے اصل آزادی ہے۔

خیال کیجئے کہ کیا اسلام کی حریت پروری، رواداری اور انسانیت نوازی کی اس سے زیادہ کوئی روشن مثال ہو سکتی ہے۔اس فیصلہ بالا کے مطابق ایک بچہ کافر کے قبضہ میں جا رہا ہے جو غالباً اپنے ماحول کے اعتبار سے غیر مسلم ہی ہوگا۔مسلمانوں کو سراسر نقصان ہو رہا ہے لیکن اسلام کے پاس حریت اس قدر زیادہ ہے کہ اسے مسلمانوں کی مردم شماری میں ایک شخص کے کم ہونے کا کوئی ملال ہی نہیں ہے۔

۳۔ ایک غلام میں کئی آدمی شریک ہیں۔ ایک شخص اپنا حصہ آزاد کرتا ہے اس صورت میں فتویٰ یہ ہے کہ صرف وہ حصہ ہی نہیں بلکہ پورا غلام آزاد ہو جائیگا۔ پھر اگر وہ آزاد کرنے والا شخص مالدار ہے تو اس پر دوسرے شریکوں کو ان کے حصوں کا تاوان ادا کرنا ضروری ہوگا۔ ورنہ وہ غلام خود اپنی قیمت کے بقدر سعی وکسب کرے گا اور اس کے ادا کرنے کے بعد آزاد ہو جائیگا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ اعتق نصیباً او شقصاً فی مملوک فخلاصہ علیه فی ماله ان کان لهٗ مالٌ والاّ قُوِّمَ علیه واستسعی به غیر مشقوقٍ علیه [۱۳۱]

جس شخص نے کسی غلام میں اپنا حصہ آزاد کر دیا پس اگر وہ مالدار ہے تو اس پر واجب ہے کہ اپنے شریکوں کے حصوں کے بقدر مال ادا کر کے اس کو رہا کر دے۔ ورنہ اس کی قیمت مقرر کر لی جائے اور اس غلام سے بغیر کسی شدید مشقت کے اس کے لیے سعی کرائی جائے۔

دارالکفر سے نکل کر اگر غلام دارالاسلام میں داخل ہو جائیں تو وہ سب آزاد ہو جائینگے اور اسلامی حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ اس کو نافذ کرے۔

پہلے گزر چکا ہے کہ صلح حدیبیہ سے قبل چند غلام بھاگ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ گئے۔ ان کے آقاؤں نے آپ کو لکھا کہ یہ لوگ آپ کے دین کی وجہ سے نہیں بلکہ غلامی سے بھاگ کر آپ کے پاس آ گئے ہیں لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ان کو واپس کر دیجیے لیکن آپ خفا ہو گئے اور واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ [۱۳۲]

آزاد ہونے کے بعد

آپ پڑھ آئے ہیں کہ دوسرے مذاہب میں غلام آزاد ہونے کے بعد بھی تقریباً غلام ہی رہتا تھا۔ یہاں تک کہ ہندوؤں کی مذہبی تعلیمات کی رو سے ایک برہمن کو پورا حق تھا کہ وہ کسی برہمن کے آزاد کیے ہوئے غلام کو بغیر کسی وجہ کے اپنا غلام بنا لے لیکن اسلام کے احکام اس طرح کی تعلیم کے بالکل خلاف ہیں۔ اسلام میں ایک غلام آزاد ہونے کے بعد مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے۔ نکاح، طلاق، لین دین، معاشرت، سیاست، غرض کسی چیز میں کسی حیثیت سے بھی وہ آزاد سے کم نہیں ہوتا۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں:

مَنْ اَعْتَقَ عَبْدًا لَهُ ثَبَتَ عِتْقُهُ حتّٰی تجوز شَهَادَتُهُ وتتم حُرْمَتُهُ ویثبت میراثُهُ فلیس لسَیِّده ان یشترط علیه مثل مایشترط عَلیٰ عبده من مَالٍ او خدمةٍ ولا یحمل علیه شیئًا مِن الرِّقِ [۱۳۳]۔

جس شخص نے اپنے غلام کو آزاد کر دیا اس کی آزادی قطعی ہو جائیگی یہاں تک کہ اس کی شہادت بھی جائز ہے اور اس کی پوری عزت کی جائیگی اور اسکی میراث ثابت ہوگی۔ اور اس کے آقا کو یہ حق نہیں ہوگا کہ مال یا خدمت ان میں سے کسی چیز کی اس پر کوئی شرط لگائے اور اس پر غلامی کسی طرح بھی محمول نہیں ہوگی۔

علامہ زرقانی آخیر فقرہ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ "لاتجری به شیء مِنْ احکامه" یعنی اس پر غلامی کا کوئی حکم جاری نہیں ہوگا اور اس کے لیے ان کا استدلال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کوئی شخص کسی عبد شریک میں سے اپنے حصہ کو آزاد کر دے تو بقیہ حصص کی قیمت ایک مرد عادل طے کریگا اور آزاد کرنے والے کو ان کی وہ قیمت ادا کرنا ہوگی۔ پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکمیل عتق کا اتنا اہتمام ہے کہ غلام کے ایک حصہ کے آزاد ہونے پر آپ تمام غلام کے ہی آزاد ہونے کا حکم دے رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ اب پورا غلام آزاد ہوگا تو مکمل طور پر آزاد ہوگا اور بقول امام مالک کے اس شان سے آزاد ہوگا کہ لا یخلطه شیءٌ من الرق غلامی کی کوئی چیز بھی اس سے مخلوط نہیں ہوگی۔

ولاء

آزاد ہونے کے بعد غلام اور اس کے آقا کا تعلق یک لخت منقطع کر دینا ایک نازیبا سی بات معلوم ہوتی ہے۔ غلام ایک عرصہ تک اپنے آقا کے ہاں رہ چکا ہوتا ہے۔ کچھ دنوں ایک جگہ ساتھ رہنے سے یوں بھی انسیت اور محبت ہو جاتی ہے اور پھر غلام تو ایک فیملی ممبر کی حیثیت سے رہتا تھا اس کو آقا سے اور اس کے گھر والوں سے گہرا تعلق اور رابطہ محبت ہو جاتا تھا اور پھر دوسری طرف آزاد ہونے کے بعد غلام کو دارالاسلام میں بالکل ایک اجنبی کی حیثیت سے رہنا پڑتا، جہاں نہ کوئی اس کا رشتہ دار ہے جو وقت پر اس کی مدد اور اعانت کر سکے اور جس کے تعلق سے اس کو شہر میں اپنی غربت و اجنبیت محسوس نہ ہو۔ اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں اہل عرب کی زندگی قبائلی تھی انفرادی نہیں۔ یعنی کسی دوسرے ملک کا کوئی شخص ان لوگوں میں بودو باش اختیار کرتا تھا تو اسے بھی اپنے آپ کو کسی نہ کسی قبیلہ سے وابستہ کرنا پڑتا تھا جس کو عربی میں ''محالفت'' کہتے ہیں۔ کسی

قبیلہ کا حلیف بنے بغیر رہنا عرب کی زندگی میں سخت دشوار تھا۔ عراق کے شہر کوفہ وبصرہ میں فارس کے نومسلم مسلمانوں کے ساتھ آباد ہونا شروع ہوئے تو ان میں سے بعض بنی زہرہ کے حلیف بن گئے اور بعض نے قبیلہ نزار کے ساتھ محالفت کر لی۔ قادسیہ میں رستم کے ساتھ چار ہزار فوجیوں کی جو جمعیت تھی اور جس کو "جند شہنشاہ" یعنی شاہی لشکر کہتے تھے انہوں نے جب مسلمانوں سے امن مانگا تو اس کی شرائط میں جہاں اور الفاظ تھے یہ بھی شرط تھی: " ویحالفو مَنْ احبُوْا " یعنی ہم لوگ عرب کے جس قبیلے سے چاہیں گے محالفت اختیار کریں گے[۱۳۳]۔

پس ان حالات میں اسلام کس طرح یہ گوارا کر سکتا تھا کہ آزاد کردہ غلام کو یوں ہی لاوارث اور عالم کسمپرسی میں چھوڑ دیا جائے؟ چنانچہ عبد اور مولیٰ کے تعلق کو ایک مخصوص طریقہ سے آزاد ہونے کے بعد بھی زندہ رکھا گیا ہے جس کو شریعت کی اصطلاح میں "ولاء" کہتے ہیں۔ اس تعلق کی بنیاد پر ہی آزاد کردہ غلام کو اس کے آقا کے خاندان کے ساتھ وابستہ رکھا جاتا ہے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا تو اس کے بعد وہ برابر زید بن حارثہ مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

زنباع کا قصہ مشہور ہے ان کے غلام نے ایک جرم کا ارتکاب کیا جس پر برافروختہ ہو کر انہوں نے غلام کی ناک کاٹ لی۔ غلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت لے کر حاضر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زنباع سے پوچھا تم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے پورا واقعہ بیان کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام سے فرمایا "جا تو آزاد ہے" غلام بولا "اب میرا کفیل کون ہو گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اللہ اور اس کا رسول تیرے کفیل (مولیٰ) ہیں"۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو یہ غلام حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو وصیت تھی وہ بیان کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "ہاں تجھ کو نان نفقہ دیا جائے گا اور تیرے بال بچوں کو بھی" پھر جب حضرت عمرؓ کی خلافت کا عہد آیا، تو غلام نے آپ سے بھی وہی کہا۔ حضرت عمر نے فرمایا "بیشک! اب تو کہاں رہنے کا ارادہ کرتا ہے" غلام بولا "مصر کا حضرت عمرؓ نے گورنر مصر کو لکھ دیا کہ تم اس غلام کو ایک زمین دے دو تا کہ یہ اس کے پھل کھا سکے۔"

ولاء کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ آزاد ہونے کے بعد باندی بے وارث رہ جاتی تھی اور شریف خاندان کا کوئی آدمی اس سے نکاح کرنے میں پس و پیش کرتا تھا لیکن جب اس کو یہ معلوم ہوتا کہ باندی کا تعلق ایک معزز قبیلہ سے ہے تو اس کو نکاح کرنے میں پھر کوئی تامل نہیں نہ ہوتا۔

اس ولاء کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ غلام کی وفات کے بعد اس کا سابق آقا بھی میراث کا مالک ہوتا تھا۔ عہد جاہلیت میں بعض لوگ ولاء کو بیچ دیا کرتے تھے جیسا کہ سائب خاثر کے ترجمہ میں آغانی میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن جعفر نے اس کا ولاء ان کے آقا سے خرید لیا تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مُعْتِق اور مُعتَق کے تعلق کو باقی رکھنے کے لیے ولاء کے بیچنے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ بریرہ مکاتبہ تھیں، حضرت عائشہ کے پاس آئیں اور کہا کہ آپ مجھ کو خرید لیجیے اور پھر آزاد کر دیجیے حضرت عائشہؓ نے فرمایا ''اچھا'' پھر بریرہ بولیں ''مگر میرے مالک شرط یہ کرتے ہیں کہ میرا ولاء انہیں کو ملے گا۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا ''تو پھر مجھ کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے'' اس گفتگو کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن لیا اور حضرت عائشہ سے فرمایا'' تم کوئی پرواہ نہ کرو۔ بریرہ کو خرید لو اور آزاد کر دو اس کا جو ولاء ہوگا وہ تم کو ہی ملے گا خواہ وہ لوگ کیسی ہی کوئی شرط لگائیں''۔ اس موقع پر امام بخاری اور مسلم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو الفاظ نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں:

الولاء من اعتق وان اشترطوا مائت شرط۔

ولاء آزاد کرنے والے ہی کو ملے گا خواہ وہ لوگ سو شرطیں لگائیں۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الولاء۔

آنحضرت ﷺ نے بیع الولا سے منع فرمایا ہے۔

ولاء کے تعلق کی پختگی کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

الولاء لحمة كلحمة النسب

ولاء کا تعلق نسب کے تعلق کی طرح مضبوط ہے۔

یہ ولاء کا تعلق کس قدر قوی اور موثر ہوتا تھا؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق ایک شخص کا انتقال ہو گیا اور اس نے کچھ سامان بطور ترکہ چھوڑا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا'' کیا اس متوفی کا کوئی وارث ہے؟ لوگوں نے کہا نہیں البتہ ہاں ایک صرف غلام ہے جس کو اس نے آزاد کر دیا تھا''۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کردہ غلام کو ہی میراث دلا دی[1]۔

غلام کے حقوق

اب غلام کے حقوق پر ایک نظر ڈالتے جایئے، پہلے آپ پڑھ چکے ہیں کہ دوسری قومیں غلاموں کے ساتھ کیسا وحشیانہ برتاؤ کرتی تھیں۔ اب ان کو پیش نظر رکھ کر ملاحظہ کیجیے کہ اسلام نے غلام کو کن کن حقوق سے نوازا ہے۔ انسانی اعتبار سے ایک انسان کے جتنے حقوق ہو سکتے ہیں مثلاً جان کا محفوظ ہونا، حدود شریعت میں رفتار و گفتار کی آزادی، نکاح و طلاق کے معاملے میں آزادی، تحصیل علم و کمال میں آزادی۔ یہ سب حقوق اسلام نے غلام کو عطا فرمائے ہیں۔

غلام کا قصاص

ایک انسان کے لیے سب سے زیادہ قیمتی اور عزیز اس کی جان ہے مگر غیر مسلم اقوام متمدنہ کے نزدیک غلام کی جان جانوروں کی جان سے زیادہ قیمتی نہ تھی وہ اگر قتل کر دیا جاتا تو کہیں اس کی داد فریاد نہیں ہو سکتی تھی۔ اسلام کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ اس نے اس معاملہ میں غلام اور حر دونوں کو بالکل برابر رکھا ہے اور جس طرح حر کا قاتل مباح الدم ہے اور واجب القصاص غلام کا قاتل بھی خواہ کوئی حر ہو یا غلام گردن زدنی ہے۔ قرآن مجید میں صاف طور پر ارشاد ہے:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ.

اور ہم نے ان پر فرض کر دیا کہ نفس کے بدلے میں نفس دیا جائے۔

دوسری جگہ فرمایا گیا:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى.

تم پر خون کا بدلہ خون لینا فرض کیا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

اَلْعَمَدُ قَوَدٌ.

قصداً قتل کر دینے میں قصاص کیا جائے۔

ایک اور مقام میں فرمایا گیا ہے:

المسلمون تتکافأ دمائهم [۱۳۶]

مسلمان مسلمان سب کے خون برابر ہیں۔

دیکھو قرآن مجید کی دونوں آیتیں اور یہ دونوں حدیثیں مفہوم کے اعتبار سے عام ہیں یعنی ان سے جس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ حر کا قصاص حر اور عبد دونوں سے لیا جا سکتا ہے ٹھیک اسی طرح یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عبد کے قصاص میں حر اور عبد دونوں کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ اس عموم مفہوم ہی کی بناء پر تمام فقہاء احناف کا اجماع ہے کہ:

يُقْتَلُ الحُرُّ بِالعَبْدِ و العبدُ بالحُرِّ[۱۳۷]

حر کو عبد کے بدلے میں اور عبد کو حر کے بدلے میں قتل کر دیا جائے۔

صاحب کشاف نے نقل کیا ہے کہ سعید بن المسیب، امام شعبی، نخعی، قتادہ اور سفیان ثوری، امام ابو حنیفہ اور ان کے تمام اصحاب کا مسلک یہی تھا۔ مذکورہ بالا دو آیتوں کے علاوہ قرآن مجید میں خود اس کی بھی تصریح کی ہے کہ جو کوئی کسی پر ظلم کرے گا اس کا بدلہ لیا جائے گا یہ حکم بھی عام ہے۔ حر اور عبد کی کوئی تخصیص نہیں، ارشاد ہے:

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ.

جس نے تم پر زیادتی کی ہے تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی کہ اس نے تم پر کی ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا گیا ہے:

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ.

اور اگر تم عذاب دو تو جتنا تم کو عذاب دیا گیا ہے اتنا ہی تم دو۔

ایک اور روایت ہے:

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطَانًا.

اور جو آدمی ظلماً قتل کیا جائے ہم نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے کہ اگر قصاص لینا چاہتا ہے تو لے سکتا ہے

ان آیات کے عموم مفہوم سے صاف ظاہر ہے کہ عبد کا قصاص حر سے بھی لیا جائے گا اور اس کی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے جو خاص عبد سے متعلق ہیں۔

حضرت سمرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ قَتَلَ عَبْدَهٗ قَتَلْنَاهُ وَمَنْ جَدَعَ اَنْفَهٗ جَدَعْنَاهُ.

جو اپنے غلام کو قتل کرے گا ہم اس کو قتل کریں گے اور جو اپنے غلام کی ناک کاٹے گا ہم اس کی ناک کاٹیں گے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

مَنْ خَصٰی عَبْدَهٗ خصیناه.

جو اپنے غلام کو خصی کریگا ہم اس کو خصی کرینگے۔

ابوداؤد میں جس باب کے تحت یہ دونوں حدیثیں درج ہیں انہی کے ساتھ ایک یہ روایت بھی ہے کہ ایک شخص نے اپنے غلام کو اپنی ایک جاریہ کے ساتھ زنا کرتے ہوئے دیکھا غصہ میں آ کر اس کو خصی کر ڈالا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ نے اس شخص کو طلب فرمایا مگر وہ نہیں ملا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام سے فرمایا "جا تو آزاد ہے" غلام نے کہا میری مدد کس کس پر فرض ہے؟ ارشاد ہوا "ہر مسلمان پر"

اعتراض و جواب

امام شافعی اور امام احمد بن حنبل جو حر سے عبد کا قصاص لینے کے مخالف ہیں، ان کا استدلال قرآن مجید کی اس آیت سے ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى.

اے ایمان والو تم پر مقتولین کا قصاص لینا فرض کیا گیا ہے آزاد بدلہ میں آزاد کے اور غلام کے بدلے میں غلام کے اور عورت بدلہ میں عورت کے۔

ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ حر کا بدلہ حر سے اور عبد کا بدلہ عبد سے لیا جائے۔ اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ عبد کا بدلہ حر سے نہیں لیا جا سکتا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ آیت قصاص کے آغاز میں اگرچہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ کا مفہوم عام ہے لیکن آیت کا آخری حصہ اس کے لئے مخصص ہے۔

ہم جواب میں کہتے ہیں کہ اگر آپ مفہوم مخالف کو معتبر مانتے ہیں تو پھر ہر جگہ معتبر ہونا چاہیے الحر بالحر و العبد بالعبد کا اگر مفہوم یہ ہے کہ حر حر ہی کے بدلہ میں اور عبد عبد ہی کے بدلہ میں قتل کیا جا سکتا ہے اور مفہوم مخالف کے اعتبار سے حر عبد کے بدلہ میں قتل نہیں ہو سکتا تو پھر اس طرح اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ کا مفہوم یہ ہوگا کہ حر صرف حر کے قصاص میں قتل کیا جائیگا نہ کہ عبد کے قصاص میں۔ العبد بالعبد کا مفہوم یہ ہوگا کہ عبد صرف عبد کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا نہ کہ حر کے قصاص میں

اور آگے فرمایا گیا ہے کہ الانثیٰ بالانثیٰ تو اس کا مفہوم بھی یہ ہوگا کہ عورت صرف عورت کے بدلے میں قتل کی جائے گی نہ کہ مرد کے بدلے میں۔ حالانکہ امام شافی اور امام احمد بن حنبل یہ دونوں حضرات بھی دوسرے ائمہ کی طرح اس پر متفق ہیں کہ عبد سے جس طرح عبد کا قصاص لیا جاتا ہے عبد سے حر کا اور عورت سے مرد کا قصاص بھی لیا جاسکتا ہے۔ پس جب آپ العبد بالعبد والانثیٰ بالانثیٰ میں مفہوم مخالف کا اعتبار نہیں کرتے تو الحرُ بالحرِ میں اس کا کیوں اعتبار کرتے ہیں، حالانکہ آیت کا ابتدائی حصہ یعنی "کُتِبَ علیکم القصاصُ فِی القتلیٰ" اپنے مفہوم کے اعتبار سے عام ہے اور بطور ایک حکم کلی کے ہے۔ اور پھر قرآن مجید کی دوسری آیتیں وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَاعُوْقِبْتُمْ بِهٖ اور وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَا اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ اس عموم کی موید ہیں اور ان میں قصاص کے متعلق عبد اور حر کی کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے۔ ان آیات کے بعد احادیث کو دیکھیے تو ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حر اور عبد دونوں کے خون کی قیمت برابر ہے اور اس بناء پر عبد کا قصاص حر سے لیا جائے گا۔ ابوداؤد کی روایت جو اوپر گزر چکی ہے اس میں تو یہاں تک تصریح ہے کہ عبد کا قصاص صرف حر سے ہی نہیں بلکہ اگر کوئی مالک اپنے غلام کو قتل کر دے گا تو غلام کے قصاص میں وہ خود بھی قتل کر دیا جائے گا۔ جیسا کے مَنْ قَتَلَ عَبْدَهٗ قتلناه کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔

اور پھر حر و عبد کی یہ مساوات جان کے معاملہ میں ہی نہیں بلکہ اعضاء و جوارح میں بھی ہے جیسا مَنْ جَدَعَ اَنْفَهٗ جدعناه اور من خصی عبده خصیناه سے سمجھ میں آتا ہے۔

رہی حضرت شوافع کی دوسری دلیل یعنی آیت کا دوسرا حصہ اس کی ابتدائی حصہ کے لیے ہی تخصص ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مواقع پر ہم دیکھتے ہیں کہ آیت میں ایک حکم عام بیان کیا گیا ہے لیکن پھر بعد میں اس پر جو حکم متفرع ہوتا ہے وہ اعتبار مفہوم نہیں بلکہ اس عام کے کسی فرد خاص کے لیے ہے۔ مثلاً مطلقہ عورتوں کی عدت کے بیان میں ہے:

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ.

اور عورتیں جن کو ان کے شوہروں نے طلاق دے دی ہے تین حیضوں تک عدت میں بیٹھیں۔

ملاحظہ کیجیے یہاں مُطَلَّقٰت کا لفظ عام ہے۔ ان عورتوں کو بھی شامل ہے جن کو ان کے شوہروں نے تین طلاقیں دی ہیں اور انہیں بھی جنہیں تین سے کم طلاقیں دی گئی ہیں۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے:

فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ.

اور جب یہ عورتیں اپنی مدت عدت کو پورا کر لیں تو تم (اے شوہرو) یا تو انہیں احسان کے ساتھ روک لو اور یا احسان کے ساتھ جانے دو۔

اس کے بعد ہے:

وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ.

اور ان مطلقہ عورتوں کے شوہر عدت کے اندر اندر اپنی مطلقہ عورتوں کو واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔

ظاہر ہے کہ آیت کے یہ دونوں آخری ٹکڑے صرف ان مطلقہ عورتوں کے لیے ہیں جن کو ان کے شوہروں نے تین طلاقیں دے کر مغلظہ نہیں کیا ہیں اب دیکھیے مُطَلَّقٰت کا لفظ عام ہے اور اس پر از راہ عطف جو چیز محمول کی گئی ہے وہ اگر چہ خاص ہے لیکن اس کے خصوص کا اثر مطلقات کے عموم پر نہیں پڑتا وہ اب بھی اپنے عموم پر باقی ہے۔ اسی طرح کتب علیکم القصاص میں بطور عموم جو حکم بیان کیا گیا ہے وہ بہر حال اپنے عموم پر باقی رہے گا اور الحُرُّ بِالحُرِّ میں جو حکم خاص ہے، اس کے لیے مخصص نہیں ہوگا۔ علی الخصوص اس وقت جبکہ اس کے عموم کی تائید دوسری آیات واحادیث سے بھی ہو رہی ہو۔ اسی بناء پر قاضی بیضاوی (جو خود شافعی المذہب میں اپنی تفسیر میں اس آیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

ولا تدل على ان لا يقتل الحر بالعبد والذكر بالانثى كما لا تدل على عكسه [۱۳۸]

اور آیت اس پر دلالت نہیں کرتی کہ حر کو عبد کے بدلے میں اور مرد کو عورت کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائیگا جس طرح اس کے عکس پر دلالت نہیں کرتی۔

قاضی صاحب کی مراد یہ ہے کہ اس آیت سے تو صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حر کو حر کے بدلے میں اور عبد کو عبد کے بدلے میں اور عورت کو عورت کے بدلے میں قتل کیا جائے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ حر کو عبد کے عوض، عورت کو مرد کے عوض اور غلام کو حر کے عوض قتل کیا جاسکتا ہے یا نہیں تو اس آیت سے نفیاً یا اثباتاً اس سے متعلق کوئی حکم مستنبط نہیں ہوتا۔

حافظ ابن تیمیہؒ ایک فاضلانہ بحث میں فرماتے ہیں "اگر کوئی ڈاکو کسی شخص کو قتل کر دے تو خواہ قاتل کتنی ہی اعلیٰ پوزیشن کا مالک ہو، مثلاً مسلمان ہو، یا حر ہو، یا کسی مسلمان حکومت کا باشندہ ہو اور اس کے مقابلے میں خواہ مقتول کیسا ہی پست ہو، یعنی کافر ہو یا غلام" ہو کسی غیر اسلامی سلطنت کی رعیت ہو بہر حال قاتل سے مقتول کی جان کا بدلہ لیا جائے گا اور وہ قتل کر دیا جائیگا [۱۳۹]۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر اس آیت میں حکم تخصیص کے لیے نہیں ہے تو قصاص کا حکم "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى" میں بیان ہو ہی چکا تھا۔ اب اس فرمانے کی ضرورت کیا تھی؟

اس آیت کا شان نزول معلوم کرنے کے بعد اس سوال کا جواب خود بخود ل جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ عہد جاہلیت میں عرب کے دو قبیلوں میں (بعض کے نزدیک اوس وخزرج اور بعض کے خیال میں قریظہ اور نضیر تھے) باہمی سخت لڑائی تھی اور اس سلسلہ میں ایک کے خون دوسرے کے ذمہ واجب الادا تھے۔ ان میں سے ایک قبیلہ نے جو زیادہ طاقتور تھا دوسرے قبیلے سے مطالبہ کیا کہ ہم اپنے غلاموں کے بدلے تمہارے احرار اور اپنی عورتوں کے بدلے میں مرد قتل کریں گے۔ اسلام آیا تو ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حکم بنایا اور اس معاملہ میں آپ سے فیصلہ طلب کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا کوئی حر مارا گیا ہے تو اس کے قصاص میں حر کو مار دو اور غلام قتل کیا گیا ہے تو اس کا قصاص غلام سے لو مگر یہ کیا ظلم ہے کہ مارا جاتا ہے تمہارا غلام اور تم کہتے ہو کہ ہم تمہارے حر کو قتل کریں گے۔ ماری جاتی ہے تمہاری ایک عورت اور تمہارا مطالبہ ہے کہ ایک مرد قتل کرنے کا۔ حالانکہ اصل قاتل کا پتہ نہیں ہے۔ چنانچہ اس آیت کے آخر میں ہے:

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ.

اور جو لوگ اس کے بعد حد سے تجاوز کریں گے ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

اس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حر حر سب برابر ہیں اور اسی طرح عبد عبد سب برابر ہیں خواہ وہ تمہارے قبیلہ کے ہوں، یا کسی غیر کے۔ پس یہ سمجھنا کہ تمہارے عبد کے خون کی مکافات دوسرے قبیلے کے حر کے خون سے ہوگی، سراسر غلط ہے۔ یہ اللہ کی حدود ہیں، جو ان سے تجاوز کرے گا عذاب پائے گا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک شبہ یہ وارد ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے غلام کو قتل کر دے تو فقہ شافعی کا کیا ذکر! فقہ حنفی کی رو سے بھی اس پر قصاص نہیں آتا۔ بلکہ صرف دیت کا ادا کرنا کافی ہوتا ہے تو جب آقا حر ہونے کے باوجود نفس خون کا معاملہ میں عبد سے فائق نہیں ہے تو اس سے قصاص کیوں نہیں لیا جاتا۔

جواب یہ ہے کہ عبد پر یہ کیا موقوف ہے اگر یہ شخص اپنے فرزند ارجمند کو بھی قتل کر دیتا تو اس سے قصاص نہ لیا جاتا۔ اصل یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے:

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا.

اور جو آدمی کہ مظلومیت کے ساتھ قتل کیا جائے ہم نے اس کے سرپرست کے لیے قصاص لینے کا حق رکھا ہے۔

اب وہ فقہاء جو اس بات کے قائل ہیں کہ آقا سے اس کے غلام کا قصاص نہیں لیا جا سکتا فرماتے ہیں کہ عبد مقتول کا ولی تو خود مولی ہی تھا اور اسی نے قتل کیا ہے، اب قصاص لے تو کون؟ مگر ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فقہاء کا ایک گروہ اس کا بھی قائل ہے کہ عبد کا قصاص اس کے آقا سے لیا جائے گا اور ان کا استدلال آیات قصاص کے عموم مفہوم سے ہے[141]۔

غلام کی شہادت

شہادت کا معاملہ کچھ کم اہم نہیں ہے۔ گواہی انہی کی معتبر ہوتی ہے جو صاحب عقل وہوش ہوں اور جن کا قول دوسروں کے حق میں اعتبار کے قابل ولائق سمجھا جائے کسی شخص کی شہادت کا معتبر ہونا اس کی معاشرتی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے۔ رومیوں کے نزدیک غلام کو سوسائٹی میں حقیر وذلیل سمجھا جاتا تھا۔ اس بناء پر وہ غلام کی شہادت کا اعتبار بھی نہیں کرتے تھے لیکن اسلام نے اس کے باوجود کہ اس کے اصول قبول شہادت بہت سخت ہیں غلام کی شہادت کو معتبر مانا ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک سے غلاموں اور باندیوں کی شہادت کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا:

''غلام کی شہادت جائز ہے بشرطیکہ وہ عادل ہو[142]'' اور یہی نہیں بلکہ فرمایا:

مَا عَلِمْتُ اَحَدًا رَدَّ شَهَادَةَ الْعَبْدِ[143]۔

مجھ کو کوئی شخص ایسا نہیں ملا جس نے غلام کی گواہی کو رد کر دیا ہو۔

پھر آگے چل کر اس میں اختلاف ہے کہ غلام کی گواہی خود اس کے سید کے لیے بھی جائز ہے یا نہیں حسن اور ابراہیم اس کو جائز قرار دیتے ہیں اور ابن سیرین اس کا اعتبار نہیں کرتے۔ حضرت شریح سے غلاموں کی شہادت کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا:

كُلُّكُمْ بَنُو عَبِيْدٍ وَاِمَاءٍ.

یعنی تم سب غلاموں اور باندیوں کی اولاد ہو۔

ابن سکن نے فرمایا:

کلکم عبد' واماء.

تم سب غلام اور باندی ہو۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں عمار الذہبی کے طریق سے ابن ابی شیبہ کی جو روایت نقل کی ہے۔ اس میں حضرت شریح کے الفاظ اور بھی زیادہ صاف اور واضح ہو گئے ہیں۔ صورت واقع یہ ہوئی کہ ایک غلام نے کسی معاملہ میں حضرت شریح کے سامنے شہادت دی تو آپ نے اس کو معتبر قرار دیا۔ کسی نے اعتراض کیا کہ یہ تو غلام ہے! آپ نے جواب میں فرمایا:

کُلُنا عَبِیْدٌ وَاُمُّنَا حَوَّاءُ.

ہم سب غلام ہیں اور ہماری ماں حوا ہیں۔[۱۴۳]

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں عقبہ بن الحارث کی ایک روایت بیان کی ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ عقبہ نے ایک عورت ام یحییٰ بنت ابی اہاب سے نکاح کیا تھا کہ ایک سیاہ فام باندی آئی اور کہنے لگی "میں نے تو تم دونوں کو دودھ پلایا ہے"۔ عقبہ کہتے ہیں "میں نے اس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو پہلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعراض فرمایا۔ میں نے پھر دوبارہ ذکر کیا تو ارشاد ہوا: تمہارا نکاح کیونکر درست رہ سکتا ہے جبکہ اس باندی نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے" اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ کو حکم دیا کہ اپنی بیوی کو چھوڑ دیں اس روایت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ غلاموں اور باندیوں کی گواہی معتبر ہے۔ ورنہ فساد نکاح ایسے اہم معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک سیاہ فام باندی کی گواہی کا اعتبار کیوں کرتے پھر اعتبار بھی کیسا! کسی اور گواہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم طلب نہیں فرماتے اور اسی ایک باندی کے کہنے پر شوہر کو بیوی سے الگ ہو جانے کا حکم فرماتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے شہادت عبد کے جواز پر "القیاس فی الشرع الاسلامی" میں بہت پر زور تقریر کی ہے۔ اس تقریر سے صرف مسئلہ شہادت پر ہی نہیں، بلکہ غلام کی اسلامی شخصیت و حیثیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے ہم ذیل میں اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں:

> اگر کسی فقیہ نے کہا ہے کہ غلام کی گواہی کا اعتبار نہیں ہے تو اس سے شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام پر الزام نہیں آتا۔ ورنہ اس کا قول اللہ اور رسول کے فرمان کے بالمقابل ہمارے لیے

حجت ہوسکتا ہے۔ اس طرح کی بات کہنی شارع پر کھلا ہوا بہتان ہے، حضرت شارع کی طرف سے ایک حرف بھی ایسا نہیں آیا جس میں فرمایا گیا ہو کہ غلاموں کی گواہی کا اعتبار نہ کرو۔ اس کے برعکس کتاب اللہ سنت رسول اللہ اور اجماع صحابہ اور میزان عدل یہ سب اس پر دلالت کرتے ہیں کہ غلام کی شہادت ان تمام امور میں معتبر ہونی چاہیے جن میں حر کی شہادت مقبول ہوتی ہے۔ غلام مومن ہے اس بناء پر وہ اللہ کے قول واستشهدوا اشهدين من رّجالكم میں داخل ہوگا جس طرح وما كان محمد ابا احدٍ من رجالكم کے تحت میں داخل ہے اور یہ غلام عادل بھی ہے۔ اس لیے نص اور اجماع کے مطابق وَاَشْهِدُوا ذَوَی عَدْلٍ مِنْكُمْ کے ماتحت داخل ہوگا جس طرح وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول ويحمل هذا العلمَ من كل خلفٍ عدوله کے ماتحت داخل ہے۔ اسی طرح یہ داخل ہے اللہ تعالیٰ کے قول وَاَقِيْمُو الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ اور وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ اور يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ کے ماتحت جس طرح وہ تمام اوامر و نواہی کے ماتحت شامل و داخل ہے رسول اللہ کے قول اَنْ شَهِدَ ذَوَا عَدْلٍ فَصُوْمُوْا وَاَفْطِرُوْا کے تحت میں بھی۔ پس یہ کہنا کہ شارع نے عبد کی شہادت کو نامنظور کیا ہے اور اس کا اعتبار نہیں کیا شہادت بلا علم ہے۔[۱۴۴]

حافظ ابن تیمیہؒ نے شہادت عبد پر بحث کرتے ہوئے چند ایسی باتیں لکھ دی ہیں جن سے عبد کی اسلامی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی لیے ہم نے امام عالی مقام کی تقریر کا خلاصہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ درج کر دیا ہے۔

غنیمت میں غلاموں کی مساوات احرار کے ساتھ

جس طرح شہادت کے معاملہ میں غلام احرار کے مساوی ہیں، مال غنیمت کی تقسیم میں بھی ان کو احرار کے برابر رکھا گیا ہے۔ قرآن مجید میں غنیمت سے متعلق جتنی آیات ہوئی ہیں ان میں کہیں حر اور عبد کی تفریق نہیں ہے۔ اسی بناء پر حضرت ابوبکرؓ بیت المال سے جو وظائف تقسیم کرتے تھے ان میں بھی آزاد اور غلام کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ مشہور مورخ ابن اثیر اپنی تاریخ ''الکامل'' میں لکھتے ہیں:

وَكَانَ يُسَوِّي فِي قَسْمِهِ بين السابقين الاولين والمتاخرين في الاسلام وبين الحُرِّ والعبدِ والذكر والانثى[۱۴۵]۔

حضرت ابوبکرؓ بیت المال کی تقسیم میں برابری کرتے تھے سابقین اولین اور اسلام قبول کرنے کے اعتبار سے متاخرین میں اور آزاد میں اور غلام میں اور مرد میں اور عورت میں۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

كَانَ ابى يقسم لِلحُرِّ وَللعبدِ[۱۴۶]۔

میرے باپ آزاد اور غلام دونوں کے لیے تقسیم کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے دیوان (دفتر) کے مرتب ہو جانے کے بعد جب عطیات و وظائف کے تعیین کی، تو آپ نے پہل ان مہاجرین و انصار کے اسماء گرامی سے کی جو بدر میں شریک ہوئے تھے ان میں سے ہر ایک کے لیے فی کس پانچ ہزار درہم مقرر کیے اور اس میں ان حضرات کے خلفاء اور موالی سب برابر تھے۔

بلاذری کی ایک روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں:

فَرَضَ عُمَرُ لِاَهلِ بدرٍ عربهم ومواليهم في خمسةِ الافٍ وقال لَاُفَضِّلَنَّهُمْ عَلىٰ مَنْ سِوَاهُمْ[۱۴۷]۔

حضرت عمرؓ نے اہل بدر کے عرب اور ان کے موالی کے لیے پانچ ہزار سالانہ کا عطیہ مقرر کیا اور فرمایا کہ میں ان لوگوں کو ان کے ماسوا دوسروں پر فضیلت دوں گا۔

ایک اور روایت میں الفاظ یہ ہیں:

وعمّ لفريضة كل صريح حليف ومولى شهد بدرًا فلم يُفَضِّلْ اَحَدًا على احدٍ.

ایک جماعت نے حضرت عمرؓ کے پاس آ کر ان کے کسی گورنر کی شکایت کی اور کہا کہ وہ عرب کو تو دیتا ہے مگر موالی کو چھوڑ جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے عامل کو لکھا کہ کسی انسان کے شریر ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کو تحقیر کی نظر سے دیکھے[۱۴۸]۔

روایات بالا میں موالی کا لفظ آیا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ آپ کو شبہ ہو کہ اس سے مراد غلام نہیں بلکہ یا تو عجمی مراد ہیں جن کو عرب ازراہ تمسخر "موالی" کہہ دیا کرتے تھے یا آزاد کردہ غلام مراد ہیں اس بناء پر ہم ذیل میں ایک اور روایت نقل کرتے ہیں جس سے بصراحت احرار و عبید کی مساوات ظاہر ہوتی ہے۔

"حضرت عمرؓ نے ایک جریب غلہ (جو یا گیہوں) کو پینے کا حکم دیا، اس کی روٹی پکوائی اور زیتون کے تیل کے ساتھ اس کو ٹھنڈا کیا گیا پھر تیس آدمیوں کو بلایا اور ان کو صبح کا کھانا کھلوایا اور واپس کر دیا۔ شام کے وقت پھر ایسا ہی کیا اور فرمایا کہ ایک آدمی کو دو جریب ماہوار کافی ہیں۔ چنانچہ آپ لوگوں کو مرد، عورت اور غلام سب کو دو جریب ماہوار دیتے تھے[149]"

حضرت عمرؓ نے اہل عوالی کی مردم شماری کرائی اور ان کے وظیفہ مقرر کیے۔ اس کے علاوہ آپ کا معمول تھا، ہفتہ کے روز عوالی جاتے اور جواز کار رفتہ غلام نظر آتا، اس کا ٹیکس معاف کر دیتے۔ ایک روایت میں اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ ہیں:

حضرت عمرؓ نے فرمایا میں نے ہر نفس مسلمہ کے لیے ہر مہینہ میں دو مد (ایک پیمانہ) گیہوں اور دو قسط[150] زیتون کے اور دو قسط سرکہ کے مقرر کر دیے ہیں تو اس پر ایک شخص نے کہا "والعبد؟" یعنی کیا غلام کو بھی اتنا ہی ملے گا۔ آپ نے فرمایا "نعم وللعبد" ہاں اور غلام کو بھی[151]۔

غلاموں کا نکاح

انسانیت کے حقوق میں ایک بڑا حق شادی بیاہ کا ہے۔ اسلام سے پہلے لوگ اپنے آرام و آسائش کے خاطر غلاموں اور باندیوں کو شادی کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ رومن امپائر تہذیب و تمدن کے اعتبار سے امم قدیمہ میں امتیاز خاص رکھتی ہے لیکن اس کے ہاں بھی غلام قانونی طور پر شادی کا حقدار نہیں تھا[152]۔ قران مجید میں ہے:

وانکحو الاَیَامیٰ مِنْکُمْ والصَّالِحِیْنَ من عبادکم وامائکم.

تم اپنی غیر شادی شدہ عورتوں اور اپنے غلاموں اور باندیوں کا نکاح کرو۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں:

وفیه دلیلٌ علیٰ وجوب تزویج المولیۃ والمملوک[153]۔

اور اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ غلام اور باندی کا نکاح کرنا واجب ہے۔

عرب میں کچھ لوگ ایسے تھے جو غلاموں کا بیاہ کر دیتے تھے مگر پھر جب چاہتے میاں بیوی میں تفریق بھی کرا دیتے تھے۔ اسی طرح کا ایک واقع عہد نبوت میں پیش آیا۔ غلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر خطبہ دیا اور فرمایا "لوگو! غلاموں کا نکاح کر کے ان میں تفریق کیوں کرتے ہو، نکاح و طلاق کا حق صرف شوہر کو ہے[154]۔

غلام آزاد عورتوں سے شادی کر سکتا ہے

پھر غلام کے لیے یہ قید و بند نہیں کہ وہ صرف باندی ہی سے نکاح کرے بلکہ حرہ اور شریف عورت سے بھی نکاح کر سکتا ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہؓ کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش سے کیا تھا اور جب دونوں میں نباہ نہ ہوئی اور نوبت طلاق تک پہنچی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان سے نکاح کر لیا۔ یہ واقعہ قرآن مجید میں بھی مذکور ہے۔

امام زین العابدین علی بن الحسینؓ کی والدہ ماجدہ (شہر بانو) امام حسینؓ کی شہادت کے بعد بیوہ ہو گئیں تو امام عالی مقام نے اپنی ماں کا نکاح زبید سے کر دیا جو حسین بن علی کا غلام تھا اور خود اپنی ایک لونڈی کو آزاد کر کے اس سے اپنا نکاح کر لیا۔ عبدالملک بن مروان نے اس پر ان کو عار دلائی۔ آپ نے جواب میں لکھا "ہم سب کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسوۂ حسنہ تھے۔ آپ نے حضرت صفیہ کو آزاد کیا اور پھر خود اپنا نکاح کر لیا۔ اسی طرح آپ نے اپنے غلام زید بن حارثہ کو آزاد کر دیا اور اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش کا نکاح ان سے کر دیا[155]۔

اسی طرح شریف اور حر مرد باندیوں یا آزاد شدہ عورتوں کے ساتھ شادی کر سکتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ شریف و نجیب کون ہو سکتا ہے۔ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جویریہ سے نکاح کیا جو حارث بن ضرار کی بیٹی تھیں۔ جویریہ نے مالک سے مکاتبت کر لی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے بدل کتابت ادا کیا اور آزاد ہونے کے بعد ان کو شرف زوجیت عطا فرمایا۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ ایک غلام نے بنو بیاضہ کے کسی خاندان میں رشتہ کرنا چاہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو پسند فرمایا اور خاندان کے لوگوں سے فرمایا کہ اس رشتہ کو منظور کر لیں۔ انہوں نے کہا "یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو حکم کرتے ہیں کہ اپنی بیٹیوں کے نکاح غلاموں سے کر دیں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ

اے لوگو ہم نے تم کو مردوں اور عورتوں سے پیدا کیا ہے اور مختلف گروہوں اور قبیلوں پر تقسیم کیا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچانو۔ تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مستحق کرامت وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے تحقیق اللہ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

اس آیت کا شان نزول ایک یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دیں۔ حارث بن ہشام اور عتاب بن اسید سن کر غضبناک ہو گئے اور کہنے لگے "کیا یہ غلام حبشی سقف کعبہ پر کھڑا ہو کر اذان دیگا اس پر آیت بالا نازل ہوئی[156]۔

روم میں عام طور پر دستور تھا کہ جب کسی غلام کی لڑکی بیاہی جاتی تو اس کی پہلی شب آقا کے پاس بسر ہوتی تھی۔ مسٹر سید امیر علی لکھتے ہیں کہ اس شرمناک ظلم سے عیسائی بشپ تک نہ چوکتے تھے[157]۔ یہ اس قدر شرمناک بات ہے کہ اسلام تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ عہد جاہلیت میں لوگ باندیوں سے کسب کراتے تھے قرآن مجید میں اس کی حرمت کو بہ صراحت بیان فرمایا گیا:

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا[158]۔

تم اپنی جواری کو زنا پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاکدامنی کی خواہش کریں۔

اور صرف یہی نہیں کہ آقا کو باندی یا غلام کا نکاح کرنا ضروری ہے بلکہ صحیح حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی باندی کو اچھی تعلیم و تربیت دے پھر اس کو آزاد کر کے خود اس سے نکاح کر لے تو اس کو دو اجر ملتے ہیں[159]۔

غلام کتنی عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے؟

غلام کتنی عورتوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے؟ امام مالک کا ارشاد تو اس مسئلہ میں یہ ہے کہ حر کی طرح عبد بھی چار عورتوں کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے اور دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ فرمایا گیا ہے اس میں خطاب عام ہے آزادوں اور غلاموں سب کو شامل ہے[160]۔

امام شافعیؒ، امام ابو حنیفہؒ اور چند دوسرے بزرگ اس کے برخلاف ہیں۔ ان کے نزدیک غلام صرف دو عورتوں سے ہی نکاح کر سکتا ہے لیکن اس کی وجہ جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے یہ کہ غلام دوسرے کے بس میں ہونے کے باعث چار عورتوں کے نان ونفقہ کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔

غلام نصیحت کر سکتا ہے

غیر مسلم قوموں میں غلام کی مجال نہ تھی کہ اپنے مولی کے کسی فعل پر نکتہ چینی کر سکے خواہ وہ کتنا ہی جائز اور درست ہو۔ اگر کسی غلام سے کبھی ایسی کوئی حرکت سرزد ہو جاتی تو غریب پر انسانی زندگی کی تمام نعمتیں ہی حرام کر دی جاتی تھیں لیکن اسلام نے فکری و قولی آزادی کی جس نعمت سے اہل عالم کو نوازا ہے اس سے غلام کو بھی محروم نہیں رکھا گیا۔ اسے حق ہے کہ وہ بغیر کسی خوف و ہراس کے اپنے آقا کے فعل پر نکتہ چینی کرے اور ایسا کرنا اس کے لیے جائز ہی نہیں بلکہ اجر و ثواب کا سبب ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا نَصَحَ لِسَيِّدِهِ وَأَحْسَنَ عِبَادَةَ اللَّهِ فَلَهُ أَجْرُهُ مَرَّتَيْنِ [۱۶۱]

غلام اپنے آقا کو نصیحت کرے اور اللہ کی عبادت بھی اچھی طرح سے بجالائے تو اس کو دوہرا اجر ملتا ہے۔

ابو رافع کو جب آزاد کیا گیا تو وہ رو پڑے۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو کہا "پہلے میرے لیے دو اجر تھے، اب ایک ہی رہ گیا"۔ [۱۶۲] حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں "اگر جہاد فی سبیل اللہ اور حج اور ماں کی اطاعت مانع نہ ہوتی تو میں مملوک ہو کر مرنے کو پسند کرتا" [۱۶۳]

ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے نوجوانی میں اپنے کسی غلام کو کسی بات پر خفا ہو کر ایک طمانچہ مار دیا۔ غلام نے پوچھا آپؒ نے مجھے کیوں مارا آپؒ نے جواب دیا "کیونکہ تو نے قصور کیا تھا" غلام بولا "کیا آپ سے بھی کبھی اپنے آقا کا کوئی قصور ہوا ہے؟ حضرت عمرؒ بولے ہاں ہوا ہے۔ اب غلام نے کہا "تو کیا آپؒ کے آقا نے بھی اسی طرح آپ کو سزا دینے میں جلدی کی ہے؟" حضرت عمرؒ پر غلام کی اس نصیحت کا بڑا اثر ہوا، آپ نے فرمایا "جا تو اللہ کے لیے آزاد ہے" حضرت عمرؒ کو غلام کی نصیحت اس قدر پسند آئی کہ اس واقعہ کے بعد آپ اپنی دعاؤں میں اکثر خدا کو مخاطب کر کے فرمایا کرتے تھے "یا حلیما لا یعجل علیٰ من عصاہ" یعنی اے وہ بردبار خدا جو اپنے گناہگاروں پر جلد عذاب نہیں بھیجتا" [۱۶۴]

غلام کا کھانا

طعام کے اعتبار سے بھی غلام کو کسی فروتر مرتبہ پر نہیں رکھا گیا ہے بلکہ حکم دیا ہے کہ جو آقا کھائے وہی اپنے غلام کو کھلائے۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من لاء مکم من مملوکیکم فاطعموہ مما تاکلون واکسوہ مما تلبسون ومن لا یلائمکم منھم فبیعوہ ولا تعذبوا خلق اللّٰہ [۱۶۵]۔

تمہارا جو غلام منشاء کے مطابق ہو اس کو جو تم کھاتے ہو وہی کھلاؤ جو تم پہنتے ہو وہی پہناؤ اور جو غلام منشاء کے مطابق نہ ہو اس کو بیچ دو اور اللہ کے بندوں کو عذاب نہ دو۔

ایک اور موقع پر زیادہ موثر الفاظ میں فرمایا گیا ہے:

اَرِقَّاءُ کُمْ ارقاء کم اطعموھم مما تاکلون واکسوھم مما تلبسون (ابن سعد)

تمہارے غلام تمہارے ہیں ان کو وہی کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔

حضرت عثمانؓ نے عام طور پر یہ ہدایت کی تھی کہ جو باندی کوئی پیشہ نہیں جانتی تھی اور جو غلام کم عمر ہیں ان کو روپیہ کمانے کی تکلیف نہ دی جائے لیکن اس کے ساتھ ان کو کھانا عمدہ دیا جائے [۱۶۶]۔

پھر اس پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ فرمایا گیا ہے کہ غلام کو اپنے ساتھ بیٹھا کر کھانا کھلاؤ اور اگر وہ ساتھ نہ بیٹھ سکے تو کم از کم ایک لقمہ اپنے ہاتھ سے اسے دے دو کیونکہ اس نے تم کو آگ کی گرمی سے بچایا ہے۔

ابو محذورہؓ کہتے ہیں "میں حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ حضرت صفوانؓ بن امیہ ایک بڑا طباق لیے ہوئے آئے جس کو چند آدمی اٹھائے ہوئے تھے، انہوں نے یہ طباق حضرت عمرؓ کے سامنے رکھ دیا، آپ نے مسکینوں کو اور وہ جو لوگ آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ان کے غلاموں کو بلایا اور سب نے مل کر حضرت عمرؓ کے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر آپ نے فرمایا:

لَعَنَ اللّٰہُ قومًا یرغبون عن ارقائھم ان یاکلو امعھم [۱۶۷]۔

اللہ ان لوگوں پر لعنت کرے جو اپنے غلاموں کے ساتھ کھانا کھانے سے اعتراض کرتے ہیں

غلام کا لباس

یہی برابری لباس کے معاملے میں بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ جیسا کہ احادیث بالا سے واضح ہوتا ہے۔ صحابہ کرام نے اس حکم نبوی کی تعمیل کس طرح کی؟ اس کا اندازہ چند واقعات ذیل سے ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی لڑکیوں کی طرح اپنی باندیوں کو بھی سنہرے زیورات پہناتے تھے۔ ایک دفعہ کچھ لوگ ان سے ملاقات کرنے آ گئے۔ دیکھا کہ ان کے غلام کے گلے میں سونے کا طوق پڑا ہوا ہے۔ ایک دوسرے کی جانب تعجب سے دیکھنے لگے۔ ارشاد ہوا "تمہاری نگاہ برائیوں پر ہی پڑتی ہے"[۱۲۸]۔

ایک مرتبہ حضرت ابوالیسرؓ مختلف قسم کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اسی طرح کے کپڑے ان کے غلام کے جسم پر تھے۔ ایک شخص نے کہا اگر آپ دونوں ایک ایک کپڑا آپس میں بدل لیتے تو ہر ایک کے بدن پر ایک ایک ہم رنگ جوڑا ہو جاتا۔ فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ غلاموں کو وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو"۔ مطلب یہ تھا کہ اگر میرے اور غلام کے جسم پر ایک ایک رنگ کا لباس ہوتا تو مساوات کس طرح باقی رہ سکتی تھی[۱۲۹]۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آپ نے اپنے غلام کو چند درہم دیے کہ ان سے مختلف قیمت کے دو کپڑے خرید لائے۔ کپڑے خرید لائے تو ان میں سے قیمت کے اعتبار سے جو زیادہ باریک اور قیمتاً زیادہ گراں تھا وہ آپ نے غلام کو دے دیا اور جو اس سے گھٹیا تھا خود اپنے لئے رکھ لیا اور پھر غلام سے خطاب کر کے فرمایا "تو اچھے کپڑے کا بہ نسبت میرے زیادہ مستحق ہے کیونکہ تو جوان ہے اور تجھ کو پہننے کی خواہش ہے میں تو بوڑھا ہو چکا ہوں"[۱۳۰]۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک انسان کے گنہگار ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو جو اس کے قبضہ میں ہیں اپنا کھانا نہ کھلائے[۱۳۱]۔

معرور بن سویدؒ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت ابوذرؓ کو "ربذہ" میں دیکھا کہ ان کے اوپر ایک موٹی چادر ہے اور ان کا غلام بھی اسی طرح کی ایک چادر اوڑھے ہوئے ہے۔ ایک جماعت نے کہا کہ اے ابوذر! آپ دوسری چادر کو بھی جو آپ نے غلام کو دے رکھی ہے، اپنی چادر کے ساتھ ملا لیتے تو آپ کے لیے ایک لباس مکمل (حلہ) ہو جاتا اور رہا غلام اسے کوئی اور کپڑا دے دیتے۔ ابوذرؓ نے فرمایا "میں نے ایک شخص جس کی ماں عجمی تھی اس کو ایک مرتبہ گالی دی تھی کہ ناگہاں میں نے

دیکھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے ہیں۔ اس شخص نے حضور سے میری شکایت کر دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے ابوذر تو ایک ایسا شخص ہے جس میں جاہلیت کی خو بو اب تک پائی جاتی ہے" اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الھم اخوالکم فضلکم اللّٰہ علیھم فمن لم یلائمکم فبیعو ولا تعذبوا خلق اللّٰہِ (ابوداؤد باب حق المملوک)

یہ غلام تمہارے بھائی ہیں جن پر اللہ نے تم کو فضیلت دی ہے پس جو غلام تمہاری طبیعت سے مناسبت نہ رکھتا ہو اس کو بیچ دو اور اللہ کے بندوں کو عذاب مت دو۔

ایک اور روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ گرامی یہ ہیں:

اخوانکم جعلھم اللّٰہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدیہ فلیطعمہ مما یاکلُ ولیکسُہُ مما یلبس ولا یکلفہ ما یغلبہُ فان کلّفہ ما یغلبہُ فلیعنہُ۔

غلام تمہارے بھائی ہیں جن کو اللہ نے تمہارے قبضہ میں کر دیا ہے پس جس کا بھائی اس کے قبضہ میں ہو اس کو چاہیے کہ جو خود کھاتا ہے اس کو بھی کھلائے اور جو خود پہنتا ہے وہی اس کو پہنائے اور اس کو ایسے کام کی تکلیف نہ دے جو اس پر شاق ہو اور اگر دے تو اس کی اعانت کرے۔

غلاموں کے ساتھ عام حسن معاشرت

قرآن مجید میں جن جن لوگوں کے ساتھ حسن معاشرت سے پیش آنے کا امر فرمایا گیا ہے انہی میں غلاموں کا ذکر بھی ہے ارشاد ہوتا ہے:

واعبدوا اللّٰہ ولا تشرکوا بہٖ شیئا وبالوالدین احسانًا وبذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین والجار ذی القربیٰ والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبیل وما ملکت ایمانکم اِنّ اللّٰہ لا یحب من کان مختالًا فخورًا۔

اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ بناؤ اور والدین کے ساتھ احسان کرو اور قرابت والوں یتیموں محتاجوں، قرابت والے پڑوسیوں اور اجنبی پڑوسیوں) اور پاس کے بیٹھنے والوں اور مسافروں اور جو لونڈی غلام تمہارے قبضہ میں ہیں ان سب کے ساتھ حسن سلوک کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اتراتے اور بڑائی مارتے پھریں۔

زید بن حارثہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے جو اسلام سے پہلے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے برتاؤ ان کے ساتھ اس قدر کریمانہ تھا کہ لوگ عموماً ان کو زیدؓ بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہتے تھے اور خود زید کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی کہ ایک مرتبہ ان کے خاندان کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ فدیہ لے کر آزاد کر دیجیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "زید سے پوچھ لو، اگر وہ تم لوگوں کے ساتھ جانا چاہتے ہیں تو شوق سے چلے جائیں" زید سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کو اپنے قبیلے کی آزادی پر ترجیح دی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور خادم حضرت شقران صالح تھے، جن کو ان کے آقا حضرت عبدالرحمن بن عوف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطور نذر پیش کر دیا تھا۔ حضرت شقران حبشی نژاد تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی خدمت سے بے حد خوش تھے۔ یہاں تک کے وفات کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص طور سے ان کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت فرمائی [3]۔ حضرت علی فرماتے ہیں:

كَانَ آخر كلام رسول الله صلى عليه وسلم الصلوة اتقوا الله فيما ملكت ايمانكم [4]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری کلام یہ تھا کہ نماز کے خیال رکھو نماز کا۔ جو تمہارے باندی غلام ہیں ان سے معاملہ کرنے میں اللہ سے ڈرو۔

ایک اور مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

حسن الملكة نماء وسوء الخلق شؤم [5]۔

غلام سے اچھا برتاؤ کرنا برکت کا باعث ہے اور بدسلوکی بدنصیبی ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا معاملہ اپنے غلاموں اور باندیوں کے ساتھ یہ تھا کہ ایک مرتبہ آپ کو ایک باندی پنکھا جھل رہی تھی اتنے میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ آپ نے پنکھا لے کر خود اس کو جھلنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو دیکھ کر گھبرائی۔ آپ نے فرمایا "آخر تم بھی میری طرح انسان ہو، تم کو بھی میری طرح گرمی لگتی ہوگی جس طرح تم مجھ کو پنکھا جھل رہی تھیں میں نے بھی تمہیں جھل دیا [6]۔

غلام کا امن دینا معتبر ہے

اسلام میں غلام کا قول ایک حر کی طرح نافذ ہوتا ہے۔ جنگ میں کسی شخص کو امن دینے کا معاملہ بہت ہی اہم ہے۔ اسلام کی عبد نوازی دیکھیے کہ اس معاملہ میں بھی غلام کے قول کو معتبر قرار دیا ہے۔ حضرت عمرؓ ایک سردار کو لکھتے ہیں:

إِنَّ عَبْدَ الْمُسْلِمِينَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَذِمَّتُهُ مِنْ ذِمَّتِهِمْ يَجُوزُ أَمَانُهُ (ابوداؤد فی حق المملوک)

مسلمانوں کا غلام مسلمانوں میں سے ہے اور اس کا عہد بھی مسلمانوں کے عہد کی طرح ہے اس کا امن دینا جائز ہے۔

سوس کی جنگ سے فارغ ہو کر حضرت ابو سبرہ لشکر کو لیے ہوئے جندیا پور پہنچے تو دیکھا کہ رزین عبداللہ بن کلیب پہلے سے وہاں کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں۔ اب ان دونوں نے متفق ہو کر جندیا پور پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ صبح شام جنگ ہوتی تھی۔ اسی اثناء میں مسلمانوں کے ایک غلام نے جس کا نام مکنف تھا شہر والوں کے پاس ایک پروانہ امن لکھ کر بھیج دیا۔ مسلمان اس سے بے خبر تھے۔ کفار نے امن پا کر قلعہ کے دروازے کھول دیے اور باہر چلے آئے۔ مسلمانوں نے پوچھا کیا بات ہے؟ کہنے لگے "تم ہمیں امن دے چکے ہو اور اس کے باوجود لڑنے پر تلے ہوئے ہو"۔ مسلمانوں کو جب اصل واقع کی اطلاع ہوئی تو ان میں سے بعض نے کہا کہ "وہ امن تو غلام کا دیا ہوا ہے معتبر نہیں" اہل جندیا پور بولے "ہم تو تمہارے آزاد اور غلام میں کوئی فرق نہیں دیکھتے۔ تمہارے ایک فرد نے امن دیا ہے تو وہ معتبر ہونا چاہیے" مسلمانوں نے پورے واقعہ کی اطلاع حضرت عمرؓ کے پاس بھیجی تو آپ نے لکھا:

إِنَّ اللّٰهَ عَظَّمَ الْوَفَاءَ فَلَا تَكُونُونَ أَوْفِيَاءَ حَتَّى تَفُوا مَا دُمْتُمْ فِي شَكٍّ أَجِيزُوهُم وَفُوا لَهُم.

اللہ نے وفاء عہد کا مرتبہ بہت بڑا کیا ہے اور تم اس وقت تک اپنے عہد کو پورا کرنے والے نہیں ہو گے جب تک اس کو پورا پورا ادا نہیں کر دو گے جب تک تم کو (کفار کی طرف سے) شک رہے (اور ان کے غدر کا یقین نہ ہو) تم وفا کرتے رہو اور جس چیز کا وعدہ کر دیا ہے دو۔

چنانچہ اسلامی لشکر نے غلام مکنف کے امن کو معتبر قرار دے کر باقی رکھا اور واپس چلے آئے [۷۸]۔

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد مصر کے دور حاضر کا ایک نامور مصنف لکھتا ہے:

ولو لم يعلم هذا العبد من اخلاق اولئك الفاتحين السامية انهم يجيزون امانه و ان اخلاقهم الكريمة ونفوسهم الشريفة فوق كل فاتح محارب لما رمى القوم بالامان واستنزلهم من المعاقل [۷۹]۔

اگر غلام ان عظیم الشان فاتحین کے اخلاق سے متعلق یہ نہ جانتا ہوتا کہ یہ غلام کے امن دینے کا اعتبار کرتے ہیں اور نیز یہ کہ ان کے اخلاق کریمہ اور نفوس شریفہ ہر فاتح سے بلند و بالا ہیں تو یہ کبھی اپنی قوم کے نام امن نامہ نہ بھیجتا اور ان کو قلعوں پر سے نہ اتارتا۔

غلاموں کی تعلیم

اسلامی تعلیم کی رو سے صحابہ کرامؓ نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ غلام اور باندیاں صرف ان کی خدمت کے لیے ہیں۔ بلکہ وہ اپنے بیٹے بیٹیوں کی طرح ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتے تھے۔ ایک دفعہ قیساریہ کے چار ہزار غلام گرفتار ہو کر آئے، تو حضرت عمرؓ نے ان میں سے بعض کو مکتب میں داخل کر دیا [۷۹]۔

حضرت عباسؓ اپنے غلام حضرت عکرمہ کو قرآن و حدیث کی تعلیم دیتے تھے اور وہ سبق یاد نہیں کرتے تو وہ پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتے تھے۔ (دارمی ص ۷۳)

ابو عامر سلیم جو روا ۃ حدیث میں ہیں اپنے متعلق خود کہتے ہیں کہ میں بچپن میں گرفتار ہو کر مدینہ آیا، تو یہاں مجھ کو مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ معلم جب مجھ سے "میم" لکھواتا تھا اور میں اچھی طرح لکھ نہیں سکتا تھا تو کہتا تھا کہ گول لکھو جس طرح گائے کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ (بحوالہ الفاروق)

حمران بن ابان حضرت عثمانؓ کا مشہور غلام ہے آپ نے اس کو خرید کر لکھنا سکھایا اور میر منشی بنایا [۸۰]۔ صحیح بخاری سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مکاتب میں آزاد بچوں کے ساتھ غلاموں کے لڑکے بھی تعلیم پاتے تھے۔ چنانچہ ایک بار حضرت ام سلیمؓ نے مکتب کے استاد سے کہلا بھیجا کہ اون صاف کرنے کے لیے لڑکے بھیج دو مگر آزاد بچے مت بھیجنا [۸۱]۔

ممکن ہے اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ غلاموں کے بچے اتنے حقیر سمجھے جاتے تھے کہ ان سے ہر شخص جب چاہتا کام لے سکتا تھا لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اسی حدیث سے حافظ ابن حجرؒ نے

استدلال کیا ہے کہ معمولی کاموں کے لیے احرار اور عبید دونوں کے لڑکوں سے خدمت لینا جائز ہے۔ رہا یہ امر کہ حضرت ام سلیم نے یہ کیوں کہا کہ "غلام بچے بھیجنا، آزاد بچے نہیں" تو فتح الباری میں اس تفریق سے متعلق حافظ ابن حجر ابن جلال کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

"ام سلیم نے حر کی شرط اس لیے لگائی کہ جمہور علماء کا اتفاق ہے، اگر کوئی شخص کسی نابالغ حر سے یا آقا کی اجازت کے بغیر کسی غلام سے کوئی خدمت لے اور وہ ہلاک ہو جائے تو نابالغ حر کی صورت میں اس شخص کے خاندان (عاقلہ) کو اس کی دیت دینی پڑے گی اور غلام کی صورت میں اس کی قیمت ہی آقا کو ادا کرنی ہوگی اور وہ بھی خود تنہا اس کو ہی"۔

لونڈیوں کی تعلیم و تربیت

غلاموں کی طرح لونڈیوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنے کی بھی ترغیب دی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

"تین شخص ایسے جن کو بڑے اجر ملیں گے۔ ایک وہ جو اپنی باندی کو تعلیم دے اور خوب اچھی تعلیم دے، اس کو ادب سکھائے اور خوب سکھائے اور پھر اس کو آزاد کر کے خود اس سے نکاح کر لے۔ دوسرا وہ شخص جو اہل کتاب تھا اور پھر اسلام لے آیا۔ تیسرا وہ شخص جو اللہ کا حق ادا کرتا ہے اور اپنے سید کی خیر خواہی بھی کرتا ہے"[۱۸۲]

اب کہیے! کسی باندی کے لیے کسی آقا کا گھر (بشرطیکہ وہ اسلام کی تعلیم پر واقعی طور سے عمل پیرا ہونا چاہتا ہے) ایک قید خانہ ہے یا بہترین مدرسہ و تربیت گاہ۔

استبراء کے بغیر جماع کی ممانعت

اسلام سے قبل عرب میں یہ حیثیت عام جاری تھی کہ جو باندیاں جنگ میں گرفتار ہو کر آتی تھیں ان سے استبراء کے بغیر ہی (یعنی یہ معلوم کیے بغیر کہ ان کے حمل ہے یا نہیں) مباشرت کر بیٹھتے تھے اور اس میں حاملہ وغیرہ حاملہ کی کوئی تفریق نہیں کرتے تھے۔ حمل میں جماع کرنے سے جس طرح اختلاط نسب کی قباحت لازم آتی ہے اس سے لونڈی کو نقصان پہنچنے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔ اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈیوں کو مطلقہ عورتوں کے حکم میں شامل کر لیا۔ یعنی جب تک غیر حاملہ باندیوں پر مدت حیض نہ گزر جائے اور حاملہ لونڈیوں کا وضع حمل نہ ہو جائے، ان سے مجامعت کرنا جائز نہیں ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اوطاس [۱۸۳] کی جانب غزوۂ حنین کے دن ایک جماعت بھیجی، دشمن سے جنگ ہوئی اور مسلمان کامیاب رہے۔ اسیران جنگ میں کچھ عورتیں بھی تھیں، ان کے مشرک شوہر موجود تھے۔ اس لیے ان عورتوں کے لونڈیاں ہونے کے باوجود مسلمانوں کی ایک جماعت ان کے ساتھ مباشرت کرنے سے اجتناب کرتی تھی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاۗءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ابو سعید الخدریؓ اس کے بعد الا ماملکت ایمانکم کی تشریح یوں فرماتے ہیں:

ای فھن لھم حلال اذا انقضت عدتھن.

یعنی باندیاں ان کے لیے حلال ہیں جب ان کی عدت گزر جائے۔

وہ عدت کیا ہے؟ خود ابو سعید رضی اللہ عنہ ہی اس واقعہ سے متعلق ایک دوسری روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کر کے فرماتے ہیں:

لا توطاء حامل حتی تضع ولا غیر ذات حمل حتی تحیض حیضۃ [۱۸۴]۔

حاملہ باندی جب تک وضع حمل نہ کرے اور غیر حاملہ پر جب تک حیض نہ گزر جائے اس کے ساتھ تمتع نہ کیا جائے۔

استبراء کا اس قدر اہتمام کیا گیا ہے کہ "حتی تحیض" سے ہی علماء نے استدلال کیا ہے کہ اگر کسی باندی کو بحالت حیض گرفتار کیا گیا ہے تو جواز مباشرت کے لیے اس حیض کا اعتبار نہیں ہوگا اور جب تک اس کو دوسرے حیض سے فراغت حاصل نہیں ہو جائیگی تمتع جائز نہیں ہوگا [۱۸۶]۔

حضرت ابو الدرداء سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی غزوہ میں ایک عورت کو دیکھا جو قریب الولادت تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "لعلہ" تا لبا ان کے مالک نے اس کے ساتھ مجامعت کی ہے۔ لوگوں نے عرض کی "جی ہاں" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لقد هممت ان العنه لعنۃ تدخل معه فی قبره کیف یورثه وهو لا یحل له.

میں نے قصد کیا تھا کہ اس شخص پر لعنت بھیجوں جو قبر میں اس کے ساتھ جائے۔ یہ کیونکر ایسے شخص کو اپنا وارث بناتا ہے جو اس کیلئے حلال نہیں ہے۔

ایک بار حضرت رویفع بن ثابت انصاری نے کسی گاؤں پر حملہ کیا۔ مال غنیمت کی تقسیم کا وقت آیا تو فوج کو ہدایت فرمائی:

من اصاب من هذا السبی فلا یطأها حتی تحیض فانی سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول لا یحل لرجل ان یسقی ماءہ ولد غیرہ۔

جن لوگوں کے حصہ میں یہ باندیاں آئیں جب تک انکو حیض نہ آ جائے وہ جماع نہ کریں میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے" کسی شخص کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنا پانی غیر کے بچے کو پلائے۔

اس حکم سے ایک یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ شریعت اسلام نے اس مسئلہ میں لونڈی کو مطلقہ عورت کا مرتبہ قرار دیا ہے۔ یعنی کسی جنگ میں عورت کا گرفتار ہو جانا ایسا ہی ہے کہ گویا اس کے شوہر نے اس کو طلاق دے کر اس کو اپنے سے جدا کر دیا ہے اور ملکیت کو نکاح کے برابر رکھا گیا ہے جس طرح نکاح میں ایجاب وقبول کر لینے سے ایک اجنبی شخص کے ساتھ تمتع جائز ہو جاتا ہے، کسی عورت کا ملکیت میں داخل ہو جانا بھی اگر جواز مباشرت کا سبب بن جائے تو اس میں کیا قباحت ہے؟ ایجاب وقبول سے نکاح کا منعقد ہو جانا اور الفاظ طلاق سے اس کا فسخ ہو جانا محض ایک اعتبار شرعی ہے۔ پس اگر جنگ میں گرفتار ہونے اور ملکیت کے حاصل ہو جانے میں بھی اس اعتبار شرعی کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو ظاہر ہے یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

غلاموں پر سختی کرنا منع ہے

قاعدہ ہے کہ انسان کو اسی شخص پر زیادہ غصہ آتا ہے اور اپنے اقتدار وتحکم کی نمائش اسی پر زیادہ کرتا ہے جو اس کے قبضہ میں ہوتا ہے اور جس کے متعلق اس کو اپنے مملوک ہونے کا احساس ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جو لوگ غیروں کے حق میں متحمل اور نرم مزاج ہوتے ہیں بسا اوقات خود اپنے ماتحتوں کے ساتھ تند خوئی و درشت مزاجی کا برتاؤ کرتے دیکھے گئے ہیں۔ اسلام نے انسانی فطرت کے اس جذبہ کو بے موقع ابھرنے سے روکنا چاہا ہے۔ غلام کے ساتھ نرم معاملہ کرنے میں غالباً تمام امم قدیمہ میں اہل فارس زیادہ نمایاں ہیں لیکن ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ ان کے ہاں بھی قانون یہ تھا کہ غلام سے اگر پہلی مرتبہ خطا سرزد ہوئی ہے تو اس کو سخت سزا نہ دی جائے۔ البتہ اگر دوسری مرتبہ وہ پھر اس کا اعادہ کرتا ہے تو آقا کو حق ہے اس کو قتل کر دے یا جو سزا مناسب معلوم ہو اس کو دے[185]

اسلام نے اس بارے میں جو تعلیم دی ہے وہ وہی ہے جو ایک دین فطرت اور مذہب حق کی ہو سکتی ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ غلام سے کوئی فعل صادر ہوتا ہے اور آقا اس کو اپنے زعم میں موجب سزا قرار دے کر اپنے تئیں سزا دینے کا حقدار سمجھتا ہے۔ اس قسم کے مواقع میں اکثر دھوکا ہو جاتا ہے۔ سزا دینے کے بعد آقا کو محسوس ہوتا ہے کہ میں نے سزا نہیں دی بلکہ ایک ناکردہ گناہ پر ظلم کیا ہے۔ اب وہ نادم و شرمسار ہوتا ہے اور اپنے کیے پر محجوب و منفعل۔ آقا کو انفعال سے اور غلام کو مظلومیت بے جا سے بچانے کے لیے ہی اسلام نے اولاً معاف کرنے کا حکم دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! "ہم غلام سے کتنی مرتبہ درگزر کریں" آپ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ سائل نے پھر سوال کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر بھی خاموش رہے۔ اس نے تیسری مرتبہ پھر سوال کا اعادہ کیا۔ اب آپ نے ارشاد فرمایا:

اعفو اعنه فی کل یوم سبعین مرہ[۱۸۸]

ہر روز ستر مرتبہ اس سے درگزر کرو۔

کہا جا سکتا ہے کہ جس حدیث کا یہ ٹکڑا ہے اس میں مملوک یا عبد کا لفظ نہیں آیا، بلکہ خادم کا لفظ آیا ہے۔ اس لیے یہ حکم صرف نوکروں کے ساتھ مخصوص ہونا چاہیے جواب یہ ہے کہ اول تو امام ابو داؤد نے اس حدیث کو "باب فی حق المملوک" کے ماتحت درج کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خادم سے مراد مملوک ہی لیا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ "وہ آزاد ہے" یا اس کو آزاد کرنے کا حکم دیا ہے" اس طرح کے الفاظ عبد مملوک کے لیے ہی بولے جا سکتے ہیں۔

لیکن اگر معاف کر سکنے کا امکان نہ ہو اور سزا دینی ضروری ہو تو عقوبت بقدر گناہ و خطا ہونی چاہیے۔

ہلال بن یساف سے روایت ہے فرماتے ہیں ہم سوید بن مقرن کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم میں ایک سن رسیدہ بزرگ بھی تھے جن کے مزاج میں ذرا تیزی تھی، ان کے ساتھ ایک جاریہ تھی، کسی بات پر بگڑ کر انہوں نے اس کے منہ پر طمانچہ مار دیا۔ اس پر سوید بن مقران اس قدر غضبناک ہوئے کہ ایسے کبھی نہ دیکھے گئے تھے۔ پھر فرمایا۔ "کیا مارنے کے لیے جاریہ کا شریف چہرہ ہی رہ گیا تھا، تم ہمیں جانتے ہو ہم مقرن کے سات بیٹے تھے اور ہمارے ہاں صرف ایک جاریہ تھی۔ ایک مرتبہ ہم میں سے سب سے چھوٹے نے اس کے چہرہ پر طمانچہ رسید کر دیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے آزاد ہونے کا حکم دیا۔

اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت سوید بن مقرن کے صاحبزادہ "معاویہ" سے مروی ہے جس میں وہ کہتے ہیں میں نے ایک مرتبہ اپنے غلام کے طمانچہ مارا۔ اس پر میرے باپ (سوید بن مقرن) نے مجھ کو اور اسے دونوں کو بلایا اور غلام سے کہا کہ تو اپنا قصاص معاویہ سے لے۔ اس کے بعد انہوں نے وہی واقعہ نقل کیا جو اوپر مذکور ہو چکا ہے۔

حضرت عمر کے پاس سفیان بن الاسود کی ایک جاریہ آئی اور شکایت کی کہ سفیان نے مجھ کو ایک جلتی انگیٹھی پر بیٹھا دیا۔ حضرت عمرؓ نے فوراً اس کو آزاد کرنے کا حکم دیا اور وہ آزاد کر دی گئی۔

ایک مرتبہ ایک شخص [۱۸۹] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری ایک باندی ہے جو میری بکریوں کو چراتی ہے اس سے ایک بکری گم ہو گئی، میں نے پوچھا تو کہنے لگی "بھیڑیا لے گیا" مجھ کو بڑا غصہ آیا، آخر انسان تھا ہی، میں نے اس کے ایک چپت مار دیا اب اگر حکم ہو تو میں اس خطا کے بدلے میں اسے آزاد کر دوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باندی کو بلایا اور دریافت کیا کہ: خدا کہاں ہے؟ وہ بولی آسمان میں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: میں کون ہوں؟ اس نے کہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا "اس کو آزاد کر دو"

زاذان کہتے ہیں، ایک مرتبہ میں حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس آیا، وہ اپنے ایک غلام کو آزاد کر چکے تھے۔ انہوں نے زمین سے ایک لکڑی یا کوئی اور چیز اٹھائی اور اس کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے "میرے لیے غلام آزاد کرنے میں اس چیز کے برابر بھی اجر نہیں ہے۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، فرماتے تھے:

مَنْ لَطَمَ مَمْلُوكَهُ أَوْ ضَرَبَهُ فَكَفَّارَتُهُ أَنْ يُعْتِقَهُ

جس کسی شخص نے اپنے غلام کے طمانچہ مارا، یا زدوکوب کیا اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اسے آزاد کر دے۔

ایک شخص کے پاس دو غلام تھے جن کے وہ بہت شاکی تھے۔ یہ ان کو مارتے اور برا بھلا کہتے تھے لیکن وہ باز نہیں آتے تھے۔ بالآخر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اور غلاموں کی اس سرکشی کا علاج پوچھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمہاری سزا اگر ان کے قصور کے مطابق ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ورنہ سزا کی جو مقدار زائد ہو گی اس کے برابر خدا تم کو بھی سزا دے گا۔ یہ سن کر وہ بے قرار ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ شخص قرآن نہیں پڑھتا جس

میں ہے: وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ وہ کہنے لگے یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہتر یہ ہے کہ میں اس غلام کو اپنے سے جدا کردوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ رہیں کہ یہ دونوں آزاد ہیں[191]۔

اگر کوئی شخص غلام کے ساتھ سختی کا معاملہ کرے اس کو شدید تکلیف پہنچائے تو اس صورت میں اس پر سب کا اتفاق ہے اگر غلام کسی حاکم کے پاس اس کا مرافعہ کرے تو اس کو چاہیے کہ آقا کا جرم ثابت ہونے پر اس کو قرار واقعی کی سزا دے۔ البتہ غلام کے خود بخود آزاد ہو جانے میں اختلاف ہے لیکن امام مالک، ان کے اصحاب اور لیث کا مذہب یہی ہے کہ غلام آزاد ہو جائے گا خواہ اس کا آقا اس کو آزاد کرے یا نہ کرے اور اس کا ولاء اس کو ملے گا[192]۔

غلاموں سے سخت کام نہ لینا چاہیے

احادیث و آثار میں کثرت سے جگہ جگہ امر فرمایا گیا ہے کہ غلاموں سے ان کی ہمت و طاقت کے مطابق کام لینا چاہیے۔ ایک بار ایک شخص حضرت سلمان فارسیؓ کے یہاں آیا، دیکھا کہ بیٹھے ہوئے آٹا گوندھ رہے ہیں۔ بولا "غلام کہاں ہے؟" فرمایا "ایک کام کے لیے گیا ہے۔ اب یہ پسند نہیں کہ اس سے دو دو کام لوں[193]۔"

حضرت عثمانؓ کی عادت تھی کہ رات کو اٹھ کر وضو کا پانی خود لیتے اور خادم کو نہیں جگاتے تھے۔ کسی نے سبب پوچھا تو فرمایا "رات ان کے آرام کرنے کے لیے ہے[194]۔"

لعنت کی ممانعت

کسی غلام کو ملامت نہ کرنے کا یہ اثر تھا کہ صحابہ کرام لونڈیوں اور غلاموں کو کوئی برا کلمہ بھی نہیں کہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اپنے ایک دوست سے ملنے آئے جو اس وقت وہاں موجود نہ تھے حضرت ابن مسعودؓ نے دوست کی بی بی سے پانی طلب کیا، انہوں نے اپنی لونڈی کو بھیجا کہ پڑوس میں سے دودھ لے آئے، اتفاقاً اس کو آنے میں دیر ہوئی، بی بی نے غصہ میں آ کر اس پر لعنت بھیجنی شروع کر دی۔ حضرت ابن مسعودؓ یہ سن کر فوراً گھر سے نکل آئے۔ ان کے دوست آئے تو کہنے لگے۔ "آپ سے کیا پردہ تھا گھر میں آ کر بیٹھتے، کچھ کھاتے پیتے" بولے "سب کچھ کر لیا مگر آپ کی بیوی نے باندی غریب پر لعنت بھیجی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے" اگر لعنت اس شخص کو کی جائے جو لعنت کا مستحق نہ ہو تو لعنت لوٹ کر لعنت بھیجنے والے پر ہی پڑ جاتی

ہے"۔ اس بناء پر مجھ کو خوف ہوا کہ شاید یا کسی معذور ہوا اور وہ لعنت آپ کی بی بی پر لوٹ کے آئے اور میں اس کا سبب بنوں ۔[195]

ایک شب میں عبدالملک اٹھا اور اپنے ملازم کو آواز دی، اس کو آنے میں دیر ہوئی تو اس نے اس پر لعنت بھیجنی شروع کردی۔ حضرت ام الدرداء اس کے محل میں تھیں۔ صبح کے وقت کہنے لگیں "تم نے رات اپنے خادم پر لعنت بھیجی ہے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "لعنت بھیجنے والے قیامت کے دن شفعاء یا شہداء نہیں ہوں گے"۔[196]

غلام پر تہمت تراشی

بخاری میں حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ قذف مَمْلُوْكَهُ وهو برئ مِمّا قَالَ جُلِدَ يوم القيامَةِ اِلَّا اَنْ يكون كَمَا قَالَ.

جو شخص اپنے کسی غلام پر تہمت لگائے اور وہ اس سے بری ہو اس کو قیامت کے دن کوڑے لگائے جائیں گے مگر یہ کہ ایسا ہی ہو جیسا کہ اس نے کہا ہے۔

ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں:

جُلِدَلَهُ يوم القيامةِ حدًا .

بطور حد کے اس کو قیامت کے دن سزا دی جائے گی۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی اس پر قذف جاری ہوگی اس کے متعلق مہلب کہتے ہیں کہ تمام آئمہ کا اجماع ہے کہ آقا پر حد قذف لگائی جائے گی لیکن حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں مہلب کے اس قول کے متعلق "فیہ نظر" (اس میں کلام ہے) کہا ہے اور حضرت نافع سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے ایک مرتبہ سوال کیا گیا کہ جو شخص کسی ام ولد پر تہمت لگائے اس کا حکم کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا:

يُضْرَبُ الحدَّ صَاغِرًا.

ذلیل کرنے کے لیے اس کو حد ماری جائے۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ ابن منذر کہتے ہیں کہ امام مالکؒ اور ایک جماعت نے بھی کہا ہے کہ ام ولد کے قاذف پر حد جاری کی جائے گی۔

غلام اگر خدا کی دہائی دے تو نہ مارو

غلام خواہ کسی واقعی خطا پر ہی مارا جا رہا ہو اگر بچے بچے اللہ کا نام لے دے (دہائی دے) تو حکم ہے کہ اس سے ہاتھ روک لینا چاہیے۔ ارشاد نبوی ہے:

إِذَا ضَرَبَ أَحَدُكُمْ خَادِمَهُ فَذَكَرَ اسْمَ اللّٰهِ فَلْيُمْسِكْ ۔[197]

تم میں سے کوئی شخص اپنے نوکر کو مار رہا ہو اور وہ اللہ کا نام لے تو اس سے ہاتھ روک لینا چاہیے۔

غلام کے لیے حدود و عقوبات

از روئے احکام فقہ غلاموں کے لیے حدود و عقوبات بہ نسبت احرار کے نصف ہیں۔ مثلاً جس جرم کی پاداش میں حر کے لیے اسی کوڑے ہیں اگر وہ جرم غلام سے سرزد ہوگا تو اس کو چالیس کوڑے مارے جائیں گے۔ حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ یہ اس لیے ہے کہ غلاموں کے آقا ان پر حد سے زیادہ مظالم نہ کریں۔ فرماتے ہیں:

فلو شرع فيهم مزجرة بالغة اقصى المبالغ لفتح ذلك باب العدوان بان يقتل المولى عبده ويحتج بانه زان ولا يكون سبيل المواخذة عليه فنقص من حدهم وجعل مالا يفضي الى الهلاك ۔[198]

اگر غلاموں کے لیے انتہائی سزا (جو آزاد لوگوں کے لیے ہے) شروع کر دی جائے تو اس سے ظلم و جور کا دروازہ کھل جائے گا اس طرح کہ ایک آقا اپنے غلام کو قتل کر دیگا اور بہانہ کریگا کہ اس نے زنا کیا تھا اور پھر اس سے کوئی باز پرس بھی نہیں ہوگی۔ اس بناء پر غلاموں کے حدود کو اس حد تک کم کر دیا گیا ہے کہ ہلاکت پر منتج نہ ہوں۔

اس خوف سے کہ کہیں غلام کی سزا اس کی خطا سے نہ بڑھ جائے آقا کو حد درجہ محتاط رہنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

من ضرب غلاماً له حداً لم ياته اولطمه فانّ كفارته ان يعتقه.

جو شخص اپنے غلام کو بطور حد کسی ایسی خطا پر مارتا ہے جو اس نے نہیں کی یا اس کے طمانچہ مارتا ہے اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اس کو آزاد کردے۔

صحابہ کرامؓ اس کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے کہ کہیں غلام کو محض غلام ہونے کی وجہ سے زیادہ سزا نہ مل جائے۔ ایک غلام نے ایک شخص کے باغ سے کھجور کا خوشہ چرا لیا۔ مروان بن الحکم اس وقت مدینہ کا گورنر تھا۔ باغ کے مالک نے اس کے سامنے غلام کے خلاف شکایت کی۔ مروان نے غلام کو قید کر دیا اور چاہا کہ اس پر حد سرقہ جاری کر کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ غلام کا آقا حضرت رافع بن خدیج ؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور معاملہ جیسا کچھ تھا ان کے روبرو پیش کر دیا۔ انہوں نے کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ پھل کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا"۔ اس نے کہا "تو ذرا مروان کو بھی آپ یہ حدیث سنا دیجیے" حضرت رافع گئے اور مروان کو یہ حدیث سنائی تو اس نے غلام کو فوراً رہا کر دیا[199]۔

غلام کو خصی کرنے کی ممانعت

غلام کو خصی کرنے کی رسم بد بہت پرانی تھی۔ اشوری، بابلی اور قدیم مصری ان سب کے ہاں اس کا قدیم سے رواج تھا۔ انہی لوگوں سے یونانیوں نے اختیار کیا۔ پھر رومیوں اور فرنگیوں میں بھی اس کا رواج عام ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دو ہزار برس قبل اشوریا کی ملکہ سمیرامس نے اس رسم بد کی ایجاد کی تھی۔

خصی کرنے سے غرض یہ تھی کہ غلام زنان خانہ میں آ جا سکیں اور عورتوں کے پاس اٹھنے بیٹھنے سے ان کے متعلق کوئی اندیشہ نہ ہو۔ اسلام کے بعد بھی غیر مسلم اقوام میں غلاموں کو خصی کرنے کا رواج بہت زیادہ رہا۔ اس مقصد کے لیے خاص خاص کارخانے تھے جہاں صقلی غلام بچپن ہی سے خصی بنا دیے جاتے تھے اور پھر بازار میں ان کی قیمت بھی زیادہ لگتی تھی۔ بعض بعض غریبوں پر تو اس عمل جراحی کا اثر اتنا شدید ہوتا تھا کہ وہیں مر جاتے تھے۔ شاہان فرنگ کی عادت تھی کہ اندلس کے مسلمان بادشاہوں سے تقرب حاصل کرنے کے لیے خصی غلاموں کا نذرانہ پیش کیا کرتے تھے۔ برشلونہ اور ترکونہ کے بادشاہوں نے مستنصر باللہ سے صلح کی تجدید چاہی تو بیس غلام بہ طور تحفہ پیش کیے[200]۔

ظاہر ہے اسلام ایسا دین حق اس طرح کے بہیمانہ افعال کی اجازت کیونکر دے سکتا تھا۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ خَصَى عَبْدَهُ خَصَيْنَاهُ[201]۔

جو کوئی شخص اپنے غلام کو خصی کرے گا ہم بھی اس کو خصی کریں گے۔

زنباع بن سلامۃ الجذامی نے ایک مرتبہ ایک غلام کو اپنی جاریہ کے ساتھ مخالطت کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ انہوں نے غصہ میں غلام کی ناک کاٹ لی اور اسے خصی کر دیا۔ غلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور پورا واقعہ کہہ سنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زنباع سے دریافت کیا "تم کو ایسا کرنے پر کس نے آمادہ کیا۔ زنباع نے جو اصل واقعہ تھا بیان کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام سے فرمایا "جا تو آزاد ہے"۔[۲۰۲]

جبر سے منع

سلمۃ بن محبق سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کی باندی سے مباشرت کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو معاملہ پیش ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِن كَانَ اسْتَكْرَهَهَا فَهِيَ حُرَّةٌ وَعَلَيْهِ لِسَيِّدَتِهَا مِثْلُهَا وإن كانت طاوعته فهي لَهُ وَعليهِ لِسَيِّدَتِها مثلُها.

اگر اس شخص نے باندی پر جبر کیا ہے تو وہ آزاد ہے اور اس کو باندی کی مالکہ کے لیے تاوان ادا کرنا ہوگا لیکن اگر باندی نے بارضا و رغبت ایسا ہونے دیا ہے تو وہ باندی اس کی ہے اور جماع کرنے والے کو تاوان دینا ہوگا۔

حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں، یہ حدیث حسن ہے، اگرچہ بعض نے اس میں کلام کیا ہے[۲۰۳]۔ اسی سلسلہ میں امام موصوف لکھتے ہیں کہ جو شخص اپنے غلام کو مثلہ (بدہیبت و بدشکل) کرے گا غلام آزاد ہو جائے گا۔ امام مالکؒ، امام احمدؒ اور دوسرے بزرگوں کا مذہب یہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق آثار منقول ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب مثلاً حضرت عمرؓ سے بھی۔ امام عالی مقام کسی فحش کام پر جبر کرنے کو بھی مثلہ کرنے میں شامل مانتے ہیں"[۲۰۴]۔

غلاموں کی عیادت

اسود بن ابی زید سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ جب کوئی وفد حضرت عمرؓ کے پاس آتا تھا تو آپ اس سے دریافت کرتے تھے "تمہارے علاقے کا گورنر کیسا ہے؟ وہ کہتے بہت اچھا آدمی ہے"۔ پھر آپ دریافت کرتے "وہ تمہارے بیماروں کی عیادت کرتا ہے" جواب دیتے "جی ہاں" آپ سوال کرتے کہ "غلاموں کی عیادت کرنے بھی جاتا ہے یا نہیں؟" وہ کہتے کہ "ہاں جاتا

ہے"۔ بعد ازاں آپ دریافت کرتے کہ "ضعیفوں اور کمزوروں کے ساتھ اس کا برتاؤ کیسا ہے؟ ان غریبوں کو اس کے دروازے پر بیٹھنے کی اجازت بھی ہے یا نہیں"۔ وہ اثبات میں جواب دیتے۔ اگر ان سوالات میں سے کسی ایک سوال کے جواب میں بھی یہ لوگ "نہیں" کردیتے تو حضرت عمرؓ گورنر کو معزول کر دیتے تھے۔[205]

غلام کی دعوت قبول کرنا

بزاز نے جابرؓ سے۔ ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غلاموں اور باندیوں کی دعوت قبول کرتے تھے اور ان کے ہاں تشریف لی جاتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک درزی غلام کے پاس تشریف لے گئے، اس نے خدمت اقدس میں ایک پیالہ پیش کیا، جس میں کدو پڑا ہوا تھا۔ حضور پرنور نے اس کو بڑی خوشی کے ساتھ قبول فرمالیا اور تناول کیا۔[206]

غلام امامت کرتے تھے

آج کل مسجدوں کی امامت بالعموم ایسے لوگوں کے سپرد ہوتی ہے جو علم و فضل اور شرف و کمال کے اعتبار سے کسی بلند شخصیت کے مالک نہیں ہوتے لیکن درحقیقت اسلام میں یہ بہت بڑا شرف و امتیاز ہے جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف فرما رہے خود نماز پڑھاتے رہے۔ اخیر وقت میں آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا، جس سے اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت حضرت ابوبکرؓ کو ہی ملنی چاہیے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ امامت صلوٰۃ کی اس اہمیت کو معلوم کرنے کے بعد آپ کو شاید تعجب ہو کہ یورپ اسلام کے جس غلام کو انتہا درجہ کا ذلیل و خوار سمجھتا ہے وہ مسلمانوں میں اتنا معظم و محترم ہے کہ نماز کی امامت کرتا ہے اور بڑے بڑے صحابہ جلیل المرتبت اس کی اقتداء میں نماز پڑھتے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ابو حذیفہ کے غلام سالمؓ نماز میں امامت کرتے تھے اور آپ کی اقتداء میں مہاجرین اولین جن میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ، ابوسلمہؓ، زیدؓ اور عامر بن ربیعہؓ بھی شامل ہیں، نماز پڑھتے تھے۔[207]

امام بخاری روایت مذکور کو جس باب کے ماتحت لائے ہیں اس کا ترجمہ استقضاء الموالی واستعمالھم ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں حدیث کے ساتھ ترجمہ کی

مناسبت پر لکھی ہے کہ امامت صلوٰۃ دینی کاموں میں سب سے بڑا اور اہم کام ہے اور جب اس حدیث کے مطابق ایک غلام اس شرف کا مستحق سمجھا جا سکتا ہے تو گورنری، تحصیلداری اور ججی وغیرہ ایسے عہدوں پر بدرجہ اولیٰ فائز ہو سکتا ہے [۲۰۸]۔ حضرت عمرؓ نے جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو کوفہ کا قاضی بنا کر بھیجا تو عمار بن یاسر کو جو آزاد کردہ غلام تھے کوفہ کا امام نماز اور کپتان فوج بنایا [۲۰۹]۔

اس سے زیادہ موثر یہ واقعہ ہے کہ ابو سفیان جو عبداللہ بن احمد کے غلام تھے بحالت غلامی نماز پڑھاتے تھے اور بڑے بڑے صحابہ ان کی اقتداء میں بغیر کسی قسم کے اکراہ کے نماز ادا کرتے تھے چنانچہ داؤد بن الحصین کے الفاظ یہ ہیں۔ أنّ اباسفیان کان یوم بنی عبد الاشھل فی مسجد ھم و ھو مکاتب فی رمضان و فیھم قومٌ قد شھدو ابدرًا او العقبۃ۔

ایک مرتبہ جبکہ ابو سفیان مکاتب بھی نہیں ہوئے تھے بلکہ عبد مملوک تھے یہ نماز پڑھا رہے تھے محمد بن مسلمہ اور سلمہ بن سلامۃ جو مشہور صحابی ہیں وہاں سے گذرے تو میری قرأت سننے کے لیے کھڑے ہو گئے اور سننے کے بعد فرمایا "ماھٰذا من امام ہامٍ" [۲۱۰]۔

ذکوان حضرت عائشہؓ کے غلام تھے جن کو انہوں نے مدبر کر دیا تھا۔ یہ بھی قریش کی امامت کرتے تھے، عبداللہ بن ابی ملیکہ کا بیان ہے کہ جب حضرت عائشہؓ مقام حراء اور تبیر کے درمیان مقیم تھیں تو ان سے ملنے کے لیے قریش کے بڑے بڑے وفد آتے تھے، دوران ملاقات نماز کا وقت ہو جاتا تھا عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکر امامت کرتے تھے اور وہ اگر موجود نہیں ہوتے تھے تو ذکوان (فناہاذکوان) نماز پڑھاتے تھے [۲۱۱]۔

غلام کی ملکیت

اسلام سے پہلے جو غلام ہوتے تھے کسی چیز کے مالک نہیں ہو سکتے تھے لیکن اسلام نے غلام معتق کی ملکیت کو تسلیم کیا ہے۔ بریرہؓ حضرت عائشہؓ کی باندی تھیں۔ کسی شخص نے آپ کو گوشت ہبہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو دریافت کیا "کچھ ہے؟" بولیں کہ "جی گوشت موجود ہے مگر فلاں نے مجھ کو صدقہ دیا ہے"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لکِ صدقۃ ولنا ھَدِیَّۃٌ۔

وہ گوشت تیرے لیے صدقہ ہے مگر ہمارے لیے ہدیہ ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غلام بھی اشیاء کا مالک ہو سکتا ہے۔ پہلے گزر چکا ہے۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے وظائف وعطیات مقرر کیے تو ان میں غلاموں کا بھی حصہ تھا۔ پس اگر غلام کے لیے ملکیت نہ ہوتی تو حضرت عمرؓ کیوں غلاموں کا حصہ ان کے آقاؤں سے الگ مقرر کرتے۔

غلامی غلاموں کے لیے رحمت تھی

اسلام کی ان تعلیمات کا یہ نتیجہ تھا کہ غلاموں کو بزمانہ غلامی ایسی راحت وآسائش ملتی تھی جو انہیں آزاد ہونے کے بعد بھی یاد آتی تھی۔ بلکہ بعض بعض غلاموں کا حال تو یہ تھا کہ آزادی کا پیغام سنتے ہی دل گرفتہ وحسرت زدہ ہو کر رہ جاتے۔ ابو رافع کو آزاد کیا گیا تو رونے لگے۔ لوگوں نے سبب دریافت کیا۔ فرمایا کہ پہلے میرے لیے دو اجر تھے، اب ایک ہی اجر رہ گیا[۲۱۲]۔

بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے تھے "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر جہاد نہ ہوتا اور حج اور ماں کے ساتھ نیکی کرنے کا فرض مجھ پر عائد نہ ہوتا تو میں اس بات کو پسند کرتا کہ میں مروں درانحالیکہ میں غلام ہوں[۲۱۳]۔

غلاموں کے لیے اجر کی زیادتی

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جنت میں سب سے پہلے جانے والا وہ غلام ہے جو اللہ کی اور اپنے آقا کی اطاعت کرتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ جنت میں نہ بخیل داخل ہوگا نہ دھوکہ باز اور نہ وہ جو اپنی ملکیت کو برے طور سے استعمال کرتا ہے اور جنت کا دروازہ کھٹکھٹانے میں وہ لوگ سب سے پہلے ہوں گے جو غلام ہیں اور وہ اللہ کے اور اپنے حقوق ادا کرتے ہیں[۲۱۴]۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص جنت میں داخل ہو کر دیکھے گا کہ اس کا غلام اس سے اوپر کے درجہ میں ہے۔ وہ کہے گا "اے خدایا یہ تو میرا غلام ہے" جواب ملے گا "میں نے اس کو اس کے عمل کا اور تجھ کو تیرے عمل کا بدلہ دیا ہے[۲۱۵]"۔

غلام سیادت کرتے تھے

غلاموں کو سوشل زندگی میں احرار کے ساتھ پوری مساوات تھی۔ اسلام کی ان تعلیمات کا اثر یہ تھا کہ مسلمان غلاموں اور باندیوں کی تعلیم وتربیت میں بالکل اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی طرح

اہتمام کرتے تھے اور ان کو فضل و ہنر اور علم و ادب کے حاصل کرنے میں پوری آزادی تھی اور پھر علم و کمال کے زیور سے آراستہ ہو کر جو غلام سوسائٹی میں آئے، ان کی کما حقہٗ تعظیم و تکریم کی گئی۔ غلامی کا نشان داغ ان کے فضل و کمال کے لیے ساتر نہیں ہو سکا۔ امارت و سیادت کے لیے صرف حسن قابلیت اور اس عہدہ کی اہلیت و لیاقت شرط تھی غلام اور آزاد کا اس میں کوئی فرق نہیں تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کی مہم پر لشکر بھیجنا چاہا تو اس کی قیادت حضرت اسامہؓ کے سپرد کی حالانکہ وہ اس وقت صرف اٹھارہ برس کے نوجوان غلام تھے۔ اس فوج میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابی شریک تھے۔ سب نے اسامہؓ کی اطاعت کی۔ خلیفۂ اسلام حضرت ابوبکرؓ دور تک لشکر کی مشایعت کو تشریف لے گئے اور اس شان سے کہ اسامہ گھوڑے پر سوار تھے اور ابوبکر صدیقؓ ان سے لگے ہوئے پاپیادہ چل رہے تھے۔ حضرت اسامہؓ بولے یا تو آپ سوار ہو جائیں ورنہ میں بھی پیدل چلوں گا۔ آپ نے فرمایا "نہیں اللہ کی قسم تم گھوڑے سے نہیں اترو گے اور میں بھی سوار نہیں ہوں گا۔"

اسلامی تعلیم نے غلاموں کے متعلق مسلمانوں کی ذہنیت میں جو تبدیلی پیدا کر دی تھی اس کے اثرات یوں تو ہر زمانہ کی اسلامی سوسائٹیوں اور مسلم حکومتوں میں نظر آ سکتے ہیں لیکن بنی عباس اور سلاطین دہلی کی حکومتیں اس باب میں نمایاں شہرت و امتیاز رکھتی ہیں۔

عباسی خلافت میں خلیفہ ثانی منصور کے عہد سے ہی حکومت کے معاملات میں غلاموں کا عمل دخل شروع ہو گیا تھا۔ تدریجی طور پر اس میں ترقی ہوتی رہی یہاں تک کہ معتصم باللہ کے بعد تو خلافت کی تمام مشنری پر ہی غلاموں کا قبضہ ہو گیا۔ فوج میں عام طور پر ترک غلاموں کی ہی کثرت ہوتی تھی ان کے علاوہ بڑے بڑے فوجی مناصب اور عہدے بھی انہی کو ملتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام فوج پر ان کا قبضہ ہو گیا اور اب انہوں نے اتنا اقتدار حاصل کر لیا کہ اپنی مرضی سے جس کو چاہتے خلیفہ بنا لیتے تھے اور جب ناراض ہو جاتے تو اسے تخت سے اتار دیتے تھے۔ اسی سلسلہ میں بعض اوقات وہ نہایت [illegible] کر بیٹھتے تھے۔

خلفاء بنی عباس کے علاوہ سلجوقی اور غوری خاندانوں کے سلاطین غلاموں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام بالکل اپنی اولاد کی طرح کرتے تھے)، یہاں تک کہ جب وہ اپنی صلاحیتوں سے کارہائے نمایاں انجام دینے کے قابل ہو جاتے تھے تو ان کے تمام حقوق وہی ہوتے تھے جو ان کی اولاد کے ہوتے تھے۔ سلطان محمد بن سام لاولد تھا۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے اس پر افسوس ظاہر کیا تو سلطان

نے جواب دیا" ترک غلاموں کی صورت میں میرے بہت سے بیٹے ہیں۔ یہ غلام میرے بعد میرے ملک کے وارث ہونگے اور جبکہ میں اس دنیا میں نہیں ہونگا تو یہ میرے نام کا خطبہ جاری رکھیں گے "[126]۔

سلطان علاء الدین خلجی کے غلاموں کی تعداد پچاس ہزار تھی جن میں سب بہترین قسم کے فوجی اور بہادر سپاہی تھے۔ فیروز شاہ کے عہد میں غلاموں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ان کے لیے ایک مستقل محکمہ قائم کرنا پڑا۔

زہری کہتے ہیں" میں ایک مرتبہ عبدالملک بن مروان کے پاس گیا تو اس نے مجھ سے پوچھا تم کہاں سے آ رہے ہو؟ میں نے کہا" مکہ سے" اس کے بعد مجھ میں اور عبدالملک میں حسب ذیل گفتگو ہوئی:

عبدالملک: تمہاری روانگی کے وقت (مکہ سے) اہل مکہ کا سردار کون تھا؟

زہری: عطاء بن ابی رباح!

عبدالملک: وہ عرب ہے یا غلام؟

زہری: غلام!

عبدالملک: تو پھر عرب کا سردار کیونکر ہو گیا؟

زہری: دیانت اور روایت کی وجہ سے

عبدالملک: بیشک اہل دیانت و روایت ہی سرداری کے مستحق ہیں

پھر عبدالملک نے دریافت کیا۔ اچھا اہل یمن کا سردار کون ہے؟

زہری: طاؤس بن کیسان!

عبدالملک: عرب ہے یا غلام؟

زہری: غلام!

عبدالملک: تو پھر یمن کا سردار کیونکر ہو گیا؟

زہری: جس بناء پر کہ عطاء اہل مکہ کا سردار ہے!

عبدالملک: بیشک جو شخص عطاء کی طرح صاحب دیانت و روایت ہو اس کو سیادت کا حق ہے۔ اچھا اہل مصر کا سردار کون ہے؟

زہری: یزید بن حبیب!

عبدالملک: عرب ہے یا غلام؟

زہری: غلام!

اس پر عبدالملک نے پھر وہی کہا کہ غلام عرب کا سردار کیونکر ہو گیا اور زہری نے بھی حسب معمول وہی جواب دیا اور اس کو سن کر عبدالملک نے پھر وہی کہا بیشک صاحب دیانت و روایت شخص سیادت کا مستحق ہے۔ عبدالملک نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے پھر پوچھا اہل شام کا سردار کون ہے؟

زہری: مکحول الدمشقی!

عبدالملک: عرب ہے یا غلام؟

زہری: غلام اور غلام بھی کیسا! حبشی قبیلہ ہذیل کی ایک عورت کا آزاد کردہ غلام ہے۔

عبدالملک: اہل جزیرہ کا سردار کون ہے؟

زہری: میمون بن مہران!

عبدالملک: عرب ہے یا غلام؟

زہری: غلام!

عبدالملک: اچھا اہل حرم کا سردار کون ہے؟

زہری: ضحاک بن مزاحم!

عبدالملک: عرب ہے یا غلام؟

زہری: غلام!

عبدالملک: بصرہ کا سردار کون ہے؟

زہری: حسن بن ابی الحسن!

عبدالملک: عرب ہے یا غلام؟

زہری: غلام!

عبدالملک: اچھا اہل کوفہ کا سردار کون ہے؟

زہری: ابراہیم النخعی!

عبدالملک: عرب ہے یا غلام؟

زہری: عرب!

عبدالملک نے ابراہیم النخعی کا نام سنا جو عرب تھے تو فرط مسرت میں کہنے لگا: ”زہری تو برباد

ہو! تو نے اب میری تشویش کو دور کر دیا! اس کے بعد خود ہی کہا "اللہ کی قسم غلاموں کو بڑے بڑے لوگوں پر سردار ہونا چاہیے، یہاں تک کہ ان کے نام کے خطبے برسرِ منبر پڑھے جائیں اور عرب ان کے نیچے بیٹھے ہوئے ہوں"

زہری کہتے ہیں "میں نے کہا: ہاں بیشک اے امیر المومنین سرداری اللہ کا حکم اور اس کا دین ہے، جو کوئی اس کی حفاظت کرے گا سردار وہی ہوگا اور جو اس کو ضائع کر دیگا ذلیل و خوار ہوگا"[217]

نصیب عربی کا ایک مشہور شاعر اور غلام ہے۔ اس نے اپنا ایک قصیدہ عبدالملک کے سامنے پڑھا) اور اس نے خوش ہو کے نصیب کو ایک رقم کثیر دی۔ اس پر کسی شخص نے کہا "یہ تو غلام سیاہ فام ہے" عبدالملک بولا "یہ اگرچہ سیاہ ہے: اس کے اشعار تو سفید ہیں"[218]

جو غلام اپنے علم و فضل کی وجہ سے یا کسی خاص فن میں مہارت رکھنے کے باعث مسلمانوں کے سرتاج تھے اور احرار و شرفا تک ان کی توقیر کرتے تھے، ان میں سے اکثر مشہور غلاموں کے حالات ہم نے کتاب کے دوسرے حصہ میں لکھے ہیں، ان کو دیکھنا چاہیے۔

غلاموں کی اعانت کے لیے اوقاف

اسلام نے مسلمانوں میں غلاموں کو آزاد کرنے اور کرانے کے اور ان کو نظرِ استحقار سے نہ دیکھنے کا جو ولولہ پیدا کیا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جو مسلمان صاحب ثروت ہوتے تھے اپنی رقم کا ایک حصہ کثیر اس مصرف میں صرف کرتے تھے، بلکہ محض غلاموں کی امداد کے لیے وقف کر جاتے تھے۔ دمشق میں ایک وقف تھا جو زبادی کے نام سے مشہور تھا۔ ابن بطوطہ اس کی نسبت لکھتا ہے کہ یہ ایک مکان ہے جہاں چینی کے بڑے بڑے برتن رکھے رہتے ہیں۔ اصحاب وقف نے اس مکان کو اس غرض سے وقف کیا ہے کہ اگر کسی غلام سے اپنے آقا کا کوئی برتن ٹوٹ جائے تو وہ اس کو اس مکان میں رکھ جائے اور اس کے بدلے میں یہاں سے کوئی دوسرا اچھا برتن لے جائے۔

اسی طرح ایک وقف تیونس میں تھا اور شاید اب بھی[219]

ان اوقاف کے علاوہ مسلمان اس کا بھی خیال رکھتے تھے کہ کافر غلاموں کو دے کر مسلمان غلام لے لیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ مسلمان غلام دار الحرب سے دار الاسلام میں آنے کے بعد فوراً آزاد ہو جاتے تھے۔ اور دوسری طرف کافر غلام بھی دار الکفر میں پہنچ کر آزاد ہو جاتے ہونگے۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجرؒ امام احمدؒ سے نقل کرتے ہیں:

ولو کان عند المسلمین اساری وعند المشرکین اساری واتفقوا علی المفاداۃ تعینت۔ (ج ۳ ص ۱۲۵ مطبوعہ جدید مصر)

اور اگر مسلمانوں کے پاس قیدی ہوں اور مشرکین کے پاس بھی ہوں اور باہمی تبادلہ پر رضامند ہو جائیں تو تبادلہ یقینی ہے۔

شیخ ابن ہمام تحریر فرماتے ہیں "امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ سب اس پر متفق ہیں کہ اگر دشمن مسلمان اسیروں سے اپنے اسیروں کا تبادلہ کر لینے پر راضی ہو تو تبادلہ کر لینا چاہیے"[۲۲۰]۔

اس سلسلے میں سب سے بڑے مفادات وہ ہیں جو مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان ہوئی خلفاء بنی امیہ بھی اپنے گرفتار شدہ لوگوں کا فدیہ لیتے تھے۔ سب سے پہلے جو فدیہ منظم طریقہ پر ادا کیا گیا وہ تھا جو ۱۸۹ء میں ہارون رشید کے ہاتھ سے انجام کو پہنچا، پھر ڈیڑھ سو برس کی مدت میں مفادات کے اس طرح کے کئی واقعات پیش آئے۔ مشہور مورخ مقریزی کا بیان ہے کہ مسلمانوں کی توجہ اپنے ان بھائیوں کو رہا کرانے کی طرف زیادہ مائل رہنے لگی جو کفار کے قبضہ میں گرفتار تھے۔ ارباب ثروت میں جو اہل ورع تھے وہ غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے مال وقف کرتے تھے[۲۲۱]۔

اسلام کی تعلیم اور اس کے زیر اثر صحابہ کرامؓ کے حسن سلوک و معاشرت کا اثر یہ تھا کہ غلام آقاؤں پر جان دیتے تھے اور ان کے فرمان کی بخوشی تعمیل کرتے تھے۔ افلح حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا غلام تھا۔ انہوں نے اس کو مکاتب کر کے آزاد کرنا چاہا۔ تمام لوگوں نے اس کو مبارکباد دی لیکن بعد میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے کتابت کے عہد نامے کو فسخ کرنا چاہا۔ افلح کے متعلقین نے کہا "کیا تم پھر غلامی میں رہنا پسند کرو گے؟ حالانکہ خدائے تعالیٰ نے تم کو آزاد کر دیا تھا"۔ افلح نے کہا۔ "میں کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا"۔ چنانچہ اس نے خود معاہدہ کو منسوخ کر دیا۔ اس کے چند دنوں کے بعد ہی حضرت ایوب نے ان کو آزاد کر دیا اور کہا کہ "جو مال تمہارے پاس ہو وہ کل تمہارا ہے"[۲۲۲]۔

اسلامی تعلیم کا اثر

عبداللہ بن جدعان کے پاس مکہ میں تقریباً ایک سو غلام تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں سے متعلق اسلامی تعلیمات کی اشاعت کی تو ان غلاموں میں اس قدر جوش پھیلا کہ انہیں مکہ سے کسی دوسری جگہ لے جانا پڑا[۲۲۳]۔

اسلامی تعلیم کا ایک بڑا اثر یہ ہوا کہ عربوں نے قبائلی اور ملکی و وطنی عصبیت سے الگ ہو کر اسلامی اخوت و برادری کا احساس کیا اور ان کے معاملات اپنے غلاموں اور باندیوں کے ساتھ نہایت خوشگوار ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے سالم جو ایک غلام تھے ان کے متعلق فرمایا "اگر سالم زندہ ہوتے تو میں ان کو حکومت سپرد کرتا"۔ حضرت معاویہ فرماتے تھے اگر یزید کی بیعت کا طوق مسلمانوں کی گردن میں نہ ہوتا تو میں قاسم و محمد (جو جواری کے بطن میں سے تھے) کے درمیان اس امر خلافت کو شوریٰ کر دیتا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم اپنے خلیفہ کی اطاعت کرو اگرچہ وہ عبد حبشی ہو"۔

اسلامی اخوت اور انسانی احترام کے اس احساس قوی کا ہی نتیجہ تھا کہ مسلمان غلاموں سے بھائیوں اور بیٹوں جیسا اور باندیوں سے بہنوں اور بیٹیوں کی طرح معاملہ کرتے تھے اور ان کا ایسا کرنا کسی اقتصادی طمع اور لالچ پر مبنی نہیں تھا، بلکہ صرف اس لیے کہ اسلامی تعلیمات نے ان کے دل و دماغ کو برے اخلاق و عادات سے پاک و صاف کر کے پسندیدہ خصائل و شمائل کے زیور سے آراستہ کر دیا تھا اور ان کی نظر میں آقا اور غلام مالک اور مملوک دونوں ایک مساوی حیثیت رکھتے تھے۔

مدائنی کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ کے ساتھیوں کی ایک جماعت آپ کے پاس آئی اور کہنے لگی "اے امیر المومنین آپ یہ اموال تقسیم کر دیجیے اور عرب اور قریش کو موالی اور عجم پر ترجیح دیجیے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا:

انا عرونی ان اطلب النصر بالجور [۲۲۳]

کیا تم مجھ کو حکم کرتے ہو کہ میں ظلم و ستم کر کے مدد طلب کروں۔

بنوامیہ اور عربی عصبیت

بنوامیہ جو سخت عربی عصبیت رکھتے تھے اور جن کو اپنے خاندانی شرف و مجد پر اتنا ناز تھا کہ عجم کے مملوک و اشراف کو بھی نظر میں نہ لاتے تھے۔ اسلام کی تعلیمات سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ حجاج بن یوسف ثقفی ظلم و ستم کی دنیا کا ایک نمایاں ہیرو ہے۔ غریب موالی خاص طور پر اس کے ناوک خوردہ ستم تھے۔ اس نے شہر واسط میں پہنچ کر وہاں سے تمام نبطیوں کو نکال کر مختلف دیہاتوں میں اس غرض سے بھیج دیا کہ ان کا عربی لب ولہجہ خراب ہو جائے اور وہ سوسائٹی میں کسی

مرتبہ و قیع کو حاصل نہ کر سکیں اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کے ہاتھوں کو بھی داغدار کر دیا لیکن موالی و عجم کے خلاف اس قدر شدید تعصب رکھنے کے باوجود اس نے حضرت سعید بن جبیر کو کوفہ کا امام اور قاضی مقرر کیا اور جب اہل کوفہ نے اپنی عادت کے مطابق [۲۲۵] ان کی شکایت کی تو ابو بردۃ بن ابوموسیٰ الاشعری کو یہاں کا قاضی مقرر کر دیا مگر ساتھ ہی حجاج نے ان کو لکھا کہ سعید بن جبیر سے مشورہ برابر کرتے رہنا۔ پھر جب عبدالرحمن بن الاشعث نے حجاج کیخلاف بغاوت کی تو سعید بن جبیر نے عبدالرحمن کا ساتھ دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ شہید کر دیے گئے۔ (الکامل اللمبر د ج ۲)

بہ ایں ہمہ اس میں شک نہیں کہ عرب سوسائٹی میں موالی کے حد سے زیادہ عمل دخل کے باعث بنوامیہ کی عربی عصبیت جس کو اسلام نے قریب قریب فنا کر دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تیس برس بعد پھر بیدار ہو گئی لیکن ہمیں اس پر متعجب نہ ہونا چاہیے۔ جن لوگوں نے خود آپس میں بنوامیہ اور بنو ہاشم کا خط امتیاز کھینچ کر ایک دوسرے پر تفوق ثابت کرنے کی کوشش کی اور پھر اس فوقیت کو انھوں نے تلوار کی قوت سے منوانے میں بھی دریغ نہ کیا ہو۔ اگر انہوں نے عربیت و عجمیت کا سوال پیدا کر دیا تو اس میں حیرت کی بات کیا ہے۔ اس قسم کے متعصب عربوں کا حال یہ تھا کہ موالی کو بہ نظر استحقار دیکھتے اور ان کی کثرت سے کڑھتے اور گھٹتے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر (ریاشی) کہتا ہے:

ان اولاد السراری
کثروا یارب فینا
رب ادخلنی بلادا
لاأری فیها هجینا

اے خدا باندیوں کی اولاد ہم میں بہت بڑھ گئی ہے تو مجھ کو ایسے شہروں میں پہنچا دے جہاں میں کسی دوغلے آدمی کو نہ دیکھوں۔

ایک اعرابی سوار قاضی کے پاس گیا اور کہنے لگا ”میرے باپ کا انتقال ہو گیا اور اس نے ہم تین لڑکوں کو اپنا وارث چھوڑا ہے جن میں سے میں اور ایک دوسرا لڑکا حرہ کے بطن سے ہیں اور تیسرا بھائی ہجین ہے یعنی باندی کے بطن سے۔ اب آپ بتائیے ہم تینوں میں مرحوم کا ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟“ قاضی صاحب نے فرمایا ”ترکہ کے تین برابر حصے کر لو اور تینوں بھائی ایک ایک حصہ لے لو، بشرطیکہ تمہارے سوا کوئی اور وارث نہ ہو۔ اعرابی کہنے لگا:“ کیا وہ ہمارا ہجین بھائی بھی

ہمارے برابر حصہ لے گا؟" قاضی نے کہا "بے شک۔" یہ سن کر اعرابی خفا ہو گیا اور بولا "معلوم ہوتا ہے کہ تیری خالاؤں میں شریف عورتیں کم ہیں"

شعوبیہ

ادھر عربی عصبیت حد سے زیادہ ہو گئی اور موالی آئے دن استحقار و استخفاف سے دوچار ہونے لگے اور ادھر اسلام نے موالی میں خودداری اور عزت نفس کا جذبہ اور مساوات انسانی کا قوی احساس پیدا کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کی متعصبانہ ذہنیت کے برخلاف ایک نیا فرقہ پیدا ہو گیا جو "شعوبیہ" کہلاتا تھے۔ عربی زبان و ادب کے بعض بڑے بڑے ماہروں نے اس فرقے کی سرپرستی کی اور اس کو پروان چڑھایا۔ مصر کی جدید کتاب "ضحیٰ الاسلام" کے فاضل مصنف کے بقول شعوبیہ کی تاریخ دیکھنے سے حسب ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ فرقہ شعوبیہ کے علمبرداروں نے شروع شروع میں اسلامی تعلیمات پر ہی اپنے دعووں کی بنیاد رکھی اور ان کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ کوئی شخص کسی دوسرے پر محض عربی یا عجمی ہونے یا کسی خاص شعب و گروہ سے تعلق رکھنے کی بناء پر فائق نہیں ہو سکتا بلکہ اعمال صالح اور اچھے کرداروں کی وجہ سے ہی کسی انسان کو فوقیت دی جا سکتی ہے لیکن بعد میں ان کا یہ ادّعاء عرب کے استحقار میں تبدیل ہو گیا۔

۲۔ شعوبیت کوئی مستقل مشرب یا مسلک (Cult) نہیں تھا جس کی تعلیمات مخصوص قسم کی ہوں اور جس کے شعائر بھی ایک جدا طرز کے ہوں جیسے شافعیت اور حنفیت یا شیعیت اور اہل سنت والجماعت ہوتا بلکہ وہ ایک طرح کا رجحان اجتماعی تھا۔ جیسے ہم آج کل کہتے ہیں جمہوریت یا شخصیت، اشتراکیت، فوضویت، نازیت، یا فشزم۔ اور اسی بناء پر اس کے ماننے والوں کی تعداد کو متعین نہیں کیا جا سکتا، بلکہ کہنا پڑے گا کہ ہر گاؤں میں ہر شہر میں ہر مقام اور ہر موضع میں اس خیال کے تھوڑے بہت لوگ پائے جاتے ہیں۔

۳۔ شعوبیت کی ترقی کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اس میں رجحان وطنی اور تعصب دینی دونوں کی آمیزش پائی جاتی ہے اور خلفائے عباسیہ کے زیر اثر اہل فارس کو جو فروغ حاصل ہوا تھا اس نے بھی اس احساس کو بڑی مدد دی۔

۴۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ اول اول تو شعوبیت کا ظہور محض عرب کے بعض قبائل کی شدید قبائلی عصبیت کی وجہ سے ہوا لیکن جیسا کہ ہر تحریک کا قاعدہ ہے۔ بعد میں شعوبیت کی

تحریک نے ایسے لوگوں کو پیدا کیا جو اپنے بالمقابل عرب کی کسی فضیلت و برتری کو تسلیم کرنے کے لیے ایک آن تیار ہی نہ ہو سکتے تھے، چنانچہ سعید بن حمید البختکان جو شریں بیان شاعر و مضمون نگار تھا اور دعویٰ کرتا تھا کہ ایرانی بادشاہوں کی اولاد سے ہے، اس نے عجمی فضیلت پر چند کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب کا نام "انتصاب العجم من العرب" تھا اور دوسری کا نام "مفاخر العجم"۔ پھر ہیثم بن عدی نے جو منصور، مہدی، ہادی اور رشید کا ہم نشین تھا۔ عرب کی برائیوں پر چند کتابیں لکھی۔ ابن ندیم نے ان کے نام یہ لکھے ہیں (۱) "کتاب المثالب الصغیر" (۲) "کتاب المثالب الکبیر" (۳) "کتاب مثالب ربیعه" (۴) اسماء بغایا قریش فی الجاهلیة" (۵) "اسماء من وَلَدْنَ" (۶) "کتاب من تزوج من الموالی فی العرب"

علان الشعوبی نے "المیدان فی المثالب" نامی ایک کتاب لکھی جس میں ابن ندیم کے بقول اس نے عرب کی حد سے زیادہ مذمت کی اور ان کے عیوب کو گن گن کر بیان کیا۔ اس کے اہم ابواب یہ ہیں:۔

مثالب قریش، مثالب تیم بن مرہ، مثالب بنی آسد بن عبدالعزیٰ، مثالب بنی مخزوم اسی طرح ابوعبیدہ معمر بن المثنی نے کتاب "لصوص العرب" اور "ادعیاء العرب" لکھی[۲۳۶]۔

ان کے علاوہ اور بھی بہتیری کتابیں ہیں جو شعوبیت کے زیر اثر عرب کی مذمت پر لکھی گئیں۔ ہمارا مقصد اس کے ذکر سے دکھانا ہے کہ اسلام نے اپنی تعلیم ومساوات سے خود غلاموں اور موالی عجم میں عزت نفس اور خوداری کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ جب انہوں نے عربی عصبیت کے ہاتھوں اپنے آپ کو ذلیل ہوتے ہوئے دیکھا تو اس کو برداشت نہ کر سکے اور ایک مستقل تحریک کی سلک میں منظم ہو کر انہوں نے زبردست مقاومت کی سعی بلیغ کی۔ ظاہر ہے اگر اسلام ان کا حامی و مددگار نہ ہوتا تو بنی عباس کی طاقتور عربی حکومت کے زیر سایہ رہتے ہوئے ان کو کبھی یہ جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ نفسیاتی طور پر غور کیجیے تو شعوبیت کا ظہور اور اس کا ارتقاء اس ذہنیت مساوات و برابری کا نتیجہ تھا جو اسلام کی تعلیمات نے آقاؤں اور غلاموں، عربوں اور عجمیوں سب میں یکساں طور پر پیدا کر دی تھی اور جس کی وجہ سے نہ ایک عربی کو عجمی پر نہ کسی عجمی کو عربی پر ایک آقا کو اپنے غلام پر اور نہ کسی غلام کو اپنے آقا پر تفوق و برتری جتانے کا حق تھا۔

مسٹر اٹربری (Atterbury) کہتے ہیں:

''ایک زنگی اسلام میں داخل ہوتے ہی اپنے نفس کی عزت کو محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کے بعد وہ اپنے غلام کو یقین کرتا تھا آزاد اور حر سمجھتا ہے۔'' [۲۲۷]

موسیو بونہ موری ان اسباب پر بحث کرتے ہوئے جو اہل افریقہ میں اسلام کی کامیابی کا باعث ہوئے لکھتا ہے ''اسلام میں طبقات اور درجات نہیں ہیں۔ زنگی اسلامی جماعت میں داخل ہو کر اپنے تئیں حقیر نہیں سمجھتا'' اس کے بعد کہتا ہے ''غنی اور فقیر ہر مذہب میں ہوتے ہیں لیکن مسلمان مالداروں میں وہ خشونت اور سختی نہیں پائی جاتی جو ہمارے اغنیاء میں بالعموم محسوس کیجاتی ہے۔ اغنیاء اسلام، اغنیاء نصاریٰ کے بہ نسبت نعمتوں کے زوال اور تغیر احوال کو زیادہ یاد رکھتے ہیں اور ایک مسلمان فقیر پر یہ دشوار نہیں کہ اغنیاء اسلام میں سے کسی ایک کے گھر میں داخل ہو جائے اور وہاں اپنے لیے سامان ضیافت پائے۔'' [۲۲۸]

لین پول (Lane pole) کہتا ہے:

نجوقیوں کے بڑے بڑے غلام ایسے ہی معزز اور فخر کرنے والے تھے جیسا کہ قرون وسطی کی جمہوریت کے سپہ سالار اور بہادر اور جب ان لوگوں نے شاہی طاقت کو اپنے ہاتھ میں لیا تو ان کو ورثہ میں اپنے سابقہ آقاؤں کی اونچی روایات ملی تھیں۔ [۲۲۹]

اسلام اور مسیحیت کا فرق

غلام سے متعلق اسلامی تعلیمات جو آپ اوپر پڑھ آئے ہیں۔ ان سے یہ امر بوضاحت معلوم ہو جاتا ہے کہ جہاں تک اسلامی تعلیمات وارشاد کا تعلق ہے اسلام نے غلامی کے رواج کی حوصلہ افزائی نہیں کی ہے بلکہ اس کو مصلحت وقت کے پیش نظر باقی رکھ کر مختلف تدبیروں کے ذریعہ ایسی حالت میں پہنچا دیا ہے اگر مسلمان ان تعلیمات کی اصل اسپرٹ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان پر سختی سے کاربند ہوتے تو یہ رواج بہت جلد اپنی موت آپ مر گیا ہوتا۔ اب اس کے بالمقابل مسیحیت کا جائزہ لیجئے تو واضح ہوگا کہ جو لوگ ہم پر حرف گیری کی دھول اڑا رہے ہیں، خود ان کی جیب و دامن کس حد تک اس گرد سے اٹے ہوئے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو ایسا بے تعصب مصنف کہتا ہے:

"مسیحیت میں غلام مسیح کا پیرو ہونے کے باوجود کسی رعایت خاص کا مستحق نہیں"[230]۔

شمالی ریاستہائے امریکہ میں انسداد غلامی کی وجہ

آج پیروان مسیحیت بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہم نے قانوناً غلامی کا انسداد کر دیا لیکن آپ اسلام اور مسیحیت کا اس معاملہ میں موازنہ کریں تو صاف معلوم ہوگا کہ مسیحیت کے علمبرداروں نے جو کچھ کیا وہ صرف اقتصادی حالات سے مجبور ہو کر کیا جب تک جدید قسم کے آلات عمل وزراعت ایجاد نہیں ہوئے تھے ان لوگوں کو اپنے کاروبار کے لیے غلاموں کی محنت درکار تھی، سرمایہ ان کا ہوتا تھا اور محنت ان کی ہوتی تھی اور یہ لوگ اپنی سرمایہ دارانہ ذہنیت کے ماتحت ان سے سخت سے سخت کام لیتے تھے لیکن جب جدید آلات ایجاد ہو گئے جن سے مزدوروں پر اثر پڑا تو غلام بھی اس کی زد سے نہ بچ سکے۔ اب ان کے اخراجات ان کے آقاؤں پر بار ثابت ہونے لگے اور انہوں نے مجبور ہو کر ان کو آزاد کر دیا۔ اسی اقتصادی ضرورت کے پیش نظر انسداد غلامی کا قانون بنایا گیا۔ چنانچہ مسٹر جے ای کرنیس اپنی کتاب The slave power میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

شمالی ریاستوں نے کیوں غلامی کا خاتمہ کر دیا درآنحالیکہ جنوبی ریاستوں میں اب تک غلامی کا رواج پایا جاتا ہے۔ اس کے جو وجوہ اسباب بیان کیے جاتے ہیں، کہا جاتا ہے وہ زیادہ دقیع

نہیں ہیں یہ کہنا درست نہیں کہ سفید فام آدمی جنوب میں آب وہوا کے باعث کام کرنے سے عاجز نہیں اور اس کے برخلاف افریقی شخص فطرۃً سست ہوتا ہے اور وہ بحالت مجبوری کام کرسکتا ہے۔ اصل سبب اقتصادی ہے جیسا کہ آزاد انسان کی محنت اور غلام کی محنت کے تقابل سے ظاہر ہوتا ہے۔ رواج غلامی کے تحت مالک کو پوری طاقت حاصل ہوتی ہے اور اپنے غلام کی محنتوں کا پھل بڑے مزے سے کھاتا ہے۔ وہ ایک مقصد کے لیے اور ایک خاص نقطہ نظر کے تحت اپنے غلام کی محنت کو کام میں لاتا ہے اور پھر شکایت بھی نہیں کرسکتا کہ اس میں مزید خرچ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب جبکہ طرح طرح کے سامان ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن پر خرچ کم اور منفعت زیادہ ہے تو پھر غلامی کے رواج کو قائم رکھ کر اخراجات بسیار اپنے ذمہ عائد کیے جائیں [۲۳۱]۔

اس کے برخلاف اسلام نے انسداد غلامی کے سلسلہ میں جو کچھ کیا۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ اس باب میں اس کی تعلیمات بالکل انتہائی ہیں۔ وہ کسی اقتصادی یا معاشرتی مصلحت پر نہیں بلکہ سرا سر اخلاقی بنیاد پر قائم ہے اور اس تصور کے ماتحت ہے کہ انسان سب برابر ہیں۔ کسی کو ایک دوسرے پر مالکانہ تسلط واقتدار قائم رکھنا درست نہیں:

ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا

ڈاکٹر توفیق صدقی نے بالکل سچ کہا ہے:

مبلغین مسیحیت کہتے ہیں کہ ہم یورپ والے جو معاشرتی اصلاحات نافذ کررہے ہیں وہ سب ان کے مذہب عیسائیت کے آثار باقیہ میں سے ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ یہ سب عقلی ترقی اور فکر وخرد کی بلندی کی وجہ سے ہے۔ دین کو اس میں کوئی دخل نہیں ورنہ اس کی کیا وجہ ہے کہ صدیوں تک یہ لوگ زیادہ برے طریقے کے ساتھ لوگوں کو غلام بناتے رہے [۲۳۲]۔

اور اسی بناء پر سید امیر علی نے خوب کہا ہے [۲۳۳]

And it is simply an abuse of words to apply the word "slavery" in the english sense, to any status known to the legislation of Islam.

سید امیر علی کا مطلب یہ ہے کہ غلامی تو دراصل وہ ہے جو یورپ میں پائی جاتی ہے۔ اسلام کے قانون میں کوئی دفعہ ایسی نہیں ہے جس پر انگریزی کی اصطلاح کے مطابق "غلامی" کے لفظ

کا اطلاق ہو سکے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اسلام نے آقا کے اختیارات اور ان کے استعمال پر جو پابندیاں جابجا عائد کی ہیں، ان کے پیش نظر غلامی کی تعریف ارتقاء اسلام پر صادق ہی نہیں آ سکتی۔

مسٹر اے این گلبرٹسن کہتے ہیں:

"غلامی کی عام پسندیدہ اور مقبول تعریف یہ ہے کہ وہ ایک ایسا سوشل رواج ہے جس میں ایک آدمی دوسرے کی ملک میں ہوتا ہے"۔

اس ملک کو ہر طرح سے استعمال کیا جا سکتا ہے اور غلام سے ہر قسم کی محنت و مزدوری کرائی جا سکتی ہے۔ نیبور (Nieboer) کہتا ہے:

"ملک (Property) ایک طاقت ہے جو خواہ کتنی ہی نرم طریقہ سے استعمال کی جائے بہر حال اصولی طور پر وہ لامحدود ہوتی ہے"۔

پھر ایک موقع پر کہتا ہے۔ "آقا کے اختیارات پر کسی طرح پابندی عائد کرنا غلامی کا کم کر دینا ہے، اصل غلامی نہیں ہے" اور پھر ایک اور جگہ کہتا ہے "وہ شخص جو دوسرے انسان کی تمام خدمات کا مستحق ہے اور مالک سمجھا جائے وہ اس کا مالک (Owner) ہوتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں یہی مصنف اپنی کتاب Slavery as an industrial system میں کہتا ہے:

"اگر غلامی کی بنیاد کسی ایسے معاہدے پر ہو جو جانبین میں کیا جائے تو پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ غلام اور نوکر میں کیا فرق ہے؟"

اسی مفہوم کو دوسرے علماء نے اس طرح بیان کیا ہے:

"A slave is a human being who is the property of another and subject to compulsory labour, beyond the limits of the family."

غلام ایک ایسا انسان ہے جو کسی دوسرے کی ملکیت ہو اور جس سے خاندان کے حدود سے باہر جبری محنت لی جا سکے"۔

اب غلامی کی اس تعریف کو اور اس کے ان شرائط کو پیش نظر رکھو اور پھر یہ خیال کرو کہ اسلام نے کس طرح آقا کے اختیارات کی تحدید کی ہے مثلاً یہ کہ آقا ضرورت اور غلام کی طاقت سے زیادہ اس سے کام نہیں لے سکتا اور اگر وہ ایسا کرے اور غلام کو زدوکوب کرے تو اس کو حکم ہے کہ آزاد کر دے۔ کہ یہی اس کے اس گناہ کا کفارہ ہے تو صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے غلامی کی جس شکل کو عارضی طور پر مباح کیا ہے وہ درحقیقت غلامی نہیں۔ نیبور نے صاف لفظوں میں کہا

ہے کہ اگر غلامی کی بنیاد جانبین کے معاہدہ پر قائم ہو تو وہ دراصل غلامی نہیں خدمت گزاری ہے اوراق گذشتہ میں کہیں وہ حدیث گزر چکی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس شخص کو اس کا غلام مزاج کے موافق معلوم نہ ہو اس کو چاہیے کہ اپنے سے الگ کر کے کسی دوسرے کو دیدے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ غلام اور آقا دونوں میں ایک طرح کا معاہدہ ہوتا ہے اگرچہ بلاواسطہ نہیں بلکہ غلام کی طرف سے شریعت اسلام نیابت کرتی ہے اور آقا کو غلام سے متعلق خدا کے ساتھ یہ عہد کرنا پڑتا ہے کہ وہ اس سے اس کی ہمت و طاقت سے زیادہ کام نہیں لے گا۔ جو خود کھائے گا غلام کو بھی کھلائے گا، لباس کا خیال رکھے گا۔ اس پر تہمت تراشی نہیں کریگا، اس پر لعنت نہیں بھیجے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ چند اس معاہدہ کی دفعات ہیں۔ ہر وہ شخص جو ان میں سے کسی ایک دفعہ کی خلاف ورزی کرے گا اس کو خدا کے حضور میں جوابدہ ہونا پڑے گا اور اپنے گناہ کی پاداش اس کو بھگتنی پڑے گی۔

بتائیے کیا نیبور (Nieboer) کے قول کے مطابق اس غلامی کو واقعی غلامی کہا جا سکتا ہے؟

ایک دوسری جگہ بھی عیسائیت اور اسلام دونوں کا مقابلہ کرتے ہوئے امیر علی نے بالکل بجا کہا ہے:

”وہ غلامی جو اسلام میں جائز ہے، درحقیقت اس غلامی کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں رکھتی جو ہمارے زمانہ تک ”عیسائیت“ میں جائز رکھی جاتی رہی ہے اور نہ اس کو اس غلامی کے ساتھ کوئی علاقہ ہے جو امریکہ میں ۱۸۶۵ء کی مقدس جنگ تک رائج رہی“ (اسپرٹ آف اسلام ص ۲۶۴)

علمبرداران مسیحیت غلاموں سے کیا سلوک کرتے تھے؟ اس کے متعلق غیروں کی نہیں بلکہ دیکھیے خود گھر کے بھیدیوں کی کیا شہادت ہے۔ لارڈ کرومر جو اعلیٰ درجہ کا متعصب عیسائی ہے، کہتا ہے:

”وہ امور جو عیسائیوں کے لیے انتہائی شرمناک ہیں، ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ انہوں نے صرف غلام بنانے پر ہی اکتفا نہیں کی، بلکہ اس سے بھی زیادہ برے کام کا ارتکاب کیا۔ یعنی یہ کہ یہ لوگ انسانوں کو اچک کر لے جاتے تھے اور غلام بنا لیتے تھے“[۲۳۵]

ایک اور عیسائی اہل قلم تحریر کرتا ہے:

”یورپ والے اس کے عادی ہو گئے ہیں کہ سوڈان کے باشندوں کے ساتھ ان کے املاک میں جھگڑا کریں اور مختلف قسم کے سخت اور ناقابل برداشت ٹیکسوں کے نام سے بڑی بڑی

ٹیکس وصول کریں۔ یہ سفید فام لوگ ان سیاہ رو لوگوں پر طرح طرح کے ظلم کرتے ہیں، ان کو مارتے ہیں، عذاب دیتے ہیں، ان کے اموال کو لوٹتے ہیں۔ ان کی عورتوں کو اپنے لیے مباح سمجھتے ہیں اور ان غریبوں کو بھوکا مارتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہاں کے رہنے والے اپنے وطن چھوڑ چھوڑ کر دوسرے شہروں میں جا بسے ہیں اور تمام شہر ان سے خالی ہو گئے ہیں[۲۳۶]

فولیہ کہتا ہے:

ولایات متحدہ میں عجیب وغریب قسم کے واقعات دیکھنے میں آتے ہیں جو امریکہ کے لیے کسی طرح قابل فخر نہیں ہو سکتے۔ یہاں کے حبشی سفید فام عورتوں کے ساتھ سخت محبت کرتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات ان سے شہوت رانی بھی کر لیتے ہیں "لنش" کا قانون ایسے لوگوں کے لیے حکم کرتا ہے کہ ان کو تارکول کے تیل سے لیپ دیا جائے اور پھر شمع کی طرح انہیں جلا ڈالا جائے جس جانب میں یہ واقعہ ہوتا ہے وہاں کی حکومت جبش اس پر مجبور ہوتی ہے کہ مجرم کے جلنے کے وقت خود موجود ہے[۲۳۷]

ان بیانات کے علاوہ شروع کتاب میں "غلامی اور مسیحیت" کے زیر عنوان اسی قسم کی کئی ایک شہادتیں گزر چکی ہیں۔ اس کے برخلاف اسلام کی تعلیمات ہیں کہ وہ سراسر اخلاقی و روحانی بنیاد پر قائم ہیں۔ ان میں کسی اقتصادی منفعت یا رجحان کو دخل نہیں۔ علمبرداران مسیحیت مسیحیت میں غلامی سے متعلق کیا شہادتیں دیتے ہیں۔ آپ پڑھ چکے۔

محققین یورپ کا اعتراف

اب دیکھئے ہمارے غیر (محققین یورپ) اسلام میں غلاموں کے ساتھ حسن معاملہ کرنے کی کیا شہادتیں دیتے ہیں۔ فان دیمبرگ لکھتا ہے:

اسلام میں غلاموں کے لیے بہتیرے قواعد رکھے گئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیرو کس قدر شریفانہ انسانی شعور واحساس رکھتے تھے ان قواعد کا مطالعہ کرنے کے بعد تم دیکھو گے اسلام کی خوبیاں ان تمام طریقوں کے مناقض ہیں جن کو ہمارے زمانہ تک بڑی بڑی مدعیان تہذیب وتمدن قومیں اختیار کرتی رہی ہیں۔ ہاں اسلام نے غلامی کے اس رواج کو ختم نہیں کیا جو تمام عالم میں پھیلا ہوا تھا لیکن اس نے غلام کی حالت بہتر بنانے کی بڑی کوشش کی ہے[۲۳۸]

ایک نامور انگریز مصنف کہتا ہے:

"مسلمان غلاموں کے ساتھ عموماً اچھا معاملہ ہوتا تھا۔ الجیریا میں اور دوسری جگہوں میں بھی"[۲۲۹]

مشہور انگریز سیاح ڈبلیو جی پلگر یو کہتا ہے:

"میں عرب میں کثرت سے حبشی غلاموں کے ساتھ ملتا رہا ہوں۔ حبشی باندیوں کے ساتھ زناشوئی کا تعلق رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ملے جلے قبیلوں اور قوموں کے آدمی بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ میں نے ہر جگہ غلاموں کی حالت بہت زیادہ ترقی کی طرف مائل دیکھی ہے اور آزاد کرنے کا رواج بھی عام ہے۔ شہری آزادی پر نیا نیا قبضہ جمانے والے آزاد کردہ غلام جلد شادی کر لیتے ہیں۔ اگرچہ ایک آزاد کردہ حبشی غلام امراء و روساء کے طبقہ تک شروع شروع میں نہیں جا سکتا اور نہ کوئی عربی سردار ایسے غلام کو اپنی بیٹی نکاح میں دینا گوارا کرتا ہے تاہم انگریزی اقوام میں رنگ و خون کے امتیاز سے جو پابندیاں ان غلاموں پر عائد ہوتی ہیں یہ لوگ ان سے بالکل محفوظ و مامون ہیں"۔

پالگریو (Palgreve) کے تقریباً بیس برس بعد (Doughty) نے غلاموں کی جو حالت دیکھی ہے اس کی نسبت وہ کہتا ہے:

"غلاموں کی حالت بسا اوقات خوشگوار ہوتی ہے۔ اگر ان غلاموں کا آقا خدا کا خوف رکھتا ہے تو وہ انہیں آزاد کر دے گا اور پھر بھی خالی ہاتھ نہیں جانے دے گا"۔

پول لکھتا ہے:

انصاف کی راہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیغمبرانہ حیثیت میں غلامی کے رواج کو جائز رکھا ہے لیکن انہوں نے بڑے منصوبے کے ساتھ اپنے پیروؤں کو غلاموں کے ساتھ نرمی کرنے اور ان کا خیال رکھنے کا حکم دیا ہے اور جہاں تک ممکن تھا غلاموں کے معاملہ کو آسان اور آرام دہ بنا دیا ہے"[۲۳۰]

فالیری نے کہا ہے:

اسلام کے دشمنوں نے اس بات کا ارادہ کیا ہے کہ غلامی کے رواج کو باقی رکھنے کی بناء پر اسلام کو نشانہ ملامت بنائیں لیکن مسلمانوں، دیہاتیوں اور شہریوں کے نزدیک غلاموں کے لیے جو مراعات ہیں وہ ان مراعات سے بدرجہا زیادہ ہیں جو غلاموں کے لیے یورپ میں ہیں اور انصاف یہ ہے کہ مشرق میں جو غلامی قائم ہے اس کو تو اس غلامی کے ساتھ کوئی

نسبت ہی نہیں جو امریکہ میں پائی جاتی ہے جب ہم غلامی کے مسئلہ پر تاریخی نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں بھی عجیب وغریب اصلاح فرمائی ہے"۔

اس کے بعد فالیری نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"کوئی شخص اپنے غلام کو غلام اور باندی کو باندی کہہ کر نہ پکارے"

یہ سب کچھ لکھنے کے بعد فالیری نے اپنی تقریر کو اس پر ختم کیا ہے "اس سے بہتر انسانیت کونسی ہو سکتی ہے؟[1]"

موسیو گستاؤلیبان اپنی مشہور کتاب "تمدن عرب" میں لکھتا ہے:

"غلامی کا لفظ جب اس یورپین شخص کے سامنے بولا جاتا ہے جو امریکن ناولوں اور رواتیوں کے پڑھنے کے عادی ہیں جن کا سلسلہ تیس سال سے جاری ہے تو اس کے ذہن میں فوراً تصویر پیدا ہو جاتا ہے ان غریبوں کا جو زنجیروں میں بندھے ہوئے ہوں اور ان پر کوڑے برسائے جا رہے ہوں اور پھر ان بیچاروں کو بقائے حیات کے لیے کافی غذا نہ ملتی ہو اور رہنے کے لیے نہیں تیرہ و تاریک کوٹھریاں نصیب ہوتی ہوں۔ مجھ کو اس سے بحث نہیں کہ یورپ میں جو غلام ہیں ان پر یہ تمام باتیں صادق آتی ہیں یا نہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام میں غلاموں کا جو تصور ہے وہ عیسائیوں کے غلاموں کے تصور سے بالکل مختلف ہے"۔

دوٹی (Doughty) کا بیان اوپر گذر چکا ہے۔ ڈچ اسکالر اور سیاح (Snoute Hurgronge)۔ جس نے مکہ معظمہ میں علماء اسلام کے ساتھ رہ کر مہینے گزارے تھے (Doughty) کے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"ان غلاموں کو کافی غذا دی جاتی ہے کیونکہ سامان خورد ونوش بہت کافی ہے اور سستا ہے کپڑے اور خانہ داری کا ساز وسامان اور تمام وہ چیزیں جو زندگی کو خوشگوار کرنے کے لیے ضروری ہیں ان کو بافراط ملتی ہیں جب یہ لوگ آزاد کر دیے جاتے ہیں تو یہ سقائی کرتے ہیں یا کوئی اور محنت ومزدوری کا کام کرتے ہیں۔ بسا اوقات یہ آزاد کرنے والے آقا اپنے آزاد کردہ غلاموں کی نگرانی کو پسند کرتے ہیں۔ علی الخصوص جبکہ یہ شادی شدہ ہوں۔ دوسرے افریقی غلام جو نسبتہً زیادہ اہل ہوتے ہیں گھروں میں ملازمت کر لیتے ہیں۔ یا دکانوں پر بحیثیت دکاندار کام کرنا

پسند کرتے ہیں۔ اچھے سوداگر چاہتے ہیں کہ اس طرح کے ملازموں سے اپنی دکانیں پر کر لیں۔ یہ غلام ان تاجروں کے گھروں میں بڑے آرام اور راحت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی حیثیت گھروں میں ایک فیملی ممبر کی سی ہوتی ہے جو زیادہ اچھے غلام ہوتے ہیں وہ اپنے آقاؤں کے معتمد وگار ہوتے ہیں اور برائے نام غلام کہلاتے ہیں۔

خانگی غلام عموماً بیس برس کی عمر میں آزاد کر دیئے جاتے ہیں کیونکہ خانگی غلام ہونے کے باعث ان کو گھر کی مستورات (خواہ آزاد ہوں یا باندیاں) کے سامنے آنا جانا پڑتا ہے۔ معزز صاحب خانہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ وہ آزاد کردہ غلام کے لیے جب بھی ممکن ہو ایک گھر کا انتظام کر دے۔

غلام کی فلاح و بہبود ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی ہے اور آزاد ہونے کے بعد بھی دونوں میں تعلقات قائم رہتے ہیں۔ آزاد ہونے کے بعد غلاموں کے لیے کسی عہدہ یا منصب کا دروازہ بند نہیں ہوتا۔ وہ آزاد ہو کر اصلاً آزاد لوگوں کے بالمقابل ہر قسم کے کاروبار زندگی میں نظر آتے ہیں اور نتائج بتاتے ہیں کہ وہ اس مقابلے میں کسی طرح بھی آزادوں سے پیچھے نہیں ہیں سب سے زیادہ باثر شہری، گھروں اور دکانوں کے مالک وہی لوگ ہیں جو پہلے غلام تھے ان کی کالی کھال ترقی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتی۔ حبشی عورتیں بالعموم گھروں میں کام کرتی ہیں اور باورچی خانہ کے انتظامات بھی سنبھالتی ہیں۔ حبشی مرد زیادہ ذہین اور سمجھدار خیال کیے جاتے ہیں۔ ان کی تربیت اعلیٰ پیمانہ پر ہوتی ہے اور اس کے ہی مطابق ان کی تعلیم ہوتی ہے۔ تجارتی کاروبار میں ان کے ساتھ ملازموں کا سا معاملہ ہوتا ہے یا معتمدین کا سا[۳۳۲]

مسٹر جوزف تھامسن (Joseph Thompson) جو افریقہ کا ایک مشہور سیاح ہے "لنڈن ٹائمز" (London Times) مورخہ ۱۴ نومبر ۱۸۸۷ء کے نام ایک خط میں "مشرقی افریقہ میں غلامی" کے زیر عنوان لکھتا ہے:

میں بے تامل یہ رائے رکھتا ہوں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مشرقی مرکزی افریقہ سے متعلق جتنا وسیع میرا تجربہ ہے آپ کے اخبار کے کسی اور نامہ نگار کا نہیں ہے کہ اگر یہاں غلاموں کی تجارت کا بازار گرم ہے تو اس کی وجہ ایک بڑی حد تک یہ ہے کہ ان علاقوں میں اسلام کا پروپیگنڈہ نہیں کیا گیا ہے اور میرے پاس یہ یقین کرنے کے قوی اسباب ہیں کہ اگر یہاں اسلام کو روشناس کرایا جاتا تو بردہ فروشی کا بھی کامل خاتمہ ہو چکا ہوتا۔

مسٹر باسورتھ اسمتھ لکھتے ہیں:

اب ہم دیکھنا یہ چاہتے ہیں کہ غلامی کی نسبت اسلام نے کیا کیا؟ اس میں بلاشبہ ترقی اور اصلاح ہوئی۔ اس کی اصلاح اور ترقی عورتوں کی اصلاح اور ترقی کی بہ نسبت زیادہ قطعی تھی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے غلامی کو بالکل موقوف نہیں کیا کیونکہ اس وقت عربوں کی حالت ایسی تھی کہ نہ تو ایسا کرنا ممکن تھا اور نہ مناسب لیکن آپ نے لوگوں کو غلاموں کے آزاد کرنے کی ترغیب دی۔ آپ نے یہ اصول قرار دیا کہ جو قیدی اسلام قبول کر لے وہ آزاد ہے۔ اس سے زیادہ قابل تعریف یہ بات ہے کہ اگر آزاد شدہ عزت اور ایمانداری کی زندگی بسر کرتا ہے تو وہ ذلیل نہ سمجھا جائے اور غلاموں کے بارہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی کہ ان سے مہربانی اور نرمی کا برتاؤ کیا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں جو وفات سے ایک سال قبل دیا تھا فرمایا کہ دیکھو غلاموں کو وہی کھانا کھلاؤ جو خود تم کھاتے ہو اور ایسا ہی کپڑا پہناؤ جو خود تم پہنتے ہو، کیونکہ وہ بھی خدا کے بندے ہیں ان کو کسی قسم کی ایذا نہ دینی چاہیے۔"

اس کے بعد پھر لکھتے ہیں:

"ایک غلام جس کو قانوناً اور مذہباً اس طرح محفوظ رکھا گیا ہو زمانہ حال کے مفہوم غلامی کے اعتبار سے غلام نہیں کہلایا جا سکتا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ قرآن میں یہ لفظ کہیں نہیں آیا، بلکہ اس کے بالعوض جو جملہ "تمہارے دائیں ہاتھ کی ملک" (مما ملکت ایمانکم) استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی جائز اسیران جنگ اور محروم الحریت اشخاص ہیں۔ ایسے غلام مسلمان ہونے کی صورت میں آزاد کر دیئے جاتے تھے اور اگر وہ اپنے [illegible] تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم کے بموجب جو آپ نے اپنے پیروؤں کو دی مسلمانوں کے بھائی خیال کیے جاتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو مالک اپنے غلاموں سے مہربانی کا برتاؤ کرے گا وہ خدا کا برگزیدہ بندہ ہے اور جو کوئی اپنی قوت کو بری طرح استعمال کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا "اگر کوئی نوکر مجھے ناخوش کرے تو مجھے کتنی مرتبہ اسے معاف کر دینا چاہیے" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ستر بار" ہر نیم شائستہ قوم کے سردار کی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدی عورتوں کو باندیاں بنانے کی اجازت دی ہے لیکن جو باندی اپنے مالک سے "ام ولد" ہو جاتی وہ نہ تو اپنی اولاد سے جدا کی جاتی تھی اور نہ دوبارہ فروخت ہو سکتی تھی

بلکہ مالک کے انتقال پر آزاد ہو جاتی تھی۔ یہ ہمدردانہ شرائط حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں پائے جاتے ہیں لیکن بہت سی باتوں میں یہ شرائط حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے شرائط سے زیادہ قابل ترجیح ہیں اور ان میں اصلاح و ترقی کا خیال رکھا گیا ہے بلکہ ایسی ہیں کہ یورپین یا امریکن بردہ فروش سلطنت نے کبھی اپنے مجموعہ قوانین میں اس وقت تک درج نہیں کیں جب تک کہ تمام عیسائی ممالک سے غلامی بالکل موقوف نہیں کر دی گئی [۲۴۳]۔

ڈاکٹر مارکس ڈاوس بھی اپنے تعصب کے باوجود اس حقیقت کا اقرار کیے بغیر نہ رہا:

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بہت شفیق اور رحمدل شخص تھے اور بے شبہ آپ کا یہ منشا تھا کہ غلاموں کی حالت میں اصلاح کریں۔ اگر آپ فی الفور غلاموں کی آزادی کا خیال کرتے تب بھی اس کو عمل میں لانا غالباً ناممکن پاتے لیکن آپ نے انما المؤمنون اخوۃ کا اعلان کر کے بتدریج اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے ایک ایسا یقینی ذریعہ سوچا جو آپ کے اختیار کے مطابق سب سے بہتر ذریعہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے موجودہ غلاموں سے نیک برتاؤ کی ہدایت فرمائی اس بارہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری نصیحت ایسی اہم اور وقیع ہے کہ اس سے قطع نظر نہیں ہو سکتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اب رہے تمہارے غلام: تو دیکھو جو تم کھاتے ہو وہی ان کو کھلاؤ، جیسا کپڑا تم پہنتے ہو ویسا ہی ان کو پہناؤ۔ اگر وہ کوئی ایسا قصور کریں جو تم معاف نہیں کر سکتے تو انہیں فروخت کر دو کیونکہ وہ خدا کے بندے ہیں اور انہیں ایذا نہیں دینی چاہیے لوگو! میری بات سنو اور اسے خوب سمجھ لو کہ مسلمان بھائی بھائی ہیں، تم سب مساوی ہو اور تم سب ایک برادری ہو۔ اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آپ کی تلقین کردہ، انسانی مساوات کی عملی مثالیں تو بعض اوقات کہیں نظر آ جاتی ہیں لیکن افسوس ہے کہ عیسائی ملکوں میں اس پر عمل نظر نہیں آتا۔ حضرت عمرؓ اپنے اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے نکلتے ہیں اور ان کا غلام اونٹ پر سوار ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی جگر گوشہ حضرت فاطمہؓ اپنی باندیوں کے ساتھ ساتھ چکی پیستی نظر آتی ہیں۔ یہ وہ نمونے ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی مکمل مثال ملتی ہے [۲۴۴]۔

مسٹر ٹی ڈبلیو آرنلڈ اپنی مشہور کتاب دعوت اسلام (The preaching of Islam) میں ہسپانیہ کے عیسائیوں میں اسلام کی اشاعت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہسپانیہ کے یہ درماندہ غلام پہلے لوگ تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ ان غلاموں نے عربوں کے آنے کو اپنے حق میں مبارک جانا کیونکہ گاتھ کی حکومت میں ان کی حالت

مظلوموں کی تھی اور مسیحی دین کا علم ان میں ایسا اوپری تھا کہ اسلام لانے کی صورت میں جو آزادی اور فائدے ان کو میسر آتے تھے ان کے مقابلہ میں یہ علم کچھ وقعت نہ رکھتا تھا۔[۴۵]

پھر پروفیسر موصوف نے باب ششم میں "یورپ کی عیسائی قوموں میں ترکوں کے ذریعہ سے اشاعت اسلام" پر بحث کرتے ہوئے بڑی صفائی کے ساتھ لکھا ہے:

"غرض اس قسم کے خیالات تھے جو ترکی سلطنت میں عیسائیوں کے دل پر بڑا اثر ڈالتے تھے اور خاص کر ان مصیبت زدہ عیسائی غلاموں پر ان خیالات کا اثر پڑتا تھا جو برسوں سے غلامی کی حالت میں مبتلا مایوسی کے ساتھ زندگی کاٹتے تھے اور جن کو غلامی سے آزاد ہونے اور اپنی تکلیفوں سے چھوٹنے کی امید باقی نہ رہتی تھی۔ پس کیا تعجب ہے کہ کسی عیسائی غلام نے اپنے دل سے یہ پوچھا ہو کہ اگر خدا ایسے دین سے خوش ہوتا جس کا تو سہارا لئے ہوئے ہے تو وہ کبھی تجھ کو اس بے کسی کی حالت میں نہ چھوڑتا، بلکہ آزادی حاصل کرنے اور اپنے قدیم مذہب میں داخل رہنے کے لیے تیری مدد کرتا لیکن اب خدا نے آزادی کا راستہ تجھ پر بند کر دیا ہے۔ اب شاید خدا کی مرضی یہی ہے کہ تو اپنا دین و آئین چھوڑ دے اور مسلمان ہو کر نجات حاصل کر"۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

"اسلامی شریعت میں جو قواعد غلامی کے تھے انہوں نے غلامی کی شدید سختیاں دور کر دی تھیں۔ علاوہ اس کے ترکی میں غلاموں کے ساتھ وہ ظلم اور بے رحمیاں نہیں ہوتیں تھیں جو شمالی افریقہ کی قزاقی عملداریوں میں گزرا کرتی تھیں۔ ترکوں میں غلاموں کو مثل آزاد لوگوں کے حقوق حاصل تھے یہاں تک کہ غلام کے ساتھ اگر آقا نے سختی کی تو غلام اپنے آقا کو قاضی کے سامنے بلا سکتا تھا۔ یا اگر غلام نے [illegible] کہ [illegible] دونوں کا مزاج ایسا مختلف ہے کہ ان دونوں کا ساتھ نبھ نہیں سکتا تو قاضی آقا کو مجبور کرتا تھا کہ غلام کو کسی اور شخص کے ہاتھ فروخت کر دے"[۴۶]

ایک اور عیسائی اہل قلم حد درجہ تعصب رکھنے کے باوجود اقرار کرتا ہے:

ترکوں کی تعریف میں یہ کہنا ضروری ہے کہ وہ اپنے غلاموں اور نوکروں کے ساتھ جن کی محنت سے وہ کسی قدر نفع اٹھاتے ہیں، اچھا سلوک کرتے ہیں اور اکثر اوقات ان کا برتاؤ عیسائیوں کے برتاؤ سے جو وہ اپنے غلاموں اور نوکروں کے ساتھ کرتے ہیں بہتر ہے۔ مسلمانوں میں اگر کوئی غلام کسی طرح کا پیشہ سیکھ لیتا ہے تو اس کو سوائے آزادی کے اور کسی بات کی ضرورت

نہیں رہتی سوائے آزادی کے اس کو تمام ایسی چیزیں میسر ہوتی ہیں جن کی ایک آزاد آدمی کو ضرورت ہوسکتی ہے۔[۲۲۷]

کان تکزی نوس نے عیسائی غلاموں کے آزاد ہو جانے کا زمانہ سات برس لکھا ہے وہ لکھتا ہے:

ترک اپنے غلاموں کا بہت اعتبار کرتے ہیں کیونکہ ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اور احکام کے ساتھ یہ حکم دیا تھا کہ غلام سات برس سے زیادہ غلامی کی حالت میں نہ رہیں، کوئی مسلمان ایسا نہیں جو اس حکم کا پابند نہ ہو۔[۲۲۸]

اسلام میں یہ حکم تو نہیں ہے کہ سات برس کے بعد آزاد کر دیا جائے لیکن اسلامی تعلیمات کی وجہ سے مسلمان کثرت سے غلام آزاد کرتے تھے، یہاں تک کہ کسی غلام کی غلامی پر سات برس سے زیادہ مشکل سے ہی گزرتے ہوں گے۔ اسی بناء پر غالباً کان تکزی نوس کو دھوکا ہوا ہے اور وہ یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ اسلام غلاموں کو ساتویں برس آزاد کر دینے کا حکم کرتا ہے بہر حال اس مغالطہ سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا سلوک غلاموں کے ساتھ کیسا تھا۔

پھر اور آگے چل کر پروفیسر ڈبلیو۔ ٹی آرنلڈ لکھتے ہیں:

بعض مورخین کا خیال ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد غلام آزاد ہو جاتا ہے لیکن ایسا نہ تھا۔ اس لئے کہ آزادی کا دینا آقا کی مرضی پر تھا۔ البتہ غلاموں کے مسلمان آقا اکثر اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ اگر ان کے غلام مسلمان ہو جائیں تو بغیر روپیہ دیئے وہ آزاد کر دیئے جائیں گے لیکن اگر عیسائی غلام اپنے تئیں خیر خواہ ثابت کرتے تھے، تو ان کے مسلمان آقا ان کو آزاد کر دیتے تھے گو وہ عیسائی مذہب پر قائم رہتے تھے اور ضعیفی کی عمر میں ان غلاموں کی گذر اوقات کے لیے آقا کوئی سامان مہیا کر دیتے تھے۔[۲۲۹]

بعض اعتراضات اور ان کے جوابات

اب ہم کو ان چند اعتراضات کی طرف توجہ کرنی چاہیے جو غلامی کے سلسلہ میں عموماً عائد کیے جاتے ہیں۔

غلام اور ملکیت

ان میں سب سے اہم اور بڑا اعتراض یہ ہے کہ غلام کو بالکل ایک شے مملوکہ کی طرح سمجھا جاتا ہے یعنی جس طرح ایک شخص اپنے گھر اور کپڑوں اور کھانے پینے کی چیزوں کا مالک ہوتا ہے اور ان پر ہر طرح کا اختیار رکھتا ہے، انہیں بیچ سکتا ہے، ہبہ کر سکتا ہے۔ کسی کے پاس رہن رکھ سکتا ہے، اسی طرح غلام کو بھی وہ بیچ کر سکتا ہے ہبہ میں بخش سکتا اور دوسرے تصرفات عمل میں لا سکتا ہے تو کیا یہ انسانیت کی توہین نہیں ہے کہ ایک صاحب عقل و ہوش انسان کو شے مملوکہ کی طرح استعمال کیا جائے؟۔

یہ ہے اصل اعتراض کا خلاصہ! جواب یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم کو اصولی طور پر یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ جنگ اور صلح دونوں کی حالتیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس بنا پر ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، صلح اور امن کی حالت میں جو چیزیں انتہائی وحشت و بربریت کی دلیل سمجھی جاتی ہیں بحالت جنگ ان کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ بعض مخصوص حالات میں واجب اور لازم قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی عقلی حقیقت ہے کہ جب تک دنیا میں خیر اور شر کا وجود تو اُم ہے اور عالم میں امن و امان کو قائم رکھنے کی ضرورت ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اخلاقی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تب بھی جنگ میں (بشرطیکہ وہ جنگ زرگری کی نہیں بلکہ شر و فساد کے عناصر خبیثہ کو قلع قمع کر دینے کے لیے ہو) جو تشدد برتا جاتا ہے قبیح نہیں بلکہ حسن ہے، قتل و خونریزی سے زیادہ ہولناک کیا چیز ہو سکتی ہے؟ لیکن معلوم ہے کہ جنگ میں اس کو کس طرح برداشت کر لیا جاتا ہے۔ بحالت صلح اگر کوئی کسی کو خطاءً بھی قتل کر دے تو قصاص نہ سہی خوں بہا (دیت) دینا پڑتا ہے لیکن جنگ میں ایک شخص اپنی تلوار کو سینکڑوں کے خون سے رنگین کر لیتا ہے اور اس سے باز پرس تو کجا اس کو بہادر کہا جاتا ہے اور انعام و اکرام کے ذریعہ اس کے فعل کی تحسین

کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ہم کو یہ بات صاف طور پر کہہ دینی چاہیے کہ اسلام نے غلامی کو محض اس ضرورت سے مجبور ہو کر (وقتی طور پر) جائز رکھا ہے کہ اس کا رواج قدیم ایام سے ہر ملک وقوم میں پایا جاتا تھا اور چونکہ یہ مسئلہ ایک بین الاقوامی مسئلہ تھا، اس لئے جب تک تمام قومیں متفق و متحد ہو کر اس رواج بد کے استیصال پر آمادہ نہ ہو جائیں اسلام خود قطعی طور پر اس کا قلع قمع نہیں کر سکتا تھا۔ اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ اسلام نے غلامی کو جس شکل وصورت میں باقی رکھا ہے، آیا یہ وہی بھیانک شکل وصورت ہے جس کے ساتھ وہ پہلے سے قائم تھی، یا اس میں ردوبدل کر کے چند در چند ایسے نقش ونگار کا اضافہ کر دیا ہے جن کے باعث غلامی غلامی نہیں بلکہ ایک طرح کی برادری بن گئی ہے۔ پس اگر اسلام میں بھی غلام کے لیے بعض وہ احکام پائے جاتے ہیں جو پہلے سے غلاموں کے لیے دوسری قوموں میں موجود تھے تو ظاہر ہے اسلام پر اس کا کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا کہ الشيء اذا ثبت ثبت بلوازمه.

غلام کا ملکیت میں داخل ہونا، ان کی بیع وشراء کا جواز اس کا وراثت میں منتقل ہونا، باندیوں کے ساتھ تسری کرنا، یہ تمام چیزیں اسلام سے پہلے موجود تھیں۔ اسلام نے جس طرح غلام کی حیثیت کو بدلا اور اخلاقی اعتبار سے اس کے مرتبہ کو بلند کیا، معاملات بالا سے متعلق بھی چند در چند اصلاحات کیں۔

اسلام سے پہلے غلام کو ایک ذی روح شے مملوکہ کی طرح سمجھا جاتا تھا، یہاں تک کہ آقا غلام کی زندگی اور موت کا بھی مالک ہوتا تھا، اگر وہ بے خطا بھی اسے قتل کر دیتا تو اس سے کوئی باز پرس نہیں ہوتی تھی لیکن اسلام نے غلام کو اس ملکیت محض سے نکال کر اس میں اتنی تخفیف کر دی ہے کہ آقا کو غلام سے صرف انتفاع اور خدمت لینے کا حق ہے اس کی انسانیت یا جان پر آقا کو ملکیت حاصل نہیں ہے۔ یہ سب باتیں بصراحت پہلے معلوم ہو چکی ہیں، یہاں صرف اس بات کا جواب دینا ہے کہ غلام کی بیع وشراء اور اس کا ہبہ کرنا کیوں جائز رکھا گیا ہے۔

اصل یہ ہے بحیثیت غلام کے جو پہلی پابندی کسی شخص کے اوپر عائد کی جا سکتی ہے وہ ملکیت کی ہے لیکن اس ملکیت سے مراد یہ نہیں ہے کہ غلام انسانیت سے خارج کوئی چیز ہے اور غیر ذی روح وعقل اشیاء کی طرح اس کے ساتھ بھی معاملہ ہو سکتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر یہ سمجھے کہ غلام کسی کی جائیداد (Property) نہیں ہوتا اور اس کی مملوکیت اس کی انسانیت کو فنا نہیں کرتی۔ علامہ ابن قیم تصریح کرتے ہیں۔

فَإِنَّ السَّيِّدَ حَقُّهُ فِي مَالِيَّةِ الْعَبْدِ لَا فِي اِنْسَانِيَّتِهِ[252]

آقا کا حق غلام کی مالیت میں ہے اس کی انسانیت میں نہیں۔

بلکہ مملوکیت سے غرض یہ ہے کہ غلام اپنے آقا کے بس اور اختیار میں ہوتا ہے۔ وہ ان حدود کے اندر جو بحیثیت ایک انسان کے کسی شخص کے لیے مقرر کی جا سکتی ہیں، غلام سے خدمت اور محنت کے کام لے سکتا ہے اور اسی طرح وہ اپنے قبضہ سے نکال کر اس کو کسی دوسرے انسان کے قبضہ میں دے سکتا ہے۔ غلام اور دوسری اشیاء کی مملوکیت میں جو فرق ہے وہ اس سے ظاہر ہوگا کہ ایک مالک کو اپنی شے مملوکہ پر ہر طرح کا اختیار اور حق تصرف ہوتا ہے۔ وہ جس طرح اس کو بیچ سکتا اور ہبہ کر سکتا ہے، ٹھیک اسی طرح اس کو ضائع اور ہلاک بھی کر سکتا ہے لیکن غلام کی مملوکیت کا حال یہ نہیں ہے آقا اس سے کام لے سکتا ہے، محنت مزدوری کرا سکتا ہے اپنے پاس سے جدا کر کے بامعاوضہ (بیع کی صورت میں) یا بے معاوضہ (ہبہ کی صورت میں) کسی دوسرے کے تصرف میں دے سکتا ہے لیکن وہ اس کو قتل نہیں کر سکتا، اس کو خصی بھی نہیں کر سکتا، یہاں تک کہ اس کے ناک کان بھی نہیں کاٹ سکتا اور اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کو حاکم کے سامنے جواب دہی کرنی ہوگی۔ اس فرق سے صاف ظاہر ہے کہ غلام کی مملوکیت کا معاملہ بالکل دوسری اشیاء مملوکہ کا سا نہیں ہے کہ ہم اس کی وجہ سے غلام کو ایک جائداد (Property) کہہ دیں۔

اس میں شک نہیں کہ غلاموں اور باندیوں کو قرآن مجید اور بعض احادیث میں مــا مــلــکــت ایــمــانــکــم کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن میرے خیال میں اس کا ترجمہ یہ ہے "کہ وہ جو تمہارے قبضہ میں ہے" ایک حدیث میں ہے۔ "املک علیک لسانک" مطلب یہ ہے کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ اسی سے املاک کسی عورت کو کسی کے نکاح میں دینے کے معنیٰ میں مستعمل ہوتا ہے۔ عورت نکاح سے شوہر کی ملک میں داخل نہیں ہو جاتی، بلکہ صرف ہوتا یہ ہے کہ شوہر کو اس سے تمتع کا حق حاصل ہو جاتا ہے جس کو فقہ کی زبان میں "ملک بضعہ" کہتے ہیں۔ پس اس طرح غلام کو "رقبہ" یا "ملک الیمین" کہتے ہیں کہ آقا اس پر چند قسم کے تصرفات رکھتا ہے۔

اب رہا اس کی بیع و شراء کا معاملہ تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ بیع و شراء بڑی حد تک غلام کے حق میں ہی مفید ہے پہلے حدیث گزر چکی ہے کہ اگر کسی آقا کی طبیعت اپنے غلام کے ساتھ میل نہیں کھاتی ہے تو اس کو چاہیے کہ غلام کو بیچ دے۔ بتائیے اگر غلام کی بیع جائز نہ ہوتی تو وہ غریب کس قدر عذاب میں رہنے پر مجبور ہوتا۔ اب یہ تو ہوگا کہ وہ ایک بد خو یا ناموافق آقا سے جدا ہو کر

ایک دوسرے شخص کے پاس آ جائیگا۔ ممکن ہے یہاں اس کی طبیعت کے موافق آ قامل جائے اور دونوں کی زندگی چین سے بسر ہو جائے۔

اس میں شبہ نہیں ایک انسان کی خرید و فروخت نہایت قبیح فعل ہے لیکن جس طرح ابتدائی تمدن کی ضرورت کے باعث غلامی کو جائز کر لیا گیا ہے، غلام ہی کی فلاح و بہبودی کی خاطر اس کی بیع وشراء کو بھی جائز مان لیا گیا ہے۔ اس کی مثال بالکل یہ ہے کہ طلاق کو ''ابغض المباحات [۲۵۲]'' فرمایا گیا ہے لیکن اس کو محض اسی غرض سے مباح رکھا گیا ہے۔ کہا کہ اگر زن وشوہر میں مزاج کی موافقت نہ پائی جائے اور وہ دونوں امن وچین کے ساتھ معاشرت نہ کر سکیں تو طلاق کے ذریعے ایک دوسرے سے مفارقت اختیار کر لیں اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح طلاق کو ضرورت کی چیز ہونے کے باعث ضرورت تک ہی محدود رکھا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح غلام کی بیع وشراء بھی ناگزیر حالات میں ہی جائز ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غلاموں کی تجارت مذموم وقبیح سمجھی جاتی تھی۔

ایک مرتبہ چند آدمی حضرت معاویہؓ کے پاس آئے۔ آپؓ نے پوچھا "کیا کرتے ہو؟" بولے "غلاموں کی تجارت کرتے ہیں" حضرت معاویہؓ نے فرمایا:

بئس التجارة ضمان نفس ومؤونة ضرس [۲۵۳]۔

یہ بری تجارت ہے کیونکہ اس میں نفس کی کفالت کرنی پڑتی ہے اور محنت بھی۔

ترمذی کتاب التفسیر سورۂ لقمان میں ہے:

عن ابی امامة عن رسول اللہ علیه وسلم قال لا تبیعوا القینات ولا تشتروهنّ ولا تعلموهنّ ولا خیر فی تجارة فیهنّ وثمنهنّ حرام وفی مثل هذا انزلت هذه الآیة "ومن الناس من یشتری لهو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ" الی اخر الآیة.

اس روایت سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بیع شراء محض ضرورۃً ہے۔ اس کو ایک مستقل انشی ٹیوشن یا ذریعہ تفریح بنانا مقصود نہیں ہے۔

عباسی دور خلافت میں غلاموں اور باندیوں کی تجارت کا رواج زیادہ ہو گیا تھا لیکن وہ لوگ بھی غلاموں کی تجارت کرنے والوں کے اعمال وافعال کی نگرانی کرتے تھے۔ حکومت کی جانب سے ایک خاص عامل اسی کام پر مامور تھا جس کو "قیم الرقیق" کہتے تھے [۲۵۴]۔

مسٹر سید امیر علی لکھتے ہیں:

""غلام کو اٹھا کر لے جانا یا غلاموں کی تجارت کرنا جو محکم عیسائیت کے زیر سایہ پلا بڑھا اور جس کا حکم یہودی مذہب میں ملتا ہے، اسلام میں نہایت درجہ قبیح اور مذموم فعل قرار دیے گئے ہیں اور جو شخص غلاموں کی تجارت کرتا ہے اس کو انسانیت سے خارج کر دیا گیا ہے"[۱۵۵]۔

پھر آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

خرید فروخت کے ذریعہ غلامی اول چار خلفاء راشدین کے عہد میں قطعاً نا معلوم ہے۔ کم از کم ایک بھی مستند دلیل اس امر کی نہیں ہے کہ خلفاء اربعہ کے عہد خلافت میں کوئی ایک غلام بھی خرید کر حاصل کیا گیا ہو۔ ہو لین خلفاء عباسیہ کے زمانہ میں شیعہ حضرت جعفر صادقؒ نے غلامی کے خلاف پر اثر وعظ کہا"[۱۵۶]۔

دوسرا اعتراض

دوسرا اعتراض اس بات پر ہے کہ غلام خود کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت اسلام کی رو سے جن لوگوں کا تکفل کسی دوسرے کے ذمہ ہوتا ہے اور تکفل بھی کسی خاص چیز کے لیے نہیں، بلکہ زندگی کی تمام ضرورتوں میں وہ خود کسی چیز میں مالکانہ تصرف نہیں کر سکتا بلکہ اس کی جتنی بھی چیزیں ہوتی ہیں ان پر ہی مکفل مالکانہ تصرف ہوتا ہے اولاد جب تک نابالغ ہوتی ہے ان کا نان نفقہ والدین کے ذمہ ہوتا ہے اس بنا پر ان کو اگر تحفۃً کوئی شے ملتی ہے، تو وہ والدین کے تصرف میں ہوتی ہے مگر ہاں بالغ ہو جانے کے بعد اولاد کا تکفل والدین کے ذمہ نہیں ہوتا تو ان میں مالکانہ تصرف کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی غلام کا حال ہے۔ آقا کو غلام کے تمام اخراجات کا تکفل کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے غلام کی ہر مملوکہ چیز مالک کی ملک میں داخل ہو گی لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ غلام میں کسی شے کے مالک ہونے کی صلاحیت نہیں ہے۔ مولیٰ اگر غلام کو اپنی طرف سے معاملات کا مختار و وکیل بنا دے تو غلام ایک حر، عاقل و بالغ کی طرح تمام معاملات کو انجام دے سکتا ہے اور اس کا عقد و معاملہ بالکل مولیٰ کا ہی سمجھا جائے گا۔

تسری

تیسرا اعتراض ''تسری'' پر ہے۔ معترضین کہتے ہیں کس قدر بدنما ہے کہ ایک عورت جو منکوحہ ہے، جنگ میں گرفتار ہو کر آتی ہے، ایک شخص اس کو باندی بنا لیتا ہے اب اس کا نکاح فسخ ہو جاتا ہے اور آقا اس سے جہاں اور مختلف خدمات لے سکتا ہے، اس کے ساتھ ہمبستری بھی کر سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں سطحی طور پر دیکھا جائے تو تسری ایک امر معیوب نظر آتا ہے لیکن اس حقیقت پر غور کیجیے کہ نکاح اصل میں ہے کیا؟ نکاح دراصل ایک معاہدہ ہے جو ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان ہوتا ہے۔ شریعت سے اس معاہدہ کی تکمیل کے لئے چند شرائط مقرر کر دی ہیں کہ اگر وہ ان شرائط کے ساتھ کیا جائے تو اس کو معتبر مانا جاتا ہے اور اس پر مختلف احکام حلت تمتع، اولاد کے نسب کا ثبوت اور وراثت وغیرہ متفرع ہوتے ہیں۔ پھر یہ معاہدہ ناقابل انقطاع نہیں ہوتا۔ بلکہ مختلف اختیاری اور غیر اختیاری اسباب کے باعث ٹوٹ بھی جاتا ہے جس طرح طلاق سے یہ نکاح فسخ ہو جاتا ہے، اسی طرح تبدیل مذہب بھی اس کو باطل کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے یہ تمام چیزیں اعتبار شارع پر موقوف ہیں لیکن اس اعتبار کے لیے کوئی وجہ وجیہ ضرور ہونی چاہیے۔ اصل بات یہ ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ زوجین ایک دوسرے کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے یا ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ان کے ماتحت دونوں کی ازدواجی زندگی کامیاب نہیں ہو سکتی تو نکاح کا فسخ ہو جانا ہی بہتر ہوگا۔ طلاق پہلی شق کا مظاہرہ ہے اور مذہب کا تبدیل کر دینا دوسری صورت میں داخل ہے۔ پس اسی طرح اگر شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس صورت میں کہ بیوی گرفتار کر لی گئی ہے اور وہ دارالاسلام میں ہے اور شوہر آزاد ہے اور دارالحرب میں رہتا ہے [illegible] ظاہر ہے ایک بڑی حکمت پر مبنی ہے جس طرح تبدیلی مذہب کے بعد ازدواجی تعلقات بالعموم خوشگوار نہیں رہ سکتے موجودہ صورت میں بھی ان کا برقرار رہنا اور نبھنا ایک امر دشوار ہے۔ یہ معاملہ کا صرف ایک رخ ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ آقا جب اپنی باندی سے گھر کے تمام کاموں میں مدد لے گا اور ساتھ ہی اس کے ساتھ ہم بستری بھی کریگا تو نفسیاتی طور پر باندی کی حیثیت بالکل خادمہ اور اجنبیہ کی سی نہیں رہے گی بلکہ وہ اس کے ساتھ ایک گونہ انسیت و محبت محسوس کریگا اور یہ احساس آقا اور باندی کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کا باعث ہوگا، پھر اگر اس باندی سے بچہ پیدا ہو گیا ہے تو یہ ام ولد ہو جائیگی اور آقا کی موت پر آزاد ہو جائیگی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ تسری کا جواز خود باندی کے حق میں [illegible] اس کو آزادی کی ایک راہ ملتی ہے اور وہ گھر میں قریب قریب ربۃ البیت کی حیثیت سے رہتی ہے۔ نکاح اور فسخ نکاح محض اعتبار شارع پر موقوف ہیں پس اگر کسی عورت کا جنگ میں گرفتار ہو جانا بمنزلہ طلاق اور کسی شخص کا اس کو باندی بنا رکھنا بمنزلہ نکاح مان لیا گیا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح مطلقہ کے لیے عدت ہوتی ہے کہ جب تک گزر نہ جائے وہ کسی سے نکاح نہیں کر سکتی۔ ٹھیک اسی طرح جاریہ کے لئے حکم ہے کہ استبراء کے بغیر اس کے ساتھ ہمبستری ممنوع ہے۔

تمتع کا تعلق بہت ہی نازک تعلق ہے۔ جانبین ایک دوسرے کے ہم کفو یا ہم مرتبہ ہونے چاہئیں۔ اس بناء پر صحابہ کرام جو اسلام کی اصل اسپرٹ سے باخبر تھے جنگ کے موقع پر بھی اس کا خیال

رکھتے تھے کہ اگر کسی اعلیٰ خاندان کی کوئی عورت جنگ میں گرفتار ہو کر آتی تھی تو اسے یا تو نہایت عزت واحترام کے ساتھ اس کے وطن واپس بھیج دیتے تھے، جیسا کہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے جنگ مصر میں بلبیس پر حملہ کیا اور شاہ مصر مقوقس کی بیٹی جس کا نام ارمانوسہ تھا گرفتار ہو کر آئی تو انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے حکم سے اس کو بڑی عزت واحترام کے ساتھ مقوقس کے پاس بھیج دیا اور مزید احتیاط کی غرض سے ایک سردار بھی اس کے ہمراہ کر دیا کہ اس کو بحفاظت تمام پہنچا آئے[۱۴۷]۔

اور یا اگر اسے باندی بنا کر رکھتے تو ہر کس وناکس کو نہیں بلکہ وہ کسی ایسے ہی شخص کو سپرد کی جاتی جو اس کی طرح خاندانی اعتبار سے بڑا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ صحابہ کرامؓ فارس سے آئے ان کے ساتھ قیدیوں میں شاہ ایران یزدگرد کی تین لڑکیاں بھی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے ان لڑکیوں کی خاندانی وجاہت کے پیش نظر ان کا معاملہ حضرت علیؓ کے سپرد کر دیا۔ حضرت علیؓ نے ان میں سے ایک حضرت محمدؓ بن ابی بکرؓ کو دوسری اپنے صاحبزادے حضرت امام حسینؓ کو تیسری حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دے دیں کہ ان تینوں بزرگوں میں سے ہر ایک اپنے عہد کا بہت بڑا بزرگ اور خاندانی اعتبار سے بہت ہی منظم ومکرم تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں حضرت صفیہؓ اور حضرت جویریہؓ سرداران قبائل کی صاحبزادیاں تھیں۔ جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر کے اپنے حبالۂ عقد میں لے لیا، پھر ان کی دلداری بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس حد درجہ فرماتے تھے کہ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہؓ کو روتے ہوئے پایا۔ وجہ دریافت کی معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ وزینبؓ کہتی ہیں "ہم تمام ازواج میں افضل ہیں، ہم کو زوجہ ہونے کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چچازاد بہن ہونے کا بھی شرف حاصل ہے"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "تو تم نے کیوں نہیں کہہ دیا کہ ہارون علیہ السلام میرے باپ۔ موسیٰ علیہ السلام میرے چچا اور محمد میرے شوہر ہیں، پھر تم مجھ سے کس طرح افضل ہو سکتی ہو؟"

ان سب کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں تسری کی اجازت کسی غرض فاسد اور شہوت رانی کے لئے نہیں ہے بلکہ چند در چند تمدنی اور معاشرتی مصالح پر مبنی ہے چنانچہ جن لوگوں نے بنی امیہ کے آخر دور حکومت اور خلفاء عباسیہ کی تمدنی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے ان پر یہ واضح ہوگا کہ ان جواری نے اسلامی تمدن کی تعمیر میں کتنا بڑا حصہ لیا ہے۔

چوتھا اعتراض

ایک اعتراض یہ ہے کہ جو قیدی جنگ میں گرفتار ہوتے ہیں ان کی حیثیت شاہی قیدیوں (State prisoners) کی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کو افراد مجاہدین میں تقسیم کر دینا کس طرح درست

ہوسکتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ جو لوگ جنگ میں گرفتار ہوتے ہیں تمدن جدید میں ان کے ساتھ تین ہی قسم کا معاملہ ہوتا ہے (۱) قتل کر دیے جائیں (۲) رہا کر دیے جائیں خواہ بے معاوضہ یا با معاوضہ (۳) ان کو قید کر کے رکھا جائے۔ ان میں سے دو صورتیں اسلام میں بھی ہیں جن کا ذکر شروع میں ہو چکا ہے اب رہی تیسری صورت تو یہ غلامی کی صورت کے مقابل ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اخلاقی اعتبار سے ان میں کونسی صورت زیادہ نفع بخش ثابت ہو سکتی ہے؟

ایسے قیدیوں کے لیے جمہوری سلطنتیں اور شخصی حکومتیں بلند چار دیواری کے قید خانے بنواتی ہیں اور ان سے سخت دشوار اور مشکل کام لیتی ہیں، یا کسی غیر آباد جزیرہ میں بھیج دیتی ہیں اور ان کے کھانے، کپڑے، رہنے سہنے کا تمام خرچ رعایا سے وصول کرتی ہیں۔ پھر جدید ٹیکس لگا کر خزانہ عامہ سے روپیہ حاصل کرتی ہیں۔ اسلام میں قید خانہ کی رسم نہیں تھی۔ اب ان دونوں طریقوں میں مقابلہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ غلامی قید خانہ کے سسٹم سے بہتر ہے۔ قید میں رہ کر کوئی شخص اکتساب فضل و کمال نہیں کر سکتا۔ اگر اس میں کوئی جوہر قابل ہوتا بھی ہے تو وہ فنا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی تمام صلاحیتیں از کار رفتہ و بیکار ہو کے رہ جاتی ہیں۔ قید میں الگ تھلگ محنت و مشقت کی زندگی بسر کرنے کے باعث اس کو فاتح قوم کی تہذیب و تمدن اور ان کے اخلاق و کمالات سے متمتع ہونے کا موقع بھی نہیں ملتا اور اس بناء پر قیدی کی یہ زندگی سراسر محنت و مشقت اور مصیبت و الم کی زندگی ہوتی ہے، بلکہ اخلاقی تربیت نہ ہونے کے باعث اس بات کا احتمال ہوتا ہے کہ قیدی کے دل میں فاتح قوم کی طرف سے جو نفرت ہے وہ شدت کی صورت اختیار کر لے اور اس کی یہ اسیری "ذوق گناہ" کی زیادتی کا سبب بن جائے۔ الغرض قید کے سسٹم میں بجز نقصان کے فائدہ کوئی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف غلامی کی صورت میں اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ کسی جدید ٹیکس کا اضافہ کر کے رعایا کو زیر بار کیا جائے، یا خزانہ عامہ پر بوجھ ڈالا جائے بلکہ غلام افراد مجاہدین پر تقسیم کر دیے جاتے ہیں اور چونکہ وہ غلاموں سے خدمت کا فائدہ حاصل کرتے ہیں اس لئے غلاموں کا تکفل ان کے لیے ناگوار بھی نہیں ہوتا۔

پھر اسلامی سوسائٹی میں رہنے سہنے کے سبب غلام کو اخلاقی تربیت اور روحانی نشوونما کا کافی موقع ملتا ہے اور اس طرح جو اپنے دشمن ہوتے ہیں ان سے دوستوں کی ایک فائدہ مند جماعت بن جاتی ہے۔ گویا صنم خانہ سے کعبہ کے رہنما دستیاب ہو جاتے ہیں۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا!

یورپ کی اجتماعی غلامی

اسلام میں غلامی کی حقیقت واضح ہو گئی ہو گی اب نامناسب نہ ہو گا کہ اگر اس مقام پر چند اشارے اس بات کی طرف بھی کر دیے جائیں کہ اسلام پر اعتراض کرنے والوں کا خود اپنا حال کیا ہے۔ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام میں اس بات کی سخت ممانعت ہے کہ بحالت امن غیر مسلموں کو زبردستی پکڑ پکڑ کے غلام بنایا جائے لیکن عیسائیوں کا حال ایک عرصے تک یہ رہا ہے کہ جو ان کے مذہب کا پیرو نہیں ہوتا تھا اس کو جبراً اسلام بنا کر بیچ دینا جائز سمجھتے تھے۔ عہد حاضر کا ایک مصنف لکھتا ہے:

ایک عرصہ تک جرمنی پادری غلاموں کی تجارت میں حصہ لیتے تھے یہودی سوداگروں کے ہاتھ میں ۱۴۵۲ء میں نکولس پنجم نے پرتگال کے بادشاہ کو اس امر کا حق دے دیا کہ وہ تمام مسلمانوں کو تباہ کر سکتا ہے اور ان کو غلام بنا کر فروخت کر سکتا ہے اور یہ فتویٰ جواز صرف غریب مسلمانوں کے حق میں ہی نہیں بلکہ تمام دشمنان مسیحیت کے لیے تھا۔ چنانچہ ۱۴۸۸ء میں ایک سو مور یعنی مسلمان ہشتم پوپ معصوم کے پاس غلام بنا کر بھیجے گئے۔ ان کا بھیجنے والا فرڈیننڈ تھا اور ان غریبوں کو امراء کے طبقے میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔

ان کے علاوہ وہ مسلمان لیے ہوئے جو غیر مرتدوں (یعنی یہودیوں) کے ساتھ تعلقات رکھتے تھے ان کو غلامی کا سزاوار سمجھا جاتا تھا، ان کے ہاں غلامی متعدد جرائم کی سزا بھی تھی، مثلاً سازش کرنا، دھوکہ دہی، عیب گوئی، چوری کرنے اور مال مسروقہ کا برآمد نہ کر سکنا اور صلیبی جنگوں کے زمانے میں مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کرنا۔[۱۲۸]

عیسائی مصنفین مسلمانوں کے مزعومہ مظالم کی داستانیں بڑی رنگین بیانی سے لکھتے ہیں لیکن انہیں کچھ خبر نہیں خود وہ ان کا ایک منصف مزاج مصنف ڈبلیو۔ ٹی۔ آرنلڈ عیسائیوں کے مظالم کے نسبت کس قدر واضح شہادت دیتا ہے۔ موصوف رقمطراز ہیں:

"اوبیا کے مسلمان علاوہ خراج کے ہر سال ایک ان بیاہی جوان عورت بھیجتے تھے جو عیسائی کر لی جاتی تھی، یہ رسم ایک قدیم عہد نامے کے بموجب جاری تھی۔ اور بادشاہ نے ہمیشہ خیال رکھا کیونکہ بادشاہ ان سے زبردست تھا، علاوہ ازیں مسلمانوں کو ہتھیار رکھنے اور لباس جنگ پہننے

کی ممانعت تھی اور حکم تھا کہ اگر گھوڑوں پر سوار ہوں تو زین نہ لگائیں۔ مسلمان کہتے تھے کہ ہم نے ان احکام کی ہمیشہ پابندی کی ہے تاکہ بادشاہ ہم کو قتل نہ کر دے اور ہماری مسجدوں کو نہ جلائے۔ ہر برس حبشہ کا بادشاہ جوان عورت کے لیے اپنے آدمی بھیجتا ہے۔ ہم اس عورت کو لے جاتے ہیں اور غسل دیتے ہیں اور بستر پر لٹا کر اس کو چادر سے ڈھک دیتے ہیں۔ تب ہم دعائیں پڑھتے ہوئے جو میت کے لیے ہوتی ہیں۔ اس عورت کو گھر کے دروازے تک لیجاتے ہیں اور پھر بادشاہ کے آدمیوں کے حوالے کر دیتے ہیں اور یہی کیا ہمارے آباء اور ہمارے اجداد نے ہم سے پہلے"۔[259]

بتایئے! کیا تاریخ اسلام کی کسی گمنام گوشے میں بھی اس طرح کی سفاکی اور انسانیت فروشی کی کوئی ایسی ہولناک مثال مل سکتی ہے۔

پھر آگے چل کر تحریر کرتے ہیں:

"بادشاہ یحییٰ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ۱۸۰۰ء میں اس نے پچاس ہزار مسلمانوں کو اور بت پرستوں میں سے ایک قوم کے بیس ہزار آدمیوں کو اور گالا کی قوم میں سے پانچ لاکھ لوگوں کو اصطباغ دیا"۔[260]

یہی فاضل مصنف ایک اور مقام پر رقمطراز ہے:

"طلیطلہ کی چھٹی مجلس نے قانون وضع کیا تھا کہ کل شاہان ہسپانیا اس بات پر حلف کیا کریں گے کہ جاثلقی مذہب کے سوا کسی دین کی پیروی ملک میں جائز نہیں ہوگی اور تمام فرقان منحرف کے خلاف سختی سے قانون جاری کیا جائے گا۔ اس کے بعد دوسرا قانون وضع ہوا اور وہ یہ تھا کہ کوئی شخص جو رسولی کلیسا یا انجیلی قواعد یا آبا کی تعریف یا کلیسا کے کلی اور مقدس کتب (صحیفہ) کو معرض بحث میں لائے گا اس کی جائداد ضبط ہوگی اور اسے حبس دوام کی سزا ملے گی۔

الفریڈ فولیہ (Alfred Fuillee) لکھتا ہے کہ:

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ایسے وحشت انگیز مناظر دیکھنے میں آتے ہیں جو کسی امریکی کے لیے باعث فخر نہیں ہو سکتے۔ ان کے ہاں ایک قانون تھا جس کو "لنش" کہتے ہیں۔ اس کی رو سے اگر کوئی سیاہ فام آدمی کسی سفید فام عورت سے اختلاط کر لیتا تو اس غریب کو تار کول سے لیپ دیا جاتا اور پھر اس کو اس طرح جلایا جاتا جس طرح چراغ جلاتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ افریقی حکومت کو مجبور کیا جاتا کہ وہ اس موقع پر اپنا کوئی نمائندہ بھیجے"۔[261]

اس کے علاوہ صلیبی جنگوں کے زمانہ میں ایسا کونسا ظلم تھا جو عیسائیوں نے اپنے مخالفین پر نہیں کیا تاریخ کے صفحات اب تک ان کے ذکر سے خونچکاں ہیں۔ پھر مسلمانوں کے ساتھ عیسائیوں کا یہ معاملہ تو اس زمانے کا ہے جب کہ ان کے ہاں غلامی عملاً موجود تھی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں غلامی کا خاتمہ قانونی طور پر کر دیا گیا تھا لیکن جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے یہ تحریک قطعاً اقتصادی مصالح پر مبنی تھی۔ انسانی فلاح و بہبود کے خیال اور عام مساوات انسانی کے جذبہ پر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چند در چند سختیوں کے باوجود یورپ کے بعض علاقوں میں اب بھی غلامی کا وجود پایا جاتا ہے۔ بلکہ انگلستان جیسے متمدن ملک میں زن فروشی کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔

زن فروشی انگلستان میں

ڈاکٹر کلوڈ سیل برزٹن روزنامہ ٹائمز لندن کے اڈیٹر کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

"آپ کے اخبار کے پچھلے نمبر میں جو اقتباس بیوی کی فروخت سے متعلق سو سال قبل ٹائمز میں سے نقل ہوا ہے اس نے مجھ کو جارج ڈیجنی کریسن کی بیان کی ہوئی روایت یاد دلا دی اپنے بچپن میں وہ ایک بار اپنے چچا کے ساتھ نارفوک کی سڑک پر جا رہے تھے سڑک کے کنارے انہیں ایک کاشتکار کھڑا ہوا ملا، اس کے ساتھ ایک عورت تھی جس کے گلے میں رسی اس طرح پڑی ہوئی تھی کہ گویا وہ بکری کا جانور ہے۔ اس عورت کو دس گھوڑوں کے ہاتھ ۱۰ شلنگ میں بیچ رہا تھا، چنانچہ ایک دوسرے کاشتکار نے اس کو خرید لیا۔ اپنے اس راوی کی عمر کا اندازہ کر کے کہتا ہوں کہ یہ واقعہ ۱۸۲۲ء سے بہت بعد کا کوئی ۱۸۴۰ء کا ہے۔"[۶۲]

مسٹر بے نل لکھتے ہیں:

مجھ کو یاد پڑتا ہے آج سے چالیس سال قبل کے روزناموں میں یہ واقعہ چھپا تھا کہ گرینڈ جنکشن کنال کے ایک ملاح نے اپنی بیوی کو ایک دوسرے ملاح کے ہاتھ چار پنس کی قیمت میں فروخت کر ڈالا تھا اور پھر مقدمہ بھی چلا تھا۔[۶۳]

مسٹر لووانسن لکھتے ہیں:

"۱۹۱۲ء کے موسم گرما میں میں ڈربی اور ناٹنگھم کے درمیان اپنی موٹر سائیکل کی مرمت کے لیے اترا، پاس ہی خانہ بدوشوں کا ایک ڈیرہ تھا۔ میں مرمت کر ہی رہا تھا کہ ایک مرد اور ایک عورت کچھ ٹوکریاں لیے ہوئے آئے۔ مرد نے کہا "ایک ٹوکری خرید لو" میں نے انکار کیا۔

بعد ازاں اس نے ایک چھری بیچنی چاہی جب اس سے بھی میں نے انکار کیا تو دو شلنگ کے معاوضہ میں اپنا کتا دینا چاہا، آخر میں اس نے چلا کر کہا "اور کچھ نہیں لیتے ہو تو لو ڈھائی شلنگ میں اپنی عورت کو بیچتا ہوں"۔[۲۶۳]

سیاسی محکومیت اور غلامی

پھر یہ دیکھو کہ جن لوگوں نے قانون کے زور سے غلامی کا انسداد کرا دیا، انہوں نے آج کس طرح دوسری قوموں کو اپنی سیاسی غلامی کے شکنجہ میں جکڑ بند رکھا ہے ان کا اپنی محکوم قوموں کے ساتھ انتہائی متکبرانہ برتاؤ، رنگ و نسل کے فرق و امتیاز کی بناء پر بنی نوع انسان کے ایک کثیر طبقہ کو اپنے برابر مدنی و شہری حقوق کا اہل نہ سمجھنا ہو شل معاملات میں ان کے ساتھ مساویانہ حیثیت سے پیش نہ آنا، طرح طرح کے قوانین کی مدد سے ان کے اعمال و افعال پر تکلیف دہ پہرے بٹھا دینا، عہدوں اور ملازمتوں کے استحقاق میں کالے اور گورے کا فرق کرنا، محکوم و مفتوح اقوام سے بیش از بیش محنت لینا اور کم سے کم اجرتیں معاوضہ دینا از خود انہی غریبوں کی خون پسینہ کی پیدا کی ہوئی دولت سے عیاشی اور تن پروری کرنا یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ ان لوگوں کا دماغ اب بھی غلام بنانے (استعباد و استعمار) کے رکیک جذبات سے خالی نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے ایک شخص ایک شخص کی غلامی کرتا تھا۔ اب ایک خاص قوم ہے جو مختلف اقوام عالم کو اپنی غلامی میں سمیٹ لینا چاہتی ہے اور اس کا معاملہ ان جماعتی غلاموں کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ برا ہے جو پہلے ایک شخص اپنے کسی ایک غلام کے ساتھ کرتا تھا۔ اسی بناء پر ٹالسٹائی نے کہا ہے:

ٹالسٹائی کی شہادت: "ہمارے زمانہ میں [illegible] کا جذبہ ایک بالکل غیر طبعی اور نادرست جذبہ ہے اور یہی دراصل ہمارے ان بھیجڑے امراض اجتماعی کا سبب ہے جن سے بنی نوع بشر فغاں سنج ہے اور یہ عجیب و غریب بات ہے کہ یہ [illegible] انسان کو ہلاک کر دینے والی لڑائیوں اور عام اسلحہ بندی کا سبب بھی جاتی ہیں۔ یورپ میں انیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں عام فوجی قانون کے باعث جس قسم کی غلامی کا ظہور ہوا درحقیقت وہ تو پہلے زمانہ کی شرمناک غلامی سے بھی کہیں زیادہ ہولناک اور ذلیل تر ہے"۔

اس کے بعد ٹالسٹائی ان حکومتوں کی مذمت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ان حکومتوں کی سنگدلی اور بد طینتی یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ انھوں نے نفسانی خواہشات اور ملک گیری کے رکیک جذبات سے پر ہو کر ممالک ایشیا، افریقہ اور امریکہ کو آپس میں تقسیم کر لینے کے مسئلہ میں مختلف ہو کر باہمی جنگ وجدل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اقوام مفتوحہ اگر پامال ہوتی ہیں تو ہوں انھیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا ہوا ہی کرتا ہے، یہ لوگ اپنے مقاصد بد کی تکمیل کے لیے ہر قسم کے عذر، فریب اور کذب و دروغ سے بھی باز نہیں آتے"۔[65]

اسلامی حکمت عملی

مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے، انہوں نے اپنے دور حکومت میں غیر مسلموں کو دربار میں اعلیٰ مراتب دیے، ملک میں بڑے بڑے عہدے اور مناصب عطا کیے، ملک و وطن اور رنگ و نسل کے امتیاز کو انہوں نے کبھی کوئی وقعت نہیں دی، یہ نتیجہ تھا کہ ان کی مذہبی تعلیمات اخوت و برادری کا جو ان کو وسیع حوصلہ اور وسیع النظر بناتی تھیں۔ ان کے اس طرز عمل سے اسلام کی اصل اسپرٹ معلوم ہوتی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کا کتنا ہمدرد ہے اور بہی خواہ ہے۔ یہی وجہ ہے مسلمانوں نے جس ملک کو فتح کیا وہاں کے باشندوں نے ان کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ محمد بن قاسم جس نے سندھ کی حکومت کو تاراج کر کے رکھ دیا۔ ہندوستان سے رخصت ہوا تو ہندوستان کے لوگوں کو اس کا سخت رنج ہوا۔ اور رو کر انہوں نے اپنے دلی غم کا اظہار کیا اور مقام کیرج میں اس کا تمثال بنا کر رکھا[66]۔ مسلمانوں کی حسن نیت و عمل کا یہی ثمر تھا کہ وہ جس کسی ملک میں گئے اس کی دولت و ثروت میں اضافہ ہو گیا، علم و ہنر کا چرچا عام ہو گیا اور تہذیب و شائستگی پھیل گئی۔ اس کے برخلاف یورپی اقوام کا معاملہ غیر قوموں کے ساتھ کیسا رہا ہے۔ اس سب کی تفصیل تو بہت طویل ہو گی، ہم مختصراً یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آج برطانوی حکمت عملی کی وجہ سے ہندوستان جس دور غلامی سے گزر رہا ہے کیا وہ اجتماعی غلامی کی نہایت ناپاک ایک مثال نہیں ہے؟

برطانوی حکمت عملی

کسی ہندوستانی نے نہیں خود ایک انگریز سر تھومس منرو نے ۱۸۱۳ء میں دار العوام میں ہندوستان کی برطانوی حکمت عملی سے متعلق کہا تھا:

"ہندوستانیوں کو فائدہ کیا دو گے؟ تم نے ان لوگوں کے ملک کو خراب اور انسانوں کو برباد کر دیا، ان کے شہزادوں کو قتل کیا، بے شک اپنی ذاتی حفاظت کے لیے تم نے ان لوگوں کو دھوکا دیا اور جہالت میں مبتلا کر دیا۔"

انگریزوں کی ذہنیت

انگریزوں کی ذہنیت سراسر مستبدانہ ہے، وہ غیر قوم پر حکومت کرتا ہے تو اس کو فائدہ پہنچانے کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے ملک کو مرفہ الحال کرنے کے لیے۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ مفتوحہ اقوام کی تخریب کر کے خود اپنے لیے تعمیر کا سامان کرے۔ ایک انگریز ایکنیس سمیڈ نے صاف لفظوں میں اعتراف کرتا ہے:

"جب کوئی قوم یا ملک غلام بنایا جاتا ہے تو فاتح سب سے پہلے یہ کام کرتا ہے کہ تعلیم کو تباہ کر دیتا ہے، یا بہت بری طرح سے ناقص کرتا ہے کیونکہ علم اور غلامی ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے"

ڈیوک آف ڈیون سائر اسی امر کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"یہ غیر دانشمندانہ فعل ہے کہ ہندوستان کے لوگ زیور علم سے آراستہ کیے جائیں جدید تہذیب، جدید ترقی، جدید علم و ادب سے انہیں سیراب کیا جائے اور پھر ان سے یہ بھی کہا جائے کہ ملکی معاملات میں حصہ لینے کا بجز اس صورت کے انہیں کبھی موقع نہیں ملے گا کہ وہ پہلے اپنے یورپین حکمرانوں سے چھٹکارا حاصل کریں"۔

سر ولیم ڈگبی پراسپرس انڈیا میں مسٹر جوزف اسمتھ کے۔ سی بی کی شہادت درج کرتے ہیں جس سے ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق حکومت کا تخیل نمایاں ہو جائے گا:

"سوال نمبر ۸۶۲ کیا آپ کسی [illegible] رکھ سکتے ہیں کہ دیسیوں کو ان کی طاقت کا علم نہ ہو؟

جواب: میرے خیال میں انسانی تاریخ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ معدودے چند اغیار چھ کروڑ آبادی کے ملک پر حکمرانی کر سکیں جسے آج کل رائے کی بادشاہت کہتے ہیں۔ اس لیے جونہی وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو تعلیم کے اثر سے ان کے قومی اور مذہبی تفرقے دور ہو جائیں گے جس کے ذریعے ہم نے اس ملک کو اب تک قبضہ میں رکھا ہے۔ یعنی مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف کرنا اور علی ہذا القیاس تعلیم کا یہ اثر ضرور ہو گا کہ ان کے دل بلند ہو جائیں گے اور انہیں اپنی طاقت سے آگاہی ہو جائے گی"۔

آنریبل مسٹر الفنسٹن اور ایف وارڈن نے ۱۸۱۳ء و ۱۸۲۴ء میں مسئلہ تعلیم پر ایک یادداشت مرتب کی تھی۔ اس میں انہوں نے اس نقصان عظیم کو تسلیم کیا ہے جو ہندوستان کو انگریزوں کی استعماری پالیسی سے پہنچا وہ لکھتے ہیں:

"ہم نے ہندوستانیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیے اور ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ تعلیمی ترغیب نہیں ہوئی بلکہ اس سے قوم کا علم سلب ہوا جاتا ہے اور علم کے پچھلے ذخیرے نیست و نابود ہو رہے ہیں۔ اس الزام کو رفع کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے"۔

چنانچہ ہندوستان کی انگریز حاکموں کے ہاتھوں عام جہالت و بربادی کو دیکھ کر سر ڈی ہملٹن نے کہا:

"اگر کبھی انگریزوں کو ہندوستان اس طرح چھوڑنا پڑا جس طرح رومن نے انگلستان کو چھوڑا تھا، تو وہ ایک ایسا ملک چھوڑ جائیں گے جس میں نہ تعلیم ہوگی نہ حفظان صحت کا سامان ہوگا اور نہ دولت ہی ہوگی"۔

ڈاکٹر جے ٹی سوڈر لینڈ لکھتا ہے:

"ہندوستان میں جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ اس کی ذمہ داری بلاشبہ انگریزوں کے سر ہے۔ چند ادنیٰ ترین فرقوں کے علاوہ سب علم کے خواہاں ہیں اور حصول علم کی سچی آرزو رکھتے ہیں۔ ہندوستانی رہنما پچاس سال سے تعلیم تعلیم پکار رہے ہیں لیکن یہ چیخ و پکار او رمطالبہ بے سود ثابت ہوتا ہے۔ انگریزوں کو غیر ضروری پنشن دینے اور اس سے بدتر سلطنت کی خاطر غیر ضروری فوجی اور دیگر مدات پر کثیر رقمیں صرف کرنے کے بجائے، اگر یہ روپیہ ہندوستانیوں کے مفاد پر صرف کیا جائے تو ہندوستانیوں میں عام تعلیم کو جاری کرنے کے لیے روپیہ وافر ہے"۔

شروع شروع میں تو انگریز ہندوستانیوں کے لیے تعلیم کے مواقع بہم پہنچانے میں دریغ ہی کرتے رہے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ لوگ روشن دماغ ہو کر اپنی سیاسی طاقت سے باخبر ہو جائیں گے اور اپنے حقوق کا مطالبہ شروع کر دیں گے لیکن بعض مدبرین برطانیہ نے اس کی طرف توجہ دلائی کہ ہندوستان کو پائیدار اور مضبوط غلامی کے شکنجہ میں کسنے کے لیے تعلیم سے محروم رکھنے کی پالیسی غلط ہے۔ اس کے برعکس ان کو تعلیم دینی چاہیے مگر ہندوستانیوں کے اپنے علوم فنون اور ان کی زبانوں کی نہیں بلکہ خود زبان انگریزی کی، یہاں تک کہ دفتری زبان بھی فارسی اور اردو کی بجائے انگریزی

ہی ہونی چاہیے۔اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ خود ان کے الفاظ میں سنیے۔کرنل گوڈمین جو پنجاب کے انسپکٹر آف سکولز تھے ۱۸۸۲ء میں لکھتے ہیں:

حکومت برطانیہ نے ہندوستان میں اسکول صرف اس لیے کھولے ہیں کہ عوام الناس میں وفاداری کا جذبہ ہو اور حکومت کی بنیاد مضبوط رہے۔

لارڈ مکالے ۱۸۳۵ء کے مراسلہ میں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی تعلیمی حکمت عملی کے متعلق لکھا گیا ہے، لکھتے ہیں:

''تعلیم یافتہ ہندوستانی ذوق طبع، رائے واخلاق اور خیالات میں بالکل انگریزوں کے رنگ میں رنگے جائیں گے، اس طرح ہندوستان اور انگلستان کا تعلق ہمیشہ کے واسطے اور مستحکم اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائیگا''۔

اس خواب کی تعبیر بھی جلد ہی مل گئی اور زعماء انگلستان نے اس کا صاف لفظوں میں اعتراف کیا کہ ہماری موجودہ تعلیمی حکمت عملی سے ہندوستان بڑی مدت تک کے لیے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے اور اب ہم اطمینان کے ساتھ ان پر حکومت کر سکتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر ہنٹر نے کہا:

''ملک کے ساتھ دماغ بھی فتح کر لیا گیا''۔

کاونٹ اڈومین کہتا ہے:

''ہندوستان کے دماغ اور ذہانت کے متعلق انکار نہیں کر سکتا لیکن یہ تعجب ہے کہ کس طرح مغربی تعلیم کے طریقے نے ان کو خراب کیا اور ان کی روایتی ذہانت وفراست کو بالکل مفلوج کر دیا۔

میکولے نے انگریز حاکموں کی ذہنیت کا راز اس طرح فاش کیا:

ہم لوگ ہندوستان کے ایک طبقہ کو ایسا بنانے کی کوشش کریں گے کہ خون اور رنگ میں تو وہ ہندوستانی ہو لیکن کیفیت، خیال اور ذہنیت میں بالکل انگریز جیسا ہو اگرچہ کہنے کو ہندوستان میں یونیورسٹی، کالج، اسکول موجود ہیں لیکن پھر بھی ۹۵ فیصدی ہندوستانی جاہل ہیں۔ موجودہ انگریزی تعلیم میں اس قدر خرچ ہے کہ غریب تو کیا اوسط درجہ کے لوگ بھی مختصر تعلیمات کے اخراجات کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن جو تعلیم حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتے اور خرچ کو برداشت کر کے اسکول یا کالج میں داخل بھی ہو جاتے ہیں تو یونیورسٹی کی مہربانی ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے کہ آدھے سے زیادہ لڑکوں کو ناکام کر دیا جاتا ہے اور تعلیم اس عنوان سے دی

جاتی ہے کہ نہ تو کوئی بڑا انجام دے سکتے ہیں اور نہ کسی فن میں کمال حاصل کر سکتے ہیں بلکہ غلامانہ ذہنیت ان لوگوں کے دماغوں میں پیدا کر دی جاتی ہے اور بعض جو کامیاب ہوتے ہیں اور اسکول و کالج سے باہر نکلتے ہیں تو وہ حکومت کی ملازمت یا اور کوئی دوسری نوکری کرنے لگتے ہیں اور اس غلامی کو معراج سمجھنے لگتے ہیں اور اسی طرح اپنی حقیقی زندگی کو ختم کر دیتے ہیں"۔

مسٹر جے سی چٹرجی سپرنٹنڈنٹ ایجوکیشن صوبہ دہلی نے ایک تعلیمی رپورٹ میں لکھا ہے:

"معلوم یہ ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ افراد میں تعلیم نفاق کی ایک خلیج پیدا کر دیتی ہے، جس سے اندیشہ ہے، آئندہ سیاسیات پر عمل درآمد مشکل ہو جائے گا، اور ہمارے گھر کے معاشی حالات پر ناخوشگوار اثر پڑے گا"۔

ان بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی اشاعت سے انگریزوں کا اصل مقصد ان کے دل و دماغ کی اخلاقی تربیت، روحانی رفعت و بلندی اور معاشی مرفہ الحالی و خوشگواری نہیں تھا، بلکہ غرض یہ تھی کہ ہندوستان کی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کیا جائے جسم کے ساتھ ساتھ ان کے دل اور دماغ کو بھی غلام بنا لیا جائے۔ کیا اسلام کے کسی حکم یا مسلمانوں کی تاریخ سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے غیر قوموں کو اس طرح اپنی اجتماعی غلامی میں جکڑ بند کرنے کے لیے اس طرح ریشہ دوانیوں اور دسیسہ کاریوں سے کام لیا ہو۔

اقتصادی بدحالی

انگریزوں کی اس تباہ کن ذہنیت کا اثر جس طرح تعلیم میں ظاہر ہوا اس کے باعث ملک کی اقتصادی حالت بھی دن بدن کمزور ہوتی چلی گئی۔ آج بے روزگاری اور عام افلاس کی وجہ سے ہندوستان کا جو کچھ حال ہے، زعمائے انگلستان نے اس کو پہلے ہی معلوم کر لیا تھا اور وہ اس بدحالی اور زبوں حالی سے متعلق ایسٹ انڈیا کمپنی کے طرز عمل پر نکتہ چینی کرتے ہوئے پہلے ہی پیشین گوئی کر چکے۔ مسٹر برک جو کمپنی کے طرز حکومت کے بہترین مفسر ہیں انہوں نے ایک مرتبہ پارلیمنٹ میں ہندوستانی مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"عربوں، ایرانیوں اور تاتاریوں نے ہندوستان پر بہت حملے کیے جن سے اکثر انتہائی خونریزی اور تباہی ہوئی۔ ان کے مقابلہ میں عموماً ہمارے قدم اس ملک میں اتنا خون بہا کر نہیں بڑھے۔ البتہ ہم نے دغا اور فریب کی مختلف صورتوں کے ساتھ پیش قدمی کی اور اس اندھی اور

احمقانہ عداوت سے فائدہ اٹھایا جو ہندوستانی والیان ملک کے درمیان ایک لاعلاج مرض کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ ہم نے کھلے میدان میں قوت آزمائی نہیں کی لیکن سابق فاتحین میں اور ہم میں ایک فرق تھا اور وہ یہ کہ ان کی خوشحالی اور بربادی ان کے نئے وطن یعنی ہندوستان کی خوشحالی اور بربادی کے ساتھ وابستہ ہو جاتی تھی، ان کے ماں باپ سوچتے تھے تو یہ کہ اسی سرزمین میں ان کی اولاد پھلے پھولے گی۔ اسی طرح ان کے بیٹوں کو بھی ان کے اسلاف کی یادگاریں یہیں محفوظ نظر آتی تھیں زمانہ سابق کے فاتحین کاشتکار اور صناع سے بھاری بھاری محصول تو لیتے تھے لیکن وہ ان کی جیبوں کو جن سے دوبارہ فائدہ اٹھاتے تھے از سرنو بھی دیتے تھے لیکن انگریزی حکومت میں یہ نظام بالکل بدل گیا ہے۔ تاتاریوں کی یورش سے بیشک ہندوستانیوں کو نقصان پہنچا تھا مگر ہماری حفاظت ہندوستان کو تباہ کیے ڈالتی ہے۔ نوعمر لونڈے ملک پر حکومت کر رہے ہیں، جہاں کے باشندوں سے نہ ان کا میل جول ہے اور نہ ان سے ہمدردی ہے۔ دولت کی ہوس اور تیز مزاجی جتنی کسی جوان میں ہو سکتی ہے وہ ان لوگوں میں بھری ہوتی ہے اور ملک میں ان کی آمد کا ایک تانتا لگا ہوا ہے۔ ایک کھیپ لوٹتی ہے تو دوسری پہنچ جاتی ہے۔ ہندوستانی رعایا کے سامنے مستقبل کی صرف ایک مایوس کن صورت ہے اور وہ یہ کہ ایک غیر محدود زمانہ تک ان موسمی شکاری پرندوں کے نئے نئے غول اسی طرح آتے جاتے رہیں گے جن کی بھوک ہر مرتبہ اور زیادہ تیز ہوتی رہے گی درآنحالیکہ جس چیز کے وہ بھوکے ہیں وہ کمیاب ہوتی جائیں گی۔ (تصانیف برک ج ۳ ص ۷۸۔۷۹)

ایسٹ انڈیا کمپنی کی عہد میں بنیا گردی

ملک کی عام اقتصادی بدحالی کا ایک بڑا سبب یہ ہوا کہ انگریزوں نے قدیم زمینداروں کو ان کے اصل مالکوں کے قبضے سے نکال کر بنیوں کو دے ڈالا جن سے خود انگریزوں کا بڑا مفاد وابستہ تھا۔ بڑے بڑے علاقے ان بنیوں کے نام ٹھیکہ پر دیئے جاتے تھے لیکن اصل ٹھیکہ دار کوئی بااختیار انگریز ہوتا تھا جو خود پردے میں رہتا تھا۔ اس وقت کے قانون کی رو سے کسی ایک شخص کو ایک لاکھ سے زائد مالگذاری کا ٹھیکہ دینا جائز نہ تھا مگر بڑے بڑے صاحبوں کے لیے اس قانون سے آزاد تھے۔ خود وارن ہسٹنگز گورنر جنرل کا بنیا کنٹو یا جو تیرہ لاکھ کا ٹھیکہ دار تھا۔ ایک دوسرا بنیا گنگا گوبند سنگھ بھی وارن ہسٹنگز کا آلہ کار تھا اور اس کی نسبت دارالعوام میں جولائی ۱۷۸۵ء میں ایک حساب دکھایا گیا تھا، جس کی رو سے گنگا گوبند سنگھ کی کمائی تین کروڑ بیس لاکھ روپے کے قریب

تھی ۔[۲۶۸] اسی طرح گورنر کے دیوان رام چندر کی نسبت بیان کیا گیا تھا کہ وہ ساٹھ روپے ماہوار کا ملازم تھا مگر اس نے ساڑھے بارہ کروڑ کے قریب ترکہ چھوڑا تھا۔ کمپنی کے ایک ایجنٹ روپ کشن کے پاس اتنی دولت تھی کہ اس نے ماں کے مرنے پر نو بے لاکھ صرف کیا تھا۔

انگریزوں نے کس طرح ان بنیوں کو اپنے لئے آلہ کار بنا رکھا تھا۔ مسٹر برک اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بنیا یا دیوان انگریز کے گھر کا منتظم ہوتا ہے، وہ تمام چالبازیوں اور عیاریوں سے واقف ہوتا ہے جو مظالم سے بچنے کے لیے ایک غلام استعمال کرتا ہے، بنیا لوٹتا ہی استحصال بالجبر کرتا ہے، غارتگری کرتا ہے اور پھر اس میں سے جس قدر مناسب سمجھتا ہے اپنے صاحب کو بھی دے دیتا ہے۔ ان بنیوں نے بڑے بڑے گھرانے الٹ دیے ہیں ملک برباد کر دیا ہے۔"

انگریزوں کی اس حکمت عملی کے باعث بنیوں نے کیا کیا مظالم کیے اور ملک کو کس طرح برباد کیا۔ مسٹر بروک حسب ذیل الفاظ میں اس کی شہادت دیتے ہیں:

"زمیندار گھر بار اور نوکر چاکر سب چھوڑ چھاڑ کر بھاگ نکلے اور بھاگنے سے قبل اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہ اوقاف نیلام ہو رہے ہیں جو انہوں نے یا ان کے بزرگوں نے خدا کی راہ میں اس لیے دے رکھے تھے کہ ان کی آمدنی سے بیواؤں، یتیموں، لنگڑے لوگوں اور اپاہجوں کی امداد کی جائے، وہ جائدادیں بھی جو انہوں نے کفن دفن اور مرتے وقت کی رسموں کے لیے علیحدہ کر رکھی تھیں فروخت کر دی گئیں۔ افسوس کہ جانکنی کے وقت۔ سکون اور اطمینان سے گزر جانے کا سہارا بھی اس ظالم ہاتھ نے قطع کر دیا۔ اف کیسا ظالم ہاتھ تھا جس کا ظلم چتا کی آگ سے زیادہ جلانے والا اور قبر سے زیادہ حریص اور موت سے زیادہ بے رحم تھا"

کاشتکاروں کی تباہی

"ان زر پرست بنیوں کا قبضہ کاشتکاروں کے لیے بھی سخت مصیبت تھا، لگان کی وصولی میں ان پر طرح طرح کی سختیاں کی جاتی تھیں اور جانوروں کے غولوں کی طرح قید میں رکھ کر آخری کوڑی تک ان کی جیبوں سے نکلوائی جاتی تھی اور ان طریقوں سے بھی مطالبہ پورا نہ ہوتا تو ان کے ڈھور ڈنگر اور گھر کا سامان نیلام کر دیا جاتا بیسیوں گھروں کو لوٹ کر آگ لگا دی گئی ان مظالم سے تنگ آ کر کسان بھاگنے لگے تو فوجوں کا گھیرا ڈال کر انہیں واپس کیا

گیا تا کہ وہ انہی کھروں میں رہیں جو قید خانوں سے کم نہ تھے۔ پھر اپنے گھروں کے مصائب سے تنگ آ کر بہت سے کاشتکار جنگلوں میں جا چھپے تو وہاں بھوک اور جنگلی جانوروں نے عاجز کر دیا۔ تب وہ پھر واپس آئے اور مجبوراً مقابلہ کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اس بلوکو پہلے بے قاعدہ اور پھر باقاعدہ فوج کے ذریعہ دبایا گیا۔ اور ظلم کی تلافی میں اور زیادہ مظالم کیے گئے۔

انگریز تاجروں کے اعمال پر نکتہ چینی کرتے ہوئے میجر باسو' انگریزی سلطنت کا استحکام'' میں لکھتے ہیں:

یہ تجارت ظلم کی ایک مشین ثابت ہوئی جس سے بدقسمت اور مجبور کاشتکار تباہ ہونے لگے۔ ان پر ان کے انگریز آقا طرح طرح کی مہذب بربریت کا استعمال کرتے تھے۔ اور اس سے محظوظ ہوتے تھے۔ (ص ۵۱)

عام بے روزگاری و پریشان حالی

ظلم واستبداد کے ذریعہ ہندوستان کے کاروبار پر قبضہ کرنے اور دیسی منافع کی راہوں کو بند کر دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سینکڑوں زمیندار اور ہزاروں سپاہی اور ملازم بے روزگار ہو گئے تھے۔ قاعدہ ہے ''تنگ آمد بجنگ آمد'' چنانچہ ان لوگوں نے مجبوراً لوٹ مار کا پیشہ اختیار کر لیا۔ غضب ہے ناگپور سے لے کر خلیج بنگال تک تیئس ہزار پنڈارے لوٹ مار کرتے پھرتے ان لوگوں نے ۱۸۱۹ء کے موسم سرما میں صرف دس دن کے اندر ایک سو بیاسی آدمی قتل کیے، پانچ سو کو زخمی کیا اور تقریباً تین ہزار انسانوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں اور ایک کروڑ کا مال لوٹا[۲۶۹]۔

صنعت وحرفت

کمپنی نے زمینداریوں کے تباہ کرنے ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ یہاں کی صنعت وحرفت کو بھی مٹایا۔ مشہور مورخ ہند مسٹر ولسن لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے ساتھ اس ملک نے جس کا طب وہ محکوم ہے بڑی بے انصافی کی ہے۔ اس کی ایک افسوسناک مثال یہ ہے کہ ۱۸۱۳ء میں ایک گواہ نے (تحقیقاتی کمیشن کے سامنے) بیان کیا تھا کہ اس وقت تک ہندوستان کے سوتی اور ریشمی کپڑے برطانیہ کے بازاروں میں وہاں کے بنے ہوئے مال سے پچاس اور ساٹھ فیصد سستے بکتے تھے اور پھر بھی نفع کے ساتھ لہذا

ضروری ہوا کہ ستر اور اسی فیصد کے امتناعی محصول لگا کر انگلستان کی مصنوعات کا تحفظ کیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا اور یہ انسدادی محصول اور احکام نہ ہوتے تو مانچسٹر اور پسلے کے پتلی گھر کھلتے ہی بند ہو گئے ہوتے اور بھاپ کی طاقت بھی ان کو متحرک نہ کر سکتی۔

کمپنی نے ہندوستانی صنعت وحرفت کو برباد کرنے کے اعلانیہ احکام صادر کر دیے کہ بنگال میں ریشم پیدا کرنے کی کوشش کی جائے لیکن ریشم کے کپڑے تیار کرنے کو روکا جائے جتنے جولاہے تھے زبردستی کمپنی کے ملازم بنا لئے گئے اور ان کی سخت ممانعت تھی کہ کسی اور کے لیے کپڑا بنیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو انہیں سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔[170]

ملازمت

اسی طرح جتنی اعلیٰ ملازمتیں تھیں، وہ بھی سب سفید فام انسانوں کے لیے وقف تھیں ہندوستانی ان سے الگ رکھے جاتے تھے، پھر ان انگریز عہدے داروں کی تنخواہیں اس قدر زیادہ تھیں کہ ملک کا عام دستور کسی طرح اس کی اجازت ہی نہیں دے سکتا۔

حالت امروز

آج دعویٰ کیا جاتا ہے، ہندوستان کو بڑی بڑی اصلاحات مل چکی ہیں، صوبجاتی خودمختاری ہے۔ اپنی وزارتیں ہیں، اپنی مجالس مقننہ ہیں لیکن کیا اس قدر ترقیوں کے باوجود انگریز اور ہندوستانی عہدوں کے استحقاق کے اعتبار سے برابر سمجھے جاتے ہیں۔ کیا مالیات کا شعبہ ان کے ہاتھ میں ہے کیا فوج کے نظم ونسق میں ان کو کوئی دخل ہے۔ کیا مجالس مقننہ اپنی رائے اور فیصلہ کے نافذ کرنے میں آزاد ہیں۔ کیا وزراء کو قوت منفیہ حاصل نہیں ہے۔ کیا عام اسلحہ رکھنے کی اجازت ہے۔ کیا سول سروس میں انگریز اور ہندوستانی دونوں کی تنخواہ کا معیار ایک ہی ہے۔ پھر ایک ہندوستان پر ہی کیا موقوف ہے، یہ مستعمرانہ پالیسی کہاں اپنے کام نہیں کر رہی ہے۔ کیا اسلام کے دستور سے کوئی ایسا حکم پیش کیا جا سکتا ہے جس میں مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہو کہ وہ غیر قوموں کو اس طرح اپنی اجتماعی غلامی کی زنجیروں میں باندھ لیں۔ کیا اسلام کی تاریخ میں اس طرح کی تنگ نظری، ذہنی تسفل اور دماغی فروتنی کی کوئی مثال مل سکتی ہے۔ مولانا شبلی نے اسی بنا پر سچ کہا تھا:

اس مساوات پہ ہے معشر اسلام کو ناز
نہ کہ یورپ کی مساوات کہ ظلم اکبر![171]

منکرین رقیت کے دلائل پر ایک نظر

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے دلائل پر ایک نظر ڈالی جائے۔ جنہوں نے غیر مسلموں کے اعتراضات سے مرعوب ہو کر اسلام میں غلامی کے وجود سے ہی انکار کر دیا ہے۔ رقیت کا قطعی انکار غالباً سب سے پہلے سر سید احمد خان نے کیا ہے، پھر ان کے ایک رفیق طریق مولوی چراغ علی نے اپنی کتاب "Proposed political legal and social reforms under muslim rule" میں (جس کا اردو ترجمہ "اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام" کے نام سے مولوی عبدالحق بی اے (علیگ) نے کیا تھا) غلامی کے مسئلے پر بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور اس میں سر سید کی تقلید میں یہی ثابت کرنا چاہا ہے کہ اسلام میں غلامی کا کہیں وجود نہیں ہے۔ فاضل مصنف نے اس میں اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے جو دلائل قائم کیے ہیں کوئی منکر رقیت ان سے زیادہ قوی دلائل قائم نہیں کر سکتا۔ اس لیے صرف انہی پر ایک نظر ڈال لینا اصل مسئلہ کا فیصلہ کر دینے کے لیے کافی ہے۔

پہلی دلیل

مولوی صاحب نے سب سے پہلے قرآن مجید کی آیت "فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً" سے استدلال کیا ہے لیکن ہم اس پر کتاب کے آغاز میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس آیت کے علاوہ جتنی آیات نقل کی گئی ہیں ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ غلاموں کے ساتھ ملاطفت اور نرمی کا برتاؤ کرو۔ ان کو آزاد کراؤ، انھیں کفارہائے ظہار و قتل خطاء وغیرہ میں آزاد کرو، وغیرہ وغیرہ لیکن یہ کسی آیت سے نہیں معلوم ہوتا کہ استرقاق کو قطعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

دوسری دلیل

آیات کے بعد احادیث کا نمبر ہے۔ موصوف کو احادیث کے ساتھ جو اعتقاد ہے اس کو کس صفائی سے بیان کرتے ہیں:

"میں شاذ ونادر ہی احادیث نقل کرتا ہوں کیونکہ مجھے ان کی صحت پر زیادہ اعتقاد نہیں، اس لیے کہ وہ عموماً غیر مستند، بے ثبوت اور یک طرفہ ہوتی ہیں"۔

اس اعتقاد کے باوجود آپ نے احادیث کو ثبوت میں پیش کرنے کی تکلیف کیوں گوارا کی؟

اس کی بابت خود ہی کہتے ہیں:

لیکن ان لوگوں کی دلچسپی کے لیے جو حدیث کے بہت شائق ہیں ایسی احادیث کی تلاش کرنے کا کام بھی میں نے اپنے ذمہ لیا جو غلامی کو ناجائز قرار دینے میں قرآن کی ہم زبان ہیں"۔

مولوی صاحب نے احادیث کو یک طرفہ کہا ہے لیکن وہ خود اپنی بات کی پچ کر رہے ہیں ور کہتے ہیں:

"ان کے علاوہ وہ حدیثیں رد کردینی چاہئیں جو غلامی یا اس کی متعلقہ خرابیوں کو تسلیم کرتی ہیں"

بہر حال اب جن احادیث سے استدلال کیا گیا ہے۔ ان پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے

آپ نے سب سے پہلے وہ حدیث نقل کی ہے جس میں فرمایا گیا ہے "عربوں کا غلام بنانا جائز ہوتا تو آج بہت سے عرب اسیر ہوتے" آپ اس سے استدلال کرتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غلامی کو ناجائز سمجھتے تھے"

تعجب ہے حدیث میں صاف طور پر عربوں کو غلام بنانے کا ذکر ہے۔ مولوی صاحب اس سے مطلق غلام بنانے کے عدم جواز پر استدلال کر رہے ہیں۔ "اگر عربوں کا غلام بنانا جائز ہوتا" ان لفظوں سے یہ خود معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کو تو نہیں، البتہ غیر عرب کا غلام بنانا جائز ہے۔ رہا عرب کو غلام بنانا تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کو خود حضرت عمرؓ نے ناجائز قرار دیا تھا اور اسی بناء پر فقہاء اسلام کا ایک طبقہ کے نزدیک یہ ناجائز ہے بھی۔

اس حدیث کے بعد ان چند احادیث کو نقل کیا ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسیران حرب کو غلام نہ بنانے اور آزاد کردینے کا ذکر ہے۔ ان احادیث سے بھی مولوی صاحب کا مدعا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ ان احادیث کے بالمقابل ایسی بعض حدیثیں بھی ہیں جن میں اسیران جنگ کو مجاہدین اسلام پر تقسیم کردینے کا ذکر ہے اور ہم یہ پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ اس میں شک نہیں اکثر مواقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیران جنگ کو آزاد کردیا ہے لیکن اس سے بھی انکار مشکل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص خاص حالات میں استرقاق کو جائز رکھا ہے۔

اس کے بعد زمانہ محاصرۂ طائف کا وہ اعلان درج کیا گیا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "اگر شہر سے کوئی غلام ہمارے پاس آئے گا تو وہ آزاد کر دیا جائیگا۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں:

> اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غلامی کو جائز نہیں سمجھتے تھے ورنہ وہ دوسرے لوگوں کے غلام آزاد کرنے میں آپ کو کس طرح مجاز خیال کرتے۔

غور کیجیے تو یہ استدلال بھی نہایت رکیک وضعیف معلوم ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ آپ کا یہ اعلان ان غلاموں کی تالیف قلب کے لیے تھا۔ اس کے علاوہ فقہ اسلام کی رو سے ایک غلام اگر دارالحرب سے بھاگ کر دارالاسلام میں آجائے اور اسلام قبول کرلے تو وہ آزاد ہو جاتا ہے۔

مولوی صاحب نے اس موقع پر بڑی تلبیس سے کام لیا ہے، حدیث طائف سے استدلال کرنے کے بعد لکھتے ہیں "از روئے قانون عرب و فقہ اسلام ایک مفرور غلام یا ایسا غلام جو اسلام قبول کرلے آزادی کا حق نہیں رکھتا[۲۷۲]" حالانکہ یہاں سوال یہ نہیں ہے کہ محض اسلام قبول کر لینے سے یا دارالحرب سے بھاگ آنے پر کوئی غلام آزاد ہو جاتا ہے یا نہیں، بلکہ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی غلام اپنے مولا کی مرضی کے خلاف دارالحرب سے بھاگ آئے اور مسلمان ہو جائے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محاصرۂ طائف کے اعلان کے بعد بعض غلاموں نے کیا، تو وہ آزاد ہو جاتے ہیں یا نہیں؟ تو اس کے متعلق فقہ اسلام کا مسئلہ ہے کہ وہ غلام آزاد ہو جائیں گے۔ سعدیات میں جو فقہ کی مستند کتاب ہے لکھا ہے:

> ولو كان العبد مملوكا لحربي فخرج الىٰ دار الاسلام مسلماً كان حُرًا۔
>
> اگر غلام کسی حربی کا مملوک ہو اور مسلمان ہو کر دارالاسلام میں چلا آئے تو وہ آزاد ہو جائیگا۔

پھر اس کے آگے ہے:

> ولا استرقاق على المسلم ابتداء[۲۷۳]۔
>
> اور مسلمانوں پر ابتداء استرقاق نہیں ہے۔

اور اس حکم کے لیے استدلال اسی محاصرۂ طائف کے اعلان اور صلح حدیبیہ کے واقعہ سے کیا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو غلام بھاگ کر چلے آئے تھے۔ اور آپ نے ان کی آزادی کو تسلیم کر لیا تھا۔

علامہ شامی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اگر کوئی غلام دارالحرب سے اپنے مولیٰ کی مرضی کے خلاف بھاگ کر دارالاسلام میں آجائے تو وہ سب کے نزدیک آزاد ہو جاتا ہے فرماتے ہیں:

> لا نعلم فيه خلاف بين اهل العلم[۲۷۴]۔

اس مسئلہ میں اہل علم مختلف نہیں ہیں۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ مولوی صاحب کو فقۂ اسلام کی اس تصریح کی خبر نہیں تھی لیکن یہ صحیح نہیں ہے، انہوں نے اپنی کتاب کے فقرہ ۱۲۶ اور ۱۲۷ کے ماتحت خود فقہاء کے ان اقوال کو شامی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ پس اصل بات یہ ہے کہ جہاں فقہاء کی تصریح ان کے مقصد کے خلاف تھی وہاں انہوں نے اس مسئلہ کے متعلق ایک مبہم سا سوال قائم کر کے اس سے انکار کر دیا اور جہاں یہ تصریحات ان کے لیے مفید مطلب ہو سکتی تھیں وہاں انہوں نے ان کا صاف لفظوں میں اقرار کر لیا اور ان سے اپنے مدعا پر استدلال کیا۔

اس کے علاوہ بعض استدلال تو حد درجہ مضحکہ انگیز ہیں۔ مثلاً آپ فقرہ ۱۲۸ میں بخاری کی ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ "پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیوی ام سلمہؓ کے پاس تشریف لائے، اس وقت ایک خواجہ سرا ام سلمہ کے قریب بیٹھا ہوا ان کے بھائی سے یہ کہہ رہا تھا "اگر طائف کل فتح ہو گیا تو بنت غیلان کو (میں بتاؤں گا اسے) تم (تم اپنی لونڈی بنانے کے لیے) لے لینا"۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ "ایسے آدمی تمہارے پاس نہ آیا کریں"۔ اس نقل کے بعد لکھتے ہیں:

"اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غلامی یا غلام اور کنیزوں کا رکھنا کیسا ناگوار تھا"۔

یہ استدلال نہایت غلط ہے کیونکہ حدیث کے الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مخنث تھا۔ ہیت اس کا نام تھا، خواجہ سرا سمجھا جاتا تھا اور اسی بناء پر اس کو اندرون خانہ آنے کی اجازت تھی لیکن جب اس نے حضرت ام سلمہؓ کی موجودگی میں بنت غیلان کے حسن و جمال کی تعریف کی جو بلاشبہ اخلاقی اعتبار سے ایک مذموم فعل تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے ناگواری ہوئی اور قدرتی طور پر ہونی چاہیے تھی اور یہی وجہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو گھر میں آنے سے منع کر دیا۔ پس اس حدیث سے استدلال کا جواب [illegible] کے عدم جواز پر کسی بھی طرح نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں۔ لَا یَدْخُلَنَّ هٰؤُلَاءِ عَلَیْکُنَّ (ہیت جیسے لوگ (جو مخنث ہونے کے باوجود عورتوں کے ساتھ دلچسپی رکھتے ہیں) تم ازواج مطہرات کے پاس ہرگز نہ آیا کریں) اس حدیث میں غلامی پر ناگواری کی طرف تو کہیں اشارہ بھی نہیں ہے۔

پھر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز استدلال وہ ہے جو آپ فقرہ ۱۲۹ میں درج کرتے ہیں، آپ فرماتے ہیں "بخاری نے ابو سعید خدری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک روز وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک شخص آیا اور اس نے لونڈیوں کے متعلق اپنی عادت کو بیان

کیا، پیغمبر خدا نے (تعجب سے) فرمایا کہ "اگر تم ایسا کرتے؟ نہیں تم پر لازم ہے کہ ایسا نہ کرو۔ کیونکہ جس جان کے لئے خدا نے یہ قرار دیا ہے کہ وہ باہر آئے تو وہ ضرور باہر آ کر رہیگی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر صاف طور پر تسرّی اور تجارت غلامی کی مذمت فرمائی ہے۔

آپ کہیں گے دلیل کو دعویٰ سے تعلق کیا ہے؟ تو لیجیے اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں:

"(۱) جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث مسئلہ عزل کے متعلق ہے، تو یہ الفاظ حدیث کے صریح خلاف ہیں) کیونکہ اَوَ اَنتُمْ تفعلون ذلک اور لاتفعلوا سے ظاہر ہے کہ جس فعل کی سائل نے بالفعل کرنے کی خبر دی تھی اس کو منع کیا گیا۔ اس نے یہی کہا کہ ہم لونڈیوں کے ساتھ سوتے ہیں۔ یہ نہیں کہا تھا کہ ہم عزل بھی کرتے ہیں۔ (۲) اگر لا کے بعد لفظ حرج مقدر تسلیم کیا جائے تب بھی ہمارے لیے مفید ہے جس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس کا کرنا گناہ ہے۔ (۳) جو لوگ "لا" کو زائد مانتے ہیں یہ صریح تحریف ہے۔ اس لیے کہ ایک لفظ موجود ہے اور فرض کر لیتے ہیں کہ نہیں ہے۔ انتہیٰ کلامہ[275]"

اس حدیث میں بحث طلب بات یہ ہے کہ عزل سے متعلق ہے یا غلامی سے۔ مولوی صاحب بڑے زور سے فرماتے ہیں کہ اس کو عزل سے متعلق ماننا "الفاظ حدیث کے صریح خلاف ہے" حالانکہ یہ صریح خلاف نہیں، بلکہ الفاظ کے عین مطابق ہے۔ سائل کہتا ہے:

اِنَّا نصیب سبیا فکیف تریٰ فی العزلِ.

ہم کو باندیاں ملتی ہیں تو بتایئے آپ کا عزل کے متعلق کیا حکم ہے

اس سے صاف ظاہر ہے کہ باندیوں کے رکھنے کے متعلق سائل کو تردد ہی نہیں ہے بلکہ یقین ہے کہ جائز ہے ہی۔ اب اس سوال کا صرف عزل سے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ یہ بھی جائز ہے یا نہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب میں ارشاد فرمانا:

فانّھا لیست نسمۃ کتبھا اللّٰہ ان تخرج الّا ھی خارجۃ.

اللہ نے جس کسی نفس کے لیے پیدا ہونا مقدر کر دیا ہے تو وہ پیدا ہو گا ہی۔

اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ سائل کا سوال عزل سے متعلق ہی تھا، ورنہ پھر سوال و جواب میں مطابقت باقی نہیں رہتی۔ مولوی صاحب نے "لا" کے زائد ہونے نہ ہونے کی بحث خواہ مخواہ پیدا کی کیونکہ اصل مسئلہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ عزل کے جواز و عدم جواز سے اس کا کوئی تعلق

نہیں ہے۔ پھر یہ کتنی عجیب و غریب بات ہے کہ آپ نُصِیبُ سبیًا کا ترجمہ "باندیوں کے ساتھ سوتے ہیں" کرتے ہیں حالانکہ عربی کا ایک مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے کہ "نَصِیبُ" اِصابۃ سے مشتق ہے اور اس کے معنی "پانا" ہیں۔ سونے کے معنی تو عربی لغت میں کہیں بھی نہیں آتے۔ اس کے علاوہ ایک یہ بات بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ سائل نے "انا نُصِیبُ سبیًا" کہہ کر تو ایک واقعہ کی خبر دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو سن کر مخبر کو صادق یا کاذب تو کہہ سکتے تھے اس پر کوئی حکم کس طرح لگا سکتے تھے۔ پس لامحالہ آپ کے جواب کا تعلق فکیف ترٰی فی العزل یعنی سوال عن العزل سے ہوگا نہ کہ انا نصیب سبیا سے۔

اس کے بعد آپ نے وہ حدیث درج کی ہے۔ جس میں ہے کہ

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنگ میں ایک عورت کو حاملہ دیکھا۔ آپ نے اس کے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے ان لوگوں سے جو پاس کھڑے تھے پوچھا کہ کیا اس شخص نے اس عورت کو اپنی لونڈی بنا کر یعنی سریہ کے طور پر رکھا تھا؟ لوگوں نے جواب دیا "ہاں" پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں نے اس پر ایسی لعنت بھیجی ہے جو اس کے ساتھ قبر تک جائیگی۔

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"یہ سب سے زیادہ صاف اور صریح اور سب سے زیادہ سخت مذمت غلامی اور تسری کی ہے"

سخت حیرت اور تعجب کا مقام ہے کہ لوگوں کو کس طرح دیدہ و دانستہ اس قسم کی غلط بیانیوں کی جسارت ہو جاتی ہے:

اِنْ کُنْتَ لاتدری فَتِلْکَ مُصِیبَۃٌ. وَاِنْ کُنْتَ تدری فالمصیبۃُ اعظم[۲۷]

ہم اس حدیث کو "استبراء" کے حکم کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔ الفاظ سے بلا شک و شبہ کے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں غلامی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ اس پر آیا کہ اس شخص نے اپنی باندی سے استبراء کے بغیر (بحالت حمل) مجامعت کر لی تھی۔ چنانچہ حدیث میں لَعَلَّ صاحبھا الَمَّ بِھا کے الفاظ اس مطلب کو واضح طور پر ظاہر کر رہے ہیں۔ پھر آپ کا آخر میں یہ فرمانا:

"وہ کیونکر ایسے شخص کو اپنا وارث بنائیگا جو در حقیقت اس کا وارث نہیں ہے (اگر وہ پیدا ہونے والا بچہ اس کا نہیں ہوا) اور وہ کیونکر اس سے خدمت لیگا (بحیثیت غلام کے) جو در اصل اس کا غلام نہیں ہے (اگر وہ بچہ خود اس کا ہوا)

اس بات کی ناقابل انکار دلیل ہے کہ آپ کا غضب اس پر نہیں تھا کہ اس نے باندی کو کیوں رکھا، بلکہ اس بات پر مبنی تھا کہ اس نے استبراء کے بغیر ہمبستری کیوں کی؟

اس کے بعد مولوی چراغ علی نے ان حدیثوں کو درج کیا ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام کے ساتھ بدسلوکی کی شکایت کو سن کر یا اس کو پٹا ہوا دیکھ کر حکم دیا تھا کہ وہ آزاد کر دیا جائے۔ ان حدیثوں کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

''اب اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غلامی کو جائز سمجھتے ہیں تو کبھی دوسروں کے غلاموں کو آزاد نہ کرتے۔ ورنہ اس کے معنی ہوتے کہ آپ دوسروں کے املاک کو تلف کرتے تھے''۔

یہ ایک صریح مغالطہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام مسلمانوں پر سیادت روحانی وجسمانی حاصل تھی اور اس بناء پر یقیناً آپ کو یہ حق تھا کہ کسی مسلمان کے املاک کے متعلق کوئی حکم جاری فرماتے پھر اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ آپ کی ناراضگی اور غلام کو آزاد کرنے کا حکم آقا کے فعل ضرب پر مبنی تھا، نہ اس پر کہ اس شخص نے غلام کیوں رکھ چھوڑا تھا۔ مولوی صاحب نے اس پر ریمارک کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ فقہا کا صرف حیلہ ہے، جو کہتے ہیں کہ جب غلام سے ظالمانہ سلوک کیا جائے تو وہ آزاد کر دیا جائے''۔

حالانکہ ہر صاحب نظر جان سکتا ہے یہ فقہاء کا ''حیلہ'' نہیں بلکہ حدیث کا اصل مطلب ہے۔ پھر کس قدر عجیب وغریب بات ہے کہ آپ اس فقرہ کے بعد تحریر کرتے ہیں:

''یہ قید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عام اصول اور عمل اور تعلیم کے منشاء کے خلاف ہے''

منشاء کے خلاف کیوں ہے؟ سنیے خود ارشاد فرماتے ہیں:

''آپ نے تو یہاں تک تاکید فرمائی ہے کہ اگر کوئی اپنے غلام کے تھپڑ مارے تو اسے آزاد کر دیا جائے''۔

اب ''کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟'' ان تینوں فقروں میں باہمی ربط کیا ہے؟

الحاصل مولوی صاحب نے غلامی کے عدم جواز پر جتنے دلائل قائم کیے ہیں وہ سب اسی طرح نہایت لغو اور مضحکہ انگیز ہیں۔ ہم نے اس تنقید میں صرف انہی دلائل سے بحث کی ہے جو مولوی صاحب کے خیال کے مطابق سب سے زیادہ قابل توجہ اور قوی ہیں بس انہی پر اور دلائل کو قیاس کر لیجیے اگر ہم فرداً فرداً ہر ایک پر کلام کرتے تو بہت طوالت ہو جاتی۔

خلاصہ بحث

خاتمہ کلام پر ہم پھر ایک مرتبہ یہ ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ تمام دنیا میں صرف اسلام کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے غلامی کے رواج بد کو ختم کرنا چاہا اور اس نے اس زمانہ میں غلاموں کی حالت زار اور ان کے حقوق کی طرف قوموں کو متوجہ کیا جبکہ حضرت عیسیٰ کے حوارئین یہ اعلان کر رہے تھے۔

جتنے غلام جوئے کے نیچے ہیں وہ اپنے اپنے مالکوں کو کمال عزت کا لائق جانیں تا کہ خدا کا نام اور تعلیم بدنام نہ ہو اور جن کے مالک ایماندار ہیں تو وہ اپنے آقا کو بھائی ہونے کی وجہ سے حقیر نہ جانیں، بلکہ اس لیے زیادہ تر ان کی خدمت کریں کہ فائدہ اٹھانے والے ایماندار اور عزیز ہیں۔ ان باتوں کی تعلیم دیں اور نصیحت کریں [۲۷۷]۔

یا وہ کہہ رہے تھے:

"اے غلامو! جو جسم کی رو سے تمہارے مالک ہیں سب باتوں میں ان کا حکم مانو [۲۷۸]"

لیکن وہ اقوام عالم اور خود عرب کے عام حالات کے پیش نظر اس رواج کو یک قلم ختم نہیں کر سکتا تھا۔ ورنہ اس سے عرب کی معاشرتی اور اقتصادی حالت (شمالی امریکہ کی طرح بیحد ابتر اور پیچیدہ ہو جاتی اس لیے اس نے اس سلسلہ میں اصلاح کی تدریجی حکمت عملی سے کام لیا جو اسلام کے دین کامل ہونے کی بین دلیل ہے۔ اس اصلاح کے اہم اجزاء حسب ذیل ہیں:

۱۔ غلامی کی تمام صورتوں کو ختم کر کے صرف اسیران جنگ کو غلام بنانے کی صورت کو باقی رکھا۔

۲۔ قرآن مجید نے صراحتہً و کنایۃً کسی طرح بھی اسیران جنگ کو غلام بنانے کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس نے سکوت کیا۔

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوات کے قیدیوں کے ساتھ زیادہ تر من وفدا کا ہی معاملہ کیا۔ کسی کسی جنگ میں بعض قیدیوں کو غلام بنانے کا واقعہ ضرور پیش آیا

۴۔ قرآن مجید میں غلاموں اور باندیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کو آزاد کرانے کے لیے روپیہ خرچ کرنے کا حکم تو متعدد مواقع پر آیا ہے لیکن عیسوی تعلیمات کی طرح

غلاموں کے لئے یہ حکم کہیں نہیں دیا گیا کہ وہ آقاؤں کی خدمت کریں۔ بلکہ اس سے سکوت اختیار کیا گیا اور عام معاشرتی آداب کے بیان پر ہی اکتفا کر لی گئی ہے۔

۵۔ غلاموں کے متعلق جو خراب ذہنیتیں پہلے سے قائم تھیں۔ ان میں زبردست اصلاح کی اور ان کو بھائی کہا۔

۶۔ غلاموں کے حقوق انسانی کی طرف بڑے زور شور سے توجہ دلائی۔

۷۔ غلاموں کے آزاد کرنے کو بے انتہا ثواب کا کام قرار دیا۔

۸۔ غلاموں کے آزاد ہونے کی متعدد اضطراری صورتیں بتائیں۔

۹۔ متعدد گناہوں یہاں تک کہ بعض معمولی گناہوں کے کفارہ میں بھی غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا۔

۱۰۔ خود غلاموں کو حق دیا کہ اگر وہ مکاتبت وغیرہ کسی ذریعہ سے آزادی حاصل کرنا چاہیں تو ان کے آقا اس معاملہ میں ان پر سختی نہ کریں بلکہ بیش از بیش سہولتیں بہم پہنچائیں۔

۱۱۔ متعدد جزئیات ایسی ارشاد فرمائیں جن کی رو سے غلام خود بخود آزاد ہو جاتا ہے

۱۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام نے اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ غلاموں کے ساتھ مشفقانہ و ہمدردی کا معاملہ اور مساویانہ برتاؤ کرنا چاہیے۔ حقارت آمیز و ذلت انگیز طریق معاشرت سے احتراز ضروری ہے۔

۱۳۔ قرآن مجید کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی استرقاق کی تحسین نہیں کی، بلکہ سکوت اختیار فرمایا۔ رواج پہلے سے قائم تھا اس کی نسبت سے احکام ضرور بتائے۔

۱۴۔ غلاموں کا سوشل مرتبہ ایام قدیم کی نسبت کہیں زیادہ بلند و ارفع کر دیا۔

ان اصلاحات کو معلوم کرنے کے بعد ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ اسلام نے اگرچہ رواج غلامی کا یک قلم انسداد نہیں کیا لیکن اس کا اندرونی منشاء اور دلی خواہش کیا تھی؟ پس اگر دنیا کی تمام قومیں متفق ہو کر انسداد غلامی کا کوئی قانون بنانا چاہیں تو اسلام سب سے پہلے پوری صاف باطنی کے ساتھ اس تجویز کا خیر مقدم کرے گا اور اس تجویز کو عملی شکل میں لانے کے لیے تمام ادیان و مذاہب سے زیادہ سرگرم عمل اور مصروف جدوجہد نظر آئے گا کیونکہ یہ اس کی سپرٹ کے عین مطابق ہے۔

آخر میں اس حصہ کا خاتمہ عہد حاضر کے مشہور مفکر اسلام علامہ سید رشید رضا المصریؒ کے اس جملہ پر کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے ایک مرتبہ اسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اپنے رسالہ المنار میں لکھا تھا۔

> قارئین جانتے ہیں کہ علماء فرنگ کے نزدیک غلامی کا مسئلہ ان مسائل میں سے سب سے زیادہ اہم ہے جو ان کے خیال میں اسلام کے لیے موجب طعن ہیں۔ یہ لوگ فخر کرتے ہیں کہ ان کی مدنیت اسلام سے زیادہ ترقی یافتہ ہے کیونکہ اسلام نے انسانوں کے غلام بنانے کا حکم دیا ہے اور یہ اس کے برخلاف انسانی محبت کے جذبہ سے متاثر ہو کر غلاموں کو آزاد کرتے ہیں، حالانکہ ان کی مذہبی کتاب جس کی یہ اس قدر اشاعت کرتے ہیں اس میں غلاموں کے لیے ایسے سخت احکام ہیں جن کی نظیر اسلام میں کہیں نہیں مل سکتی اور ہاں اسلام نے نہ تو غلام بنانے کا حکم دیا ہے۔ نہ اس کو فرض قرار دیا ہے اور نہ سنت بلکہ رواج تھا جو تمام قوموں میں پایا جاتا تھا۔ اس لیے اس کے متعلق اسلام نے ایسے حکمت آمیز احکام وضع کیے جو اس رواج کو محو کردیں۔[۱۷۹]

ان حکمت آمیز احکام کا فوری اثر کیا ہوا؟ اس کے متعلق کسی مسلمان کی نہیں متعدد یورپین اہل قلم کی شہادتیں آپ پڑھ چکے ہیں، اب ختم کتاب پر ایک اور فاضل یورپین کی شہادت سنتے جائیے کہ الفضل ما شهدت به الاعداء!

چیمبرس جرنل میں ایک دفعہ ایک طویل مضمون بعنوان "غلاموں کا نمایاں پہلو قابل عزت حالت اور مسلمانوں کا ہمدردانہ سلوک" شائع ہوا تھا۔ جس میں فاضل مضمون نگار نے لکھا تھا:

> یہ واقعہ ہے کہ مسلمان غلام کی حالت اکثر اوقات قدیم زمانہ کے نواب و بادشاہ کا مقابلہ کرتی تھی۔ وہ بعض اوقات اپنے ملک کا حقیر خادم ہو کر اس کی ملازمت میں ایک اعلیٰ ذمہ داری کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور دونوں کا عہد و پیمان ان کو ایک مشترک دلچسپی کی طرف لے آتا ہے۔ یعنی ایک ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کا فرض ہے کہ جب تک اس سے آرام حاصل کریں وہ خود غلام کی آسائش پورے طور پر بہم پہنچائے۔ (ماخوذ رسالہ حقیقت اسلام مارچ ۱۹۳۲ء)

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

حواشی

1. Studies in Mohammadanism
2. Life of Mohammad New Edition. P.347
3. Note on Mohammadanism Second Edition P.195
4. Studies in Mohammadanism
5. Morals in evolution by Hobhouse. P.244
6. Encyclopedia of religion and ethics.
7. Encyclopedia of religion and cthics. articla on slavery
8. ہسٹری آف سوشیالوجی ص
9. مقدمہ سلیوری ان دی رومن امپائر ص 15
10. بحوالہ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس مضمون غلامی
11. بحوالہ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس مضمون غلامی
12. دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۷، ص ۲۷۸
13. سیاسیات کتاب اول باب ۳۔ ۶، ارسطو
14. ان معلومات کے لیے دیکھو مذہب واخلاق کا انسائیکلو پیڈیا جلد یازدہم مضمون غلامی۔
15. انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ۱۱، مضمون غلامی۔
16. مذہب واخلاق کا انسائیکلو پیڈیا۔ مضمون غلامی
17. ان معلومات کے لیے دیکھو دائرۃ المعارف فرید وجدی ج، مضمون "الرق"
18. مذہب واخلاق کا انسائیکلو پیڈیا۔
19. حاضر العالم الاسلامی مصنف Lothrop Stodderad بحوالہ الاسلام والحضارۃ العربیہ ج ۱: ص ۹۷
20. الاسلام والحضارۃ العربیہ ج ۱: ص ۹۳
21. مذہب واخلاق کا انسائیکلو پیڈیا
22. الاسلام والحضارۃ العربیہ ج ۱: ص ۹۴
23. سفر الاویین (۲۵: ۳۹) وسفر الخروج (۲۱: ۷، ۸) بحوالہ عمدۃ للحکس اللطیف۔ مصنفہ علامہ رشید رضا مصری مرحوم
24. مذہب واخلاق کا انسائیکلو پیڈیا مضمون از ۔ عبدالحسن۔
25. دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۷
26. مذہب واخلاق کا انسائیکلو پیڈیا مضمون یہودیوں کے ہاں غلامی
27. دائرۃ المعارف فرید وجدی اور مذہب واخلاق کا انسائیکلو پیڈیا
28. زیادہ تفصیل معلومات کے لیے دیکھئے انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن ینڈ ایتھکس۔

۲۹۔ اردو ترجمہ تاریخ ملل قدیمہ مصنفہ سینولیس فرانسیسی ص ۳۶۹
۳۰۔ Slavery in the Roman Empire
۳۱۔ مذہب واخلاق کا انسائیکلوپیڈیا۔
۳۲۔ ایک مدو من لیڈی اپنے غلاموں کے ساتھ بہت ظالمانہ برتاؤ کرتی تھی۔ ہارڈین نے اس کو پانچ سال کے لیے جلاوطن کردیا
۳۳۔ ماخوذ از مذہب واخلاق کا انسائیکلوپیڈیا۔ اور دائرۃ المعارف فرید وجدی۔
۳۴۔ نظام العالم والامم ج ۲: ص ۲۰۲
۳۵۔ ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس
۳۶۔ دائرۃ المعارف فرید وجدی
۳۷۔ ترجمہ حضرت شیخ الہند
۳۸۔ تفسیر روح المعانی سورۃ انفال۔
۳۹۔ ترجمہ حضرت شیخ الہند
۴۰۔ وہ آیت یہ ہے: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ الآیہ۔
۴۱۔ احکام القرآن ابوبکر جصاص ج ۳: ص ۴۸۳۔
۴۲۔ فتح الباری ج ۶: ص ۱۱۴
۴۳۔ ایضاً ص ۱۱۵
۴۴۔ فتح البیان ج ۹: ص ۵
۴۵۔ تفسیر روح المعانی ج ۲۶: ص ۳۶۔۳۷۔
۴۶۔ ایضاً ج ۷: ص ۱۱۹۔
۴۷۔ میں نے یہ قول روح المعانی ج ۷ سے لیا ہے۔
۴۸۔ فتح الباری باب عتق المدبر و ام الولد بسند صحیح عن ابی شیبہ و البیہقی۔
۴۹۔ ترجمہ حضرت شیخ الہند
۵۰۔ فتح الباری ج ۸: ص ۲۵۸
۵۱۔ بحوالہ احکام القرآن ج ۳: ص ۱۰۶
۵۲۔ احکام القرآن ج ۳: ص ۳۸۱
۵۳۔ ج ۷: ص ۵۰۸
۵۴۔ اس طرح کے متعدد مقولے کتاب کے آغاز میں گزر چکے ہیں۔
۵۵۔ The Sprit of Islam P 262
۵۶۔ الوحی المحمدی للسید رشید رضا ص ۱۴۳
۵۷۔ Encyclopaedia of religion and ethics
۵۸۔ Encyclopaedia of religion and ethics: Article christian slavery

۵۹ تاریخ الاسلام السیاسی۔ ص ۲۳۱۔
۶۰ بخاری باب تالیف القرآن۔
۶۱ یہ سب اشعار کتاب الحماسہ ابوتمام کے باب الحماسہ میں موجود ہیں
۶۲ نسائی باب الصلوۃ علی الشھداء۔
۶۳ کتاب الاغانی لابی الفرج الاصفہانی میں اس قسم کے متعدد واقعات مذکور ہیں۔
۶۴ اسد الغابہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام زید بن حارثہ ایک مرتبہ اپنی ماں کے ہمراہ اپنی قوم بنومعن کی زیارت کو جارہے تھے بنوالقین بن جسر کی ایک جماعت نے ان پر غارتگری کی اور زید کو گرفتار کرکے بازار عکاظ میں بیچ دیا، وہاں حکیم بن بنی حزام نے انہیں اپنی پھوپھی کے لیے خرید لیا جن کا نام خدیجہ بنت خویلد تھا اور جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی تھیں۔ خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ نے زید کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہبہ کردیا اور آپ نے ان کو شرف آزادی بخشا۔
۶۵ الاسلام والنور دکرومر۔ ص ۲۳۲۔
۶۶ یہ روایت سنن ابی داؤد وابن ماجہ میں ہے۔ اور "العبد" کا یہ وسیع مفہوم علامہ رشید رضا نے اپنی کتاب الوحی المحمدی میں لکھا ہے ص: ۱۶۵۔۱۶۶
۶۷ حسن المحاضرہ للسیوطی ج ۲ ص ۱۔
۶۸ ناک کان کاٹ دینا۔
۶۹ السیاسۃ الشرعیۃ الوہاب الخلاف۔ ص ۸۹۔۹۰
۷۰ سنن ابی داؤد باب فی من یحزو دیلعمس الدنیا۔
۷۱ تفصیل آگے آتی ہے۔
۷۲ یہ صرف قرآن مجید کی خصوصیت ہے کہ اس میں مال غنیمت حاصل کرنے اور لونڈی غلام بنانے سے سکوت اختیار کیا گیا ہے، ورنہ دوسرے مذاہب کی آسمانی کتابوں میں اس کا نہ صرف ذکر ہے بلکہ مال غنیمت حاصل کرنے کا امر فرمایا گیا ہے۔ تورات میں ہے جب تو کسی شہر کے پاس اس سے لڑنے کے لیے پہنچے تو پہلے اس کو صلح کا پیغام دے تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کے صلح منظور اور دروازہ تیرے لیے کھول دے تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے تیری باج گزار ہوگی اور تیری خدمت کرے گی اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے جنگ کرے تو تو اس کا محاصرہ کر۔ جب خداوند خدا تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کردے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر مگر عورتوں اور بچوں اور جانوروں کو جو کچھ اس شہر میں ہو اپنے لیے غنیمت کے طور پر لے لے۔ (استثنا باب ۲۰ آیت ۱۰۔۱۴)
ہندو مذہب کے منتروں میں اس مضمون کے منتر کثرت سے ملتے ہیں جن میں مال غنیمت حاصل کرنے اور غلام بنانے کو اچھا کہا گیا ہے۔ اور اندر کی تعریف صرف اس بناء پر کی گئی ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو کثرت سے لونڈی غلام دیتا ہے۔ ایک منتر میں ہے "اے اگنی تیرے مالدار پجاری خوراک حاصل کریں اور امر ابدی عمر پائیں۔ ہم اپنے دشمنوں سے لڑائی میں مال غنیمت حاصل کریں اور دیوتاؤں کو ان کا حصہ نذر کریں اے اگنی! تیری مدد سے گھوڑوں کے ذریعے گھوڑے، آدمیوں کے ذریعہ آدمی (یعنی غلام) اور بہادروں کے ذریعہ بہادر فتح کریں"۔ (۷:۱:۵:۹)

ایک اور منتر میں ہے:۔اے اندر ہم کو بہادرانہ سطوت عطا کر، آزمودہ کاری، اور اس روز افزوں قوت کے ساتھ جو مال غنیمت حاصل کرتی ہے۔ تیری مدد سے ہم جنگ میں اپنے دشمنوں کو مغلوب کریں۔ چاہے وہ اپنے ہوں یا پرائے۔ ہم ہر دشمن پر فتح مند ہوں اے بہادر! ہم تیری مدد سے دونوں قسم کے دشمنوں کو قتل کر کے خوشحال ہوں، بڑی دولت کے ساتھ۔ (۱۳۔۸:۱۹:۶)
(بحوالہ الجہاد فی الاسلام)

۳ے الاسلام روح المدنیۃ۔ ص ۱۲۷۔ اسی حدیث کے قریب قریب ایک اور حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں لیس للعربی فضل علیٰ العجمی ولا للعجمی فضل علی العربی کلکم ابناء ادم وادم من تراب. مولانا سید سلیمان ندوی نے خطبات مدراس میں اس کو نقل کر کے مسند احمد کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ سیرت النبی ج ۱:ص ۱۵۳ پر مولانا سید شبلی نے اس کو نقل کر کے عقد الفرید کا حوالہ دیا اور مولانا سلیمان ندوی نے اس پر جو نوٹ لکھا ہے اس میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ یہ فقرہ حدیث اور سیر کی کتابوں میں مجھے نہیں ملا۔

۴ے ابوداؤد باب التفاخر بالاحساب.

۵ے ابوداؤد باب لا یقول ربی دربتی.

۶ے عربی ابان میں لڑکے کو فتیٰ اور صوکی کو فتاۃ رسوا محبت کے وقت کہتے ہیں اور دوسری طرف سیدہ وسید بالعموم ایک دوسرے کو تعظیما و تکریما کہتا ہے۔

۷ے علامہ طنطاوی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ سلاف روس کے ایک مجموعہ قبائل کو کہتے ہیں۔ افرنگی نخاس ان لوگوں کو پکڑ پکڑ کے لیجاتے اور غلام بنا کر بیچ دیتے تھے۔ شروع شروع میں انہی قبائل کے لوگ سلاف کہلاتے تھے۔ یعنی سفید رو غلام عربی میں اس کو معرب کر کے صقلی کہنے لگے جس کی جمع صقالبہ ہے اسی سے فرانسیسی میں Esclave اور جرمنی میں Esklave اور انگریزی میں Slave بولا جاتا ہے۔ (تفسیر الجواہر ج ۲۲:ص ۱۵۶)

۸ے بخاری باب مولی القوم (Byzantine Empire p.99) تاریخ الاسلام السیاسی۔ ج ۱:ص ۲۳۳۔

۹ے ابوداؤد کتاب العتاق

۸۰ زرقانی شرح المواہب المدنیہ للقسطلانی ج ۳:ص ۲۷۔

۸۱ احمد، مسلم، ابوداؤد، ترمذی

۸۲ یہ روایت متفق علیہ ہے۔ دیکھو نیل الاوطار

۸۳ اصح السیر ص ۹۸۔

۸۴ ابن سیر ج ۲:ص ۷۸

۸۵ ابن سیر ج ۲:ص ۷۸

۸۶ ایضاً ج ۲:ص ۷۹

۸۷ الفاروق

۸۸ نہایہ ابن اثیر ج ۳: ص ۶۸

۸۹ فتح الباری ج ۵: ص ۱۲۷

۹۰ ابوداؤد باب فی عتق امہات الاولاد۔

۹۱ فتوح البلدان بلاذری ص ۱۳۹ ۔ ۱۴۷ مطبوعۃ المطبعۃ المصریہ بازہر۔

۹۲ فتوح البلدان ص ۲۱۶ مطبوعۃ المطبعۃ المصریہ بازہر۔

۹۳ کتاب الخراج الامام ابی یوسف مطبوعہ مصر ۲۳ ۔ ۲۸ ۔ ۲۹ ۔ و فتوح البلدان ص ۲۷۷۔

۹۴ خوزستان کا ایک علاقہ ہے اور اس کے دو حصے ہیں ایک مناذر کبریٰ اور دوسرا مناذر صغریٰ کہلاتا ہے۔

۹۵ فتوح البلدان ص ۳۸۶۔

۹۶ اس کے بعد ہم نے خود کتاب مذکور کی مراجعت کی۔

۹۷ روح المعانی ج ۲ ص ۴۱۔ "فی الرقاب" کے "فی" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس مال کا مالک غلاموں کو نہیں بنایا جائیگا بلکہ ان کی گلوخاصی میں اس کو صرف کیا جائے گا۔

۹۸ یہ حدیث امام احمد، ابن حبان، ابن مردویہ اور بیہقی سب نے روایت کی ہے۔

۹۹ کتاب المیزان لعبدالوہاب الشعرانی ج ۲ ص ۲۰۷۔

۱۰۰ روح المعانی ج ۲: ص ۴۲۔

۱۰۱ ان واقعات کے لیے دیکھو تاریخ کامل ابن اثیر ج ۲: ص ۱۹ اور تاریخ طبری۔

۱۰۲ البدایۃ والنہایۃ ج ۵: ص ۳۰۵، ۳۰۹

۱۰۳ زرقانی ج ۳: ص ۳۱۱۔

۱۰۴ حماۃ اسلام و دیگر کتب

۱۰۵ استیعاب

۱۰۶ الجہاد فی الاسلام ص ۲۰۴

۱۰۷ تہذیب الاسماء واللغی ج ۱: ص ۳۸۰

۱۰۸ تہذیب الاسماء واللغنی ج ۱: ص ۳۸۰

۱۰۹ نیل الاوطار ج ۶ کتاب العتق

۱۱۰ ایضاً ص ۱۹

۱۱۱ ابوداؤد مطبوعہ مصر۔ ج ۲: ص ۳۳۲۔

۱۱۲ موطا امام مالک باب الایجوز من العتق فی الرقاب الواجبۃ

۱۱۳ زرقانی باب عتق الحی من المیت

۱۱۴ ترمذی ابواب الزہد۔ ص ۳۹۱

۱۱۵ ادب المفرد۔ باب العفو عن الخادم۔

۱۱۶ بخاری باب اذا قال لعبد ہو للّٰہ ونوی العتق ولا شہاد فی العتق۔

۱۱۷ فتح العلام شرح الرام طبع میری۔ کتاب العتق ص ۳۳۲۔ بلوغ المرام کی دوسری شرح سبل السلام میں بھی یہ فہرست اسی تفصیل سے منقول ہے۔

۱۱۸۔ فتح الباری باب عتق المدبر و ام الولد۔
۱۱۹۔ Studies in Muhammadanism.. P357.
۱۲۰۔ ابوداؤد باب فی عتق امہات الاولاد۔
۱۲۱۔ موطا امام مالک بحوالہ قسطلانی نیل الاوطار۔
۱۲۲۔ مسند امام احمد بن حنبل۔
۱۲۳۔ بحوالہ نیل الاوطار للشوکانی۔ ج۶: ص ۲۲۳۔
۱۲۴۔ بخاری باب بیع الرقیق۔
۱۲۵۔ مسند احمد ترمذی و ابوداؤد
۱۲۶۔ ابوداؤد باب فی العتق علی الشرط۔
۱۲۷۔ ابوداؤد و ترمذی
۱۲۸۔ موطا امام مالک و زرقانی باب الشرط العتق۔
۱۲۹۔ فتوح البلدان بلاذری۔ ص ۱۸۸۔
۱۳۰۔ ابوداؤد کتاب الفرائض باب فی میراث ذوی الارحام۔
۱۳۱۔ احکام القرآن ج۱: ص ۱۵۸۔
۱۳۲۔ ایضاً ص ۱۵۷
۱۳۳۔ بیضاوی مطبوعہ مصر ص ۳۸۔
۱۳۴۔ السیاسۃ الشرعیہ ص ۳۶۔۳۷۔
۱۳۵۔ احکام القرآن ج۱: ص ۱۵۹۔
۱۳۶۔ بخاری باب شہادۃ الاماء و العبید
۱۳۷۔ القیاس فی الشرع الاسلامی
۱۳۸۔ فتح الباری طبع جدید ج۵: ص ۳۰۴۔
۱۳۹۔ القیاس فی الشرع الاسلامی ص ۱۲۸۔۱۲۹۔
۱۴۰۔ تاریخ ابن اثیر ج۲: ص ۲۶۱۔
۱۴۱۔ ابوداؤد کتاب الخراج باب فی القسم الفئ
۱۴۲۔ فتوح البلدان ص ۲۶۵۔
۱۴۳۔ ......ایضاً.........
۱۴۴۔ فتوح البلدان ص ۲۶۴۔ عربی زبان میں مولی کا لفظ مختلف اور متضاد معانی کے لیے آتا ہے۔ اس کے معنے ہیں: غلام، آزاد کردہ غلام، آزاد کرنے والا، چچازاد بھائی۔ بلاذری کی جو روایات اوپر نقل ہوئی ہیں ان میں مولی یا موالی کے الفاظ آئے ہیں جس کے معنی غلام اور آزاد کردہ غلام دونوں ہو سکتے ہیں۔ لیکن "صریح" یا "عرب" کے الفاظ سے تبادل ہوتا ہے کہ یہاں مولی سے مراد غلام نہیں بلکہ آزاد کردہ غلام ہیں۔ ہمارے لیے اس صورت میں بھی یہ روایت مفید مطلب ہیں۔ کیونکہ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ

غلامی انسان کی ذاتی شرافت ونجابت میں کوئی نقص پیدا نہیں کرتی۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے احرار جنگ بدر اور موالی کو ایک درجہ میں رکھا اور اس اعتبار سے یہ موالی دوسرے احرار سے فائق رہے۔

البتہ ایک اور روایت ہے جس میں مملوک کا لفظ صاف طور پر آیا ہے:

عن الحسن بن محمد أن ثلاثة مملوكين لبني عفان شهدوا بدرًا فكان عُمَر يَعطِي كل انسان منهم كل سنةٍ ثلاثة آلافِ درهم.

حسن بن محمد سے روایت ہے کہ بنو عفان کے تین غلام بدر میں شریک ہوئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان میں سے ہر ایک کو تین ہزار درہم سالانہ دیتے تھے۔

اگر موالی سے مراد آزاد کردہ غلام، اور روایت بالا میں مملوک سے مراد غلام ہے تو ان دونوں کے عطیات میں فرق کی وجہ ظاہر ہے۔ آزاد کردہ غلام کو خود کسب معاش کرنا پڑتا ہے، اور غلام کے تمام اخراجات اُس کے آقا کے ذمہ ہوتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے تقسیم وظائف کے وقت احرار اور موالی (آزاد کردہ غلام) کو کس طرح برابر رکھا۔ اور پھر جو مملوک تھے آپ نے ان کو بھی حصہ دیا اور اس کا خیال نہیں کیا کہ ان کا نان نفقہ تو دوسروں کے ذمہ ہے اور وظیفہ دیا بھی تو کتنا؟ احرار کے وظیفہ کے نصف سے زائد۔

۱۴۵ فتوح البلدان بلاذری ص ۴۶۶۔

۱۴۶ ایک قسط نصف صاع کا ہوتا ہے یعنی پونے دو سیر کا

۱۴۷ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس باب سلیوری

۱۴۸ فتوح البلدان بلاذری۔ ص ۴۶۶۔ (حاشیہ صفحہ ہذا)

۱۴۹ تفسیر بیضاوی مطبوعہ مصر۔ ص ۲۰۵

۱۵۰ سنن ابن ماجہ کتاب الطلاق۔

۱۵۱ کتاب المعارف لابن قتیبه ص ۹۴۔

۱۵۲ تاریخ السلام السیاسی۔ ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن ص ۲۲۸۔

۱۵۳ Spirit of Islam-P 224

۱۵۴ اَنْ اَرَدْنَ تحصّنًا ان لوگوں کو عار دلانے کے لیے فرمایا گیا ہے۔ یعنی کیسے شرم کی بات ہے کہ تمہاری باندیاں تو پاکدامن رہنے کا ارادہ کریں اور تم اپنا فائدہ اٹھانے کے لئے ان کو زنا ایسے شرمناک فعل پر مجبور کرو ورنہ مفہوم مخالف کے اعتبار سے مراد یہ نہیں ہے کہ اگر وہ عفت کے ساتھ رہنا ہی خواہش نہ کریں تو تم ان کو زنا پر مجبور کر سکتے ہو کہ یہ چیز تو اسلام کے نزدیک کسی حالت میں بھی قابل برداشت نہیں ہے۔

۱۵۵ ابوداؤد والادب المفرد باب اذا نصح العبد لسيده

۱۵۶ الاسلام روح المدينة ص ۱۹۳۔

۱۵۷ الادب المفرد باب من احب ان يكون عبدًا ص ۳۳۔

۱۵۸ مروج الذهب للمسعودی برحاشیہ کامل ابن اثیر ص ۱۳۲۔

۱۵۹ ابوداؤد باب في حق المملوك

۱۶۰ موطا امام مالک کتاب الجامع باب الامر بالرفق بالمملوك

۱۶۱۔ الادب المفردات۔ باب ھل یجلس خادمہ اذا اکل ص ۳۲
۱۶۲۔ موطا امام مالک، کتاب الزکوٰۃ
۱۶۳۔ ادب المفرد باب فضول المنکر
۱۶۴۔ ادب المفرد
۱۶۵۔ تاریخ الاسلام السیاسی ج ۱: ص ۳۳۴
۱۶۶۔ نیل الاوطار ج ۷
۱۶۷۔ ابوداؤد باب حق المملوک
۱۶۸۔ اسد الغابہ ذکر حضرت شقران وطبقات ابن سعد
۱۶۹۔ ابوداؤد باب فی حق المملوک
۱۷۰۔ سنن ابوداؤد و صحیح بخاری وغیرہ باب تعلیم الجاریہ۔
۱۷۱۔ موطا امام مالک باب نکاح العبد۔
۱۷۲۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز۔ ص ۱۷۲
۱۷۳۔ طبری ج ۴: ذکر فتح سوس۔
۱۷۴۔ الشہر مذاہیر ج ۱: ص ۳۳۲۔
۱۷۵۔ فتوح البلدان ص ۱۴۹۔
۱۷۶۔ ایضاً ص ۳۲۰............
۱۷۷۔ بخاری کتاب الدیات باب من استعان عبداً و رصبیاً۔
۱۷۸۔ بخاری باب فضل من اسلم من اھل الکتاب۔
۱۷۹۔ ہوزان ایک علاقہ میں ایک وادی کا نام ہے۔ یہیں بنو ہوزان کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ حنین کیا ہے جب لڑائی سخت ہوگئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حمی الوطیس" جنگ کا تنور گرم ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس فقرہ کے سبب سے پہلے کہنے والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ معجم البلدان ج ۱: ص ۳۷۵
۱۸۰۔ ابوداؤد کتاب النکاح باب وطی السبایا
۱۸۱۔ معالم السنن ج ۳: ص ۲۲۳۔
۱۸۲۔ مسند امام احمد بن حنبل ج ۴: ص ۱۰۸
۱۸۳۔ بحوالہ المجمل الکامل ص ۳۱۳۔
۱۸۴۔ ابوداؤد ج ۴ ص ۵۴۱ مطبوع مصر یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ستر سے مراد بیان عدد نہیں بلکہ کثرت مراد ہے۔ یعنی اگر بہت مرتبہ بھی یہ غلام سے خطا ہو تو اس کو معاف کر دو جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ "اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ"
۱۸۵۔ موطا امام مالک میں اس راوی کا نام عمران الحکم لکھا ہوا ہے لیکن ابن عبدالبر فرماتے ہیں "یہ وہم ہے، صحابہ میں کوئی عمر بن الحکم نہیں۔ بلکہ یہ صاحب معاویہ بن الحکم ہیں اور ان کی یہ حدیث معروف ہے"۔

۱۸۶ موطا امام مالک باب مایجوز من العتق فی رقاب الواجبۃ مسلم باب صحبۃ المما لیک۔
۱۸۷ مسند امام احمد بن حنبل ج ۶ ص ۱۱۹
۱۸۸ نووی شرح باب صحبۃ المما لک
۱۸۹ طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت سلمانؓ
۱۹۰ ایضاً تذکرہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ
۱۹۱ مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ : ۳۰۸
۱۹۲ مسلم کتاب البرو الصلۃ و الآداب۔
۱۹۳ حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ و نیل الاوطار ج ۷۔
۱۹۴ حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ : ص ۱۶۰۔
۱۹۵ ابوداؤد کتاب الحدود باب مالا یقطع فیہ۔
۱۹۶ الجواہر فی تفسیر القرآن ج ۲۱ : ص ۱۵۹
۱۹۷ ابوداؤد باب من قتل عبدہٗ
۱۹۸ زرقانی شرح موطا امام مالک باب جامع القضاء فی العتاقہ
۱۹۹ القیاس فی الشرع الاسلامی ص ۵۷
۲۰۰ ایضاً ص ۲۹ : ۳۱..........
۲۰۱ تاریخ الطبری ج ۵ : ص ۳۳
۲۰۲ شرح الشفاء ج ۲ : ص ۷۷
۲۰۳ صحیح بخاری باب استقضاء الموالی و استعمالھم۔
۲۰۴ فتح الباری مطبوعہ مصر ج ۱۳ : ص ۱۳۳
۲۰۵ فتوح البلدان بلاذری باب یوم جلولاء الوقیعۃ۔
۲۰۶ ابن سعد ج ۵ : ص ۲۱۸
۲۰۷ ....ایضاً ج ۵ : ص ۲۱۸
۲۰۸ یہ روایت اسی کتاب میں "نظام نصیحت کر سکتا ہے" کے زیر عنوان گزر چکی ہے
۲۰۹ الترغیب والترہیب ج ۳ : ص ۵۰
۲۱۰ رواہ احمد ابو یعلی باسناد حسن۔
۲۱۱ یہ روایتیں میں نے الترغیب والترہیب باب ترغیب المملوک فی اداحق مولاہ سے لی ہیں۔
۲۱۲ منہاج ص ۱۳۲۔
۲۱۳ یہ واقعہ اوب کی متعدد کتابوں میں مذکور ہے مگر ہم نے تفسیر روح البیان ج ۳ ص ۳۲۱ سے لیا ہے طوالت کے باوجود اور واقعہ من وعن اس لیے نقل کر دیا ہے کہ عبدالملک اور حضرت زہری کی اس گفتگو سے غلام کے متعلق اسلامی مں تخیل پر روشنی پڑتی ہے۔
۲۱۴ الکامل للمبرد ج ۲

۲۱۵۔ حاضر العالم الاسلامی ج ۳: ص ۴۰۸۔ ۹۔

۲۱۶۔ فتح القدیر ج ۴: ص ۳۰۶

۲۱۷۔ مقریزی ج ۲: ص ۱۷۹، ۱۹۱۔ بحوالہ الجواہرانی تفسیر القرآن ج ۳: ص ۱۵۴۔

۲۱۸۔ طبقات ابن سعد تذکرہ افلح

۲۱۹۔ اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام ص ۳

۲۲۰۔ شرح النہج ج ۱: ص ۱۸۲

۲۲۱۔ کوفہ کے لوگ عجیب طرح کے بد دماغ واقع ہوئے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں سعد بن ابی وقاص یہاں کے گورنر ہوئے تو انہوں نے ان کی اس قدر شکایتیں بارگاہ خلافت میں پہنچائیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مجبوراً انہیں معزول کرنا پڑا۔ [illegible] یہاں کے گورنر مقرر ہوئے تو انہوں نے کہا کہ یہ تو ضعیف و کمزور ہیں سیاست نہیں جانتے اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ میں اہل کوفہ کو کیا کہوں، ایک قوی اور مدبر کو یہاں کا گورنر مقرر کرتا ہوں تو کہتے ہیں "یہ تو بڑا سخت مزاج ہے" اور اگر کسی نرم خو کو گورنر بناتا ہوں تو کہنے لگتے ہیں "یہ تو بہت کمزور ہے سیاست ہی نہیں جانتا" اور خود حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اہل کوفہ کے حق میں دعا کی تھی اللھم لا ترض عنھم امیرا ولا ترضھم بامیر. یعنی اے خدا نہ تو اہل کوفہ سے کسی امیر کو خوش رکھ نہ اہل کوفہ کو کسی امیر سے۔ چنانچہ ان لوگوں کا حال یہی ہوا۔ جو کوئی ان کے ہاں گورنر ہو کے آیا انہوں نے اس کی مخالفت کی اور اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیا، عہد بنو امیہ میں جب حجاج کو یہاں کی گورنری ملی تو انہوں نے اس کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرنا چاہا، لیکن حجاج انتہا درجہ کا تند خو، بے رحم، اور سخت مزاج تھا اس نے ان لوگوں کو تمسخر کرتے ہوئے دیکھا تو یہ شعر پڑھا۔ انا ابن جلاء و طلاع الثنایا. متی اضع العمامۃ تعرفونی. ترجمہ: میں روشن ہوں اور گھاٹیوں پر چڑھنے والا ہوں جب میں عمامہ اتار کے رکھوں گا تم مجھ کو پہچان لو گے" اور پھر اس نے کہا، اہل کوفہ! میں سروں کو دیکھ رہا ہوں کہ پک گئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ جو قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔ وانزلنا الحدید فیہ باس شدید اسی قسم کے لوگوں کے متعلق ہے۔

۲۲۲۔ یہ سب معلومات ابن ندیم کی کتاب الفہرست سے ماخوذ ہیں۔

۲۲۳۔ بحوالہ حاضر العالم الاسلامی ج ۳: ص ۴

۲۲۴۔ حاضر العالم الاسلامی ج ۳: ص ۴

۲۲۵۔ saladin. P. 22

۲۲۶۔ میری کہانی ج ۲ باب مذہب

۲۲۷۔ Slavery In the Roman Empire p.231

۲۲۸۔ الاسلام وروح المدنیۃ ص ۱۲۸

۲۲۹۔ Spirit of Islam p.263

۲۳۰۔ Encyclopaedia of Religion and Ethics article and slavery

۲۳۱۔ بحوالہ الاسلام واللورڈ کرومر۔ ص ۱۲۸

۲۳۲ Black man's burden.

۲۳۳ Temperment of caractere by Alfred Fouillee

۲۳۴ تاریخ الاسلامی اسیاسی ج ا۔

۲۳۵ The Sociolog of Islam p.118

۲۳۶ The Sociology of Islam p 121,

1- Mohammad and Mohammadunism Printed in London 1870 pp243-245

۲۳۷ Four Lectures on naturad and revalid religion

۲۳۸ دعوت اسلام باب پنجم ص ۱۴۸

۲۳۹ دی پریچنگ آف اسلام ص ۱۹۴

۲۴۰ دعوت اسلام ص ۱۹۵

۲۴۱ ....ایضاً ص ۱۹۷............

۲۴۲ دعوت اسلام ص ۱۹۵

۲۴۳ نہایۃ ابن اثیر ج ۴: ص ۱۴۴۔۱۱۵

۲۴۴ جائز چیزوں میں سب سے زیادہ بری چیز

۲۴۵ عیون الاخبار ج ا ص ۲۵

۲۴۶ اغانی ج ۲: ص ۲۷

۲۴۷ The Spirit of Islam p.265

۲۴۸ ....ایضا p-267............

۲۴۹ ان جریر طبری۔ ص ۱۹۲۵

۲۵۰ Islam in the world .p.32

۲۵۱ ترطبنی ص ۱۲۷ بحوالہ دی پریچنگ آف اسلام ص ۱۳۱۔

۲۵۲ دی پریچنگ آف اسلام اردو ترجمہ ص ۱۳۲

۲۵۳ Temprament at caractere

۲۵۴ Daily Times of London, 5 may 1932

۲۵۵ Daily Times of London, 5 may 1932

۲۵۶ Daily Times of London, 9 may 1932

۲۵۷ Social evils and its remedies

۲۵۸ فتوح البلدان باب فتوح السند۔

۲۵۹ برک مقدمہ مستنگو ج ا ص ۱۳۹۔ بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔

۲۶۰ Strangers at the gates p.50

۲۶۱ رولیش چندر دت ص ۲۶۴۔۲۶۵

۲۶۲ میں نے اس باب میں ہندوستان کی تعلیمی اور اقتصادی حالات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کی اکثر معلومات تعلیمی ہند از حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' مصنف مولانا سید طفیل احمد صاحب (علیگ) سے ماخوذ ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ''بھارت میں انگریزی راج'' سندرلال۔ بدقسمت ہندوستان لالہ لاجپت رائے۔ مقاریر مسٹر برک ''ہندوستان کی اقتصادی تاریخ'' ازل۔ ''انگریزی سلطنت کا استحکام'' میجر باسو۔

۲۶۳ اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام حصہ اول ص ۸۰۔

۲۶۴ سعدیات ص ۱۵۸ مطبوعہ حسینیہ مصر

۲۶۵ شامی ج ۳: ص ۳۳۱۔ اعظم الکلام فی القاء الاسلام۔

۲۶۶ اگر تو نہیں جانتا تو یہ ایک ہی مصیبت ہے اور اگر تو جانتا ہے تو یہ مصیبت بہت ہی بڑی ہے۔

۲۶۷ تموتھی پہلا خط باب ۶ ورس ۱،۲

۲۶۸ کلسیون باب ۳۰ ورس ۲۲۔

۲۶۹ الاسلام روح المدنیۃ ص ۱۴۹۔ مطبوعہ مصر۔

2469